بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت کا کردار
(۱۹۰۸ءتا۱۹۴۷ء: مشمولات کا تنقیدی مطالعہ)

مقالہ نگار: زینب بی بی

ایم۔ایس۔اردو

رجسٹریشن نمبر 66-FLL/MSURDU/F09

نگران: ڈاکٹر نجیبہ عارف

صدرِ شعبۂ اردو

شعبۂ اردو

کلیۂ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

Accession No TH-14446 ف/ق

MS
891.4396
زی ن

اردو ادب - رسائل -

DATA ENTERED

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: ***Zanub Bibi***

Title of the Thesis: "بیداری نسواں میں ماہنامہ عصمت کا کردار"

Registration No: ***66-FLL/MSUrdu/F09***

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of language & Literature, International Islamic University, Islamabad in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE	
External Examiner: **Dr. Nawazish Ali** Retired Associate Professor Rawalpindi	***Internal Examiner:*** **Dr. Aziz Ibnul Hassan** Assistant Professor Department of Urdu (Male), IIUI
Supervisor: **Dr. Najeeba Arif** Assistant Professor Department of Urdu (Female), IIUI	

****

Chairperson
Department of Urdu

Dean
Faculty of Language & Literature

M909203

Rupees 50 ۵۰ روپیہ

بیانِ حلفی

میں مسماۃ زینب بی بی رجسٹریشن نمبر 66-FLL/MSURDU/FO9 حلفاً اِقرار کرتی ہوں کہ اِس مقالے میں

مکمل اور اصل حوالہ جات دیے گئے ہیں اور یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے۔

المحلف

زینب بی بی

الجامعة الإسلامية العالمية

INTERNATIONAL ISLAMIC UNIVERSITY

ISLAMABAD-PAKISTAN

DEPARTMENT OF URDU

صداقت نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زینب بی بی رجسٹریشن نمبر 66-FLL/MSURDU/F09 نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان ''بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت کا کردار (۱۹۰۸ء۔۱۹۴۷ء)'' برائے ایم۔ایس اردو میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

ڈاکٹر نجیبہ عارف

شعبۂ اردو

فہرست ابواب

	صفحہ نمبر
باب اوّل: ہندوستان میں بیداریِ نسواں کی تحریک، پس منظر تا پیش منظر	۱
۱۔ پس منظر: برّعظیم میں جدید دور کا آغاز	۲
۲۔ سرسید اور ان کے رفقا کا کردار	۷
۳۔ بیسویں صدی کی تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی صورتحال	۱۷
۴۔ بیداریِ نسواں کی تحریک کا آغاز وارتقا	۲۲
حوالہ جات	۳۳
باب دوم: اردو ادبی رسائل کے تناظر میں ماہنامہ عصمت کی اہمیت اور انفرادیت	۳۶
۱۔ اردو ادبی رسائل: آغاز و متنوع جہات	۳۷
۲۔ بیداریِ نسواں میں اردو ادبی رسائل کا کردار	۴۱
۳۔ ماہنامہ عصمت کا اجرا	۵۱
۴۔ ماہنامہ عصمت کے لکھاریوں کا تعارف	۵۷
۵۔ نمایاں موضوعات ور جحانات	۶۷
حوالہ جات	۷۹
باب سوم: بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت کی نثری تخلیقات کا کردار: تنقیدی مطالعہ	۸۲
۱۔ مضامین	۸۳
۲۔ سفرنامے	۱۴۰
۳۔ ناول	۱۴۸

۴۔ افسانے ۱۵۵

حوالہ جات ۱۶۵

باب چہارم: بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت کی شعری تخلیقات کا کردار: تنقیدی مطالعہ ۱۷۹

۱۔ منظومات ۱۸۱

۲۔ رباعیات ۲۲۳

۳۔ غزلیات ۲۲۶

۴۔ قطعات ۲۲۷

۵۔ سانیٹ ۲۲۸

حوالہ جات ۲۳۱

باب پنجم: متفرق مشمولات کا تنقیدی مطالعہ ۲۴۲

۱۔ سیر بین ۲۴۳

۲۔ دور بین ۲۷۲

حوالہ جات ۲۸۱

ماحصل ۲۸۶

ماخذ ۲۹۵

پیش لفظ

ماہنامہ عصمت کی اشاعت ایسے وقت میں عمل میں لائی گئی جب برعظیم کے مسلمانوں میں بیداری کا دور شروع ہو چکا تھا۔ مسلمان سرسید اوران کے رفقائے کار کی کوششوں کی بدولت جدید تعلیم کی طرف راغب ہو رہے تھے، ایسے میں کچھ دوراندیش لوگوں نے تعلیم نسواں کو وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہوئے اس کے حق میں آواز بلند کی۔ انھی حامیانِ تعلیمِ نسواں میں علامہ راشدالخیریؒ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جنھوں نے ہندوستانی عورت کی حالتِ زار پر رحم کھاتے ہوئے اس کے حقوق کی بحالی کے لیے اپنا قلم اٹھایا اور دیگر رسائل نسواں کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے ناکافی سمجھتے ہوئے ماہنامہ عصمت جون ۱۹۰۸ء میں مخزن پریس دہلی سے جاری کیا۔ رسائل کی دنیا میں یہ وہ واحد رسالہ ہے جو اپنی اشاعت کے سو سال مکمل کر کے بھی دنیائے ادب پر راج کرتا رہا اور ۱۹۰۸ء کے بعد بھی گاہے بگاہے اس ماہنامے کے شمارے منظر عام پر آتے رہے۔

طبقۂ نسواں کے لیے اپنی خدمات کی بنا پر یہ ماہنامہ بیداریٔ نسواں کی راہ میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا۔ راقمہ کی اس تحقیق کا اصل مقصد اس نادر و نایاب ماہنامے کے مشمولات کو سامنے لانا ہے تاکہ ادب برائے زندگی کی اس عملی تفسیر کی خدمات سامنے آسکیں جس نے طبقۂ نسواں کو وہ مقام دلایا جس کی وہ مستحق تھیں۔ اسے ناقدین ادب کی لاپروائی کہیں یا دنیائے ادب کی بے حسی اور بے اعتنائی کہ اس ماہنامے پر اس سے پہلے کوئی باقاعدہ تحقیقی و تنقیدی کام سامنے نہیں آیا۔ ماسوائے اس کے کہ محققین نے اس ماہنامے میں شائع شدہ کسی نامور مصنف کے مضامین مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کر دیے یا اس کے مشمولات پر مختصر تبصرہ کر دیا یا علامہ راشدالخیریؒ پر تحقیق کرتے ہوئے اس ماہنامے کا بھی سرسری تذکرہ کر دیا۔

میرے اس مقالے کے پانچ ابواب ہیں۔ باب اوّل میں ہندوستان میں بیداریِ نسواں کی تحریک کا پس منظر اور پیش منظر سامنے لایا گیا ہے۔ باب دوم میں اردو ادبی رسائل کے تناظر میں ماہنامہ عصمت کی اہمیت اور انفرادیت پیش کرتے ہوئے اس ماہنامے کا مختصر تعارف دیا گیا ہے۔ باب سوم ماہنامہ عصت کی نثری تخلیقات اور باب چہارم شعری تخلیقات سے متعلق ہے۔ باب پنجم میں ماہنامہ عصمت کے مستقل سلسلوں ''سیر بین'' اور ''دور بین'' کا جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں اس مقالے کا ماحاصل دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ راقمہ کی ادنیٰ سی تنقیدی و تحقیقی علمی کاوش ہے جسے احاطۂ تحریر میں لاتے ہوئے پہلی بار ایک مصنف کی مشکلات کا اندازہ ہوا، دماغ کو زنگ لگ جانا اور ذہن کھل جانا جیسی اصطلاحات کا عملی تجربہ ہوا۔ اس حسین اور دلکش تجربے سے وجود میں آنے والے مقالے کے متعلق صحیح رائے اساتذہ

کرام ہی دے سکتے ہیں۔

مقالے کے انتخاب کے لیے رہنمائی کرنے کے لیے محترم جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر نجیبہ عارف کی بے حد ممنون ہوں۔ میری نگران محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ نے اس مقالے کی تکمیل کے لیے نہ صرف ہر قدم پر میری معاونت کی بلکہ اپنے مشفق و مہربان رویے اور پرستائش الفاظ سے میرا حوصلہ بڑھایا، وہ ہمیشہ میرے لیے قابل صد افتخار رہیں گی۔

مواد کی فراہمی کے لیے مختلف کتب خانوں تک رہنمائی کرنے والی محترمہ ڈاکٹر تنظیم الفردوس صاحبہ (شعبہ اردو، کراچی یونی ورسٹی) اور ان کے شوہر کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی اور ہر سانس ان کے لیے تا حیات دعا گو ہے۔ محترم ڈاکٹر داؤد عثمانی صاحب، محترم جناب زبیر صاحب (لائبریرین بیدل لائبریری) کی ادبی قدر دانی کی دل سے معترف ہوں۔ ادب کے قدر دان لوگوں سے صحیح معنوں میں کراچی میں جا کر ملنے کا اتفاق ہوا، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ! آمین۔

اپنے دوستوں اور اہلِ خانہ کی تہ دل سے مشکور ہوں کہ انھوں نے میرے لیے اس سفر کو سہل اور آسان بنایا، خاص طور پر اپنے بڑے بھائی کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں کہ جنھوں نے اپنے کام پس پشت ڈال کر مجھے اپنی معیت میں کراچی پہنچایا اور ہر مشکل کو میرے لیے آسان بنایا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اساتذہ کی رہنمائی شامل حال رہنے کی بدولت آج یہ تحقیق مقالے کی صورت میں تکمیل کو پہنچی۔ جزاک اللہ و خیرا کثیرا۔

زینب بی بی

باب اوّل

ہندوستان میں بیداریِ نسواں کی تحریک: پس منظر تا پیش منظر

باب اوّل

ہندوستان میں بیداریِ نسواں کی تحریک: پس منظر تا پیش منظر

ا۔ برِعظیم میں جدید دور کا آغاز

برِعظیم پاک و ہند مسلمانوں کی آمد ہی سے علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔ اس سے پہلے ہندستان میں ریاضی، طب، ادب وغیرہ علوم کا بہت چرچا تھا اور ان میں وہ کمال بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ عربوں نے ان سے استفادہ بھی کیا۔ لیکن طب، نجوم، ہیئت، ریاضی، کیمیا، فقہ، تفسیر، حدیث، تاریخ و سیرت وغیرہ مسلمانوں کی آمد سے ہی رواج پذیر ہوئے اور اس میں شک نہیں کہ ان علوم میں مسلمانوں نے قابلِ قدر سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان علوم و فنون میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین نے بھی حصہ لیا اور تاریخ کے صفحات میں اپنا نام چھوڑ گئیں۔[1]

لیکن بدقسمتی سے اورنگزیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہی سے سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ مرکزی حکومت کمزور ہونے اور بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار کے باعث حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی جارہی تھیں۔ مختلف صوبہ جات کے عاملین نے مرکزی حکومت (دہلی) کی سیاسی گروہ بندیوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر کے اپنے اپنے صوبوں میں غاصبانہ تسلط قائم کر لیا تھا۔ غرض پورے ملک میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مرہٹے، فرانسیسی، انگریز اور دوسرے سیاسی گروہ مرکزی حکومت کے خاتمے پر اپنے اقتدار مضبوط کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کے تمام تر ذمہ دار اورنگزیب کے بعد آنے والے حکمران تھے۔ ان کی ناعاقبت اندیشی اور بے راہ روی کے نتیجے میں ہر طرف معاشی و اقتصادی بدحالی پھیل گئی۔ تہذیبی و تمدنی حالات اور معاشرتی و اخلاقی اقدار کے اعتبار سے پوری قوم تنزلی کا شکار ہونے لگی اور طبقۂ اناث میں تو یہ کمزوری اور بھی زیادہ ابھر کر سامنے آئی۔ دراصل مسلمانوں کے اس عہدِ زوال میں پورے معاشرے پر جمود طاری ہو گیا تھا، جس سے تہذیبی اقدار تبدیل ہو گئی تھیں۔[2] علم و عمل کا فقدان ہو گیا تھا۔ عورت جو مسلم معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ علمی سرگرمیوں میں اس کے ساتھ شریک تھی اب علمی افق سے اس

طرح رخصت ہوگئی کہ مسلم معاشرے میں تعلیمِ نسواں کا تصور ہی ختم ہو کر رہ گیا۔

تعلیم کی کمی سے پیدا ہونے والی کمزوریوں اور خامیوں کو دور کرنے اور مسلمانوں میں اسلامی تشخص برقرار رکھنے کے لیے سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۲ء۔۱۷۶۲ء) اور ان کے بیٹوں نے کوششیں کیں۔ ان کی تمام تر کوششیں اصلاحِ معاشرہ کے لیے تھیں۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ نے متعدد کتب کی تصنیف کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ انہی کے فیض یافتگان میں سے حضرت شاہ اسماعیل شہید نے (۱۷۷۹ء۔۱۸۳۱ء) نے صراط مستقیم اور تقویۃ الایمان وغیرہ جیسی مشہور کتابیں لکھیں جو نہ صرف تحریک اصلاح معاشرہ بلکہ تحریکِ اصلاح نسواں کے باب میں بھی پہلا قدم ثابت ہوئیں۔ انہی بزرگوں کی تحریکِ اصلاح کا نتیجہ تھا کہ اصلاحِ نسواں کے سلسلے میں مولوی وزیر علی (۱۸۱۸ء۔۱۸۷۵ء) نے مراۃ النساء (۱۸۶۳ء) لکھی جو ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۱ء۔۱۹۱۲ء) کی مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) سے کئی سال پہلے لکھی گئی۔[۳]

اس زمانے کے انگریزوں نے جو اٹھارہویں صدی کے خاتمے تک عملی طور پر ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے تعلیم کے میدان میں پیش رفت کی۔ انگریزوں نے عام تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیمِ نسواں پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں ڈیوڈ ہیئر نے بنگالی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ۱۸۲۰ء میں کلکتہ میں ''انجمن اطفال'' کی داغ بیل ڈالی۔ پھر ۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے تعلیمِ نسواں کی طرف توجہ دی اور تعلیمِ نسواں کو بھی حکومت کے زیرِ اقتدار لانے کی کوشش کی۔

محمد بن قاسم (۶۹۳ء۔۷۱۵ء) کی آمد ۷۱۲ء سے لے کر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء تک مسلمان برعظیم میں کسی نہ کسی طور پر قابض رہے۔ لیکن جنگ آزادی میں ناکامی سے مسلمانوں سے اقتدار چھن گیا۔ لیکن آزادی کی خواہش اور آزاد ریاست کے قیام کی خواہش ہمیشہ مسلمانوں کے دلوں میں زندہ رہی۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو اقتدار سے دور رکھ کر ان کے دلوں سے حکمرانی کا تصور محو کرنے کی کوشش کی اور ہندوؤں نے متحدہ قومیت کا جال بچھا کر مسلمانوں کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی میں ہی ہندوؤں کی آریا سماج، ہندو مہاسبھا، شدھی اور سنگھٹن جیسی انتہا پسند اور متعصّبانہ تحریکیں وجود میں آئیں۔ آریا سماج کا نعرہ تھا کہ ہندستان ہندوؤں کا ہے، اس لیے مسلمان ہندو مت قبول کر لیں ورنہ ہندستان چھوڑ دیں۔ شدھی تحریک نے مسلمانوں کو شدھی ہونے کی دعوت دی اور

ہندو مہاسبھا نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی راہ دکھائی۔ سنگھٹن تحریک زبان سے زیادہ بزور بازو مسلمانوں کو ہندو بنانے کی حامی تھی۔ اس طرح جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے جنھوں نے رفتہ رفتہ پورے برعظیم کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

اردو زبان ہندو مسلم اختلاط سے معرض وجود میں آئی تھی اور اس زبان کو علمی و ادبی زبان بنانے میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، یہی وجہ تھی کہ اردو زبان اسلامی تہذیب وثقافت کی علمبردار بن گئی تھی۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے اردو کے خلاف تحریک شروع کر دی اور سرکاری عدالتوں میں اردو کی بجائے ہندی زبان کو رائج کرنے اور دیوناگری رسم الخط کے نفاذ کا مطالبہ کر دیا۔ ۱۸۸۲ء میں ہندوؤں نے ہنٹر کمیشن کو ایک یادداشت پیش کی جس میں ہندی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس سے ہندوؤں کی ذہنیت مسلمانوں پر واضح ہو گئی اور مسلمان اس نتیجے پر پہنچے کہ اردو زبان کی مخالفت کے پردے میں ہندو مسلمانوں سے دشمنی کر رہے ہیں اس طرح مسلمانوں کو اپنے تحفظ کا احساس ہوا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں وہ انگریزی سے متنفر ہو رہے تھے لیکن ہر زوال کے بعد کمال اور کمال کے بعد زوال آتا ہے۔ ہر قوم جب پستی کی عمیق ترین گہرائیوں میں گر جاتی ہے تو کوئی راہنما پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے اس زوال پذیر دور میں سرسید احمد خان (۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) نے علم وادب کی شمعیں جلائیں۔ سرسید اور ان کے رفقا نے مسلمانوں میں تعلیم اور بیداری کی لہر دوڑا دی۔ غدر کے بعد شاعری کا رخ ہی بدل گیا۔ مولانا حالؔی (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) نے غزل کا رخ بھی موڑ لیا۔ اب شاعری حسن وعشق کی داستان نہیں رہی بلکہ زندگی کے مختلف مسائل کو غزل کا موضوع بنایا گیا۔ علم وادب، تہذیب وتعلیم اور فکر وتخیل کے نئے رخ سامنے آئے۔ شاعری میں بھی جان پڑ گئی۔ نظم جدید کی اس تحریک واشاعت کا سہرا محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء۔۱۹۱۰ء) اور حالؔی کے سر ہے۔ سرسید نے انگریزی تعلیم کو عام کر دیا تو ڈپٹی نذیر احمد نے بنات النعش اور مراۃ العروس لکھ کر خواتین کی تعلیم کی اہمیت واضح کر دی لیکن اس دور کے ادیبوں کی طرح اس دور کی شاعرات وشعرا کا مقصد بھی اصلاحی تھا۔ [۲]

انگریزوں نے بھی تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے بہت کوشش کی۔ صوبۂ شمال مغربی کے گورنر

سر ولیم میور تعلیم نسواں کے بڑے داعی تھے اور اشاعت تعلیم سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ جب ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کے قیام کی رپورٹ پیش کی گئی تو اس رپورٹ میں تعلیم نسواں کا ہلکا سا اشارہ بھی نہ تھا چنانچہ سر ولیم میور نے اپنی جوابی تحریر میں اس طرف توجہ دلائی۔[۵]

پنجاب کے گورنر سر ڈونلڈ میکلوڈ کی سرکردگی میں میجر فلر اور کیپٹن ہالرائڈ نے تعلیمِ نسواں پر خصوصی توجہ دی اور اس حوالے سے کتابیں لکھوائیں۔ ناظمِ تعلیمات مسٹر کیپسن (M.Kempson) نے جدید طرز پر داستان جمیلہ خاتون (۱۸۶۸ء) لکھی۔ اگرچہ انگریزوں نے تعلیمِ نسواں کے حوالے سے کافی کام کیا لیکن اس کے پسِ پردہ مقاصد میں نہ صرف اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا ان کے پیشِ نظر تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب کی اشاعت اور اپنی انگریز ثقافت و معاشرت کو ہندستان پر مسلّط کرنا بھی ان کی منشا تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں مسلمانوں کی طرف سے انگریزی نظامِ تعلیم پر شدید نکتہ چینی بھی کی گئی۔ چنانچہ سرسید نے اسباب بغاوتِ ہند (۱۸۵۹ء) میں اور اسباب کے ساتھ ساتھ ایک سبب بغات کا انگریزوں کے نظامِ تعلیم کو بھی قرار دیا ہے:

> سب جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں۔ یہ بات حد سے زیادہ ہندستانیوں کو ناگوار تھی۔[۶]

اسی طرح جب ہنٹر کمیشن نے سفارشات مرتب کرنے کے لیے جو سوالنامہ مرتب کیا تھا تو اس کے جواب میں انجمن ہمدردِ اسلام، امرت سر، انجمنِ مسلمانانِ قصور نے اپنے اپنے میموریںڈم میں تعلیمِ نسواں کے نظام پر تنقید کی اور اصلاحات پیش کیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیمِ نسواں کے ہمدرد بھی انگریزوں کے نظامِ تعلیم کو نہ صرف ناپسند کرتے تھے، بلکہ اس کے مخالف بھی تھے، چنانچہ بعد کے مسلمانوں نے تعلیمِ نسواں کو خود اپنی پسند اور طرز پر ڈھالا۔

سر سیّد احمد خان برصغیر میں جدید تعلیم کے بانی ہیں۔ انہوں نے احیائے علوم کی تحریک شروع کی۔ اس مقصد کے لیے سائنٹفک سوسائٹی (۱۸۶۳ء) ایم اے او کالج (۱۸۷۷ء) کی بنیاد رکھی۔ سر سیّد کی ان تمام تعلیمی کوششوں میں لڑکوں ہی کو مقدم رکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید سر سیّد تعلیمِ نسواں کے مخالف تھے، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ لڑکوں کی تعلیم ہی لڑکیوں کی

تعلیم کے لیے سیڑھی کا کام دے گی۔ یہ بات ضرور ہے کہ وہ لڑکیوں کے لیے قدیم طرزِ تعلیم ہی پسند کرتے تھے۔ لیکن ان کے دوسرے رفقا کی سعی و کوشش سے ۱۸۸۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس منعقدہ لاہور میں پہلی مرتبہ تعلیمِ نسواں کا مسئلہ زیرِ غور آیا اور پھر مختلف اجلاسوں میں مشاورت کے بعد ۱۸۹۶ء میں تعلیمِ نسواں کا ایک شعبہ قائم ہوا جس کے سیکرٹری مولوی کرامت حسین بارایٹ لا تھے۔ ۱۹۰۲ء میں جب شیخ عبداللہ اس شعبے کے سیکرٹری ہوئے تو یہ فعّال ہوا اور خواتین کے مدارس قائم ہوئے۔ ۷

سرسید کے رفقا میں خصوصیت کے ساتھ مولانا الطاف حسین حالؔی نے مجالسِ النساء (۱۸۷۴ء) لکھی جس میں تعلیمِ نسواں پر زور دیا گیا۔ اگرچہ اس سے قبل ڈپٹی نذیر احمد کی مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) اور بنات النعش (۱۸۷۳ء) میں اخلاق، خانہ داری اور معلومات عامہ کی تعلیم تو دی گئی مگر تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نظر نہیں آتی۔ مولوی ممتاز علی (۱۸۶۰ء۔۱۹۳۵ء) اگرچہ سرسید کے رفقا میں شمار نہیں کیے جاتے تاہم فکری اور نظریاتی ہم آہنگی کے سبب وہ سرسید سے بہت قریب تھے۔ انہوں نے نہایت جرأت و ہمت کے ساتھ ہر قسم کی تنقید اور نکتہ چینی کو بالائے طاق رکھ کر خواتین کی تعلیم اور اصلاح کے لیے کام کیا۔ انہوں نے حقوق نسواں نامی ایک کتاب لکھی اور خواتین کا اخبار تہذیب نسواں (۱۸۹۸ء) جاری کیا۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ چل نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے خواتین میں تعلیم عام ہوگئی۔

بلاشبہ یہ ان تمام حضرات کی سعی و محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ آج ہر شعبۂ زندگی میں خواتین عروج کی راہ پر گامزن ہیں۔ علم و فن کی کوئی ایسی شاخ نہیں جس میں خواتین نے کامیابی کے جھنڈے نہ گاڑے ہوں۔ سیاست ہو کہ معاشرت، معاشیات ہو کہ طب، جدید فلسفہ ہو کہ منطق، غرض ہر شعبۂ تعلیم میں خواتین مردوں کے شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔ جن میں مسز شیخ عبداللہ، امیر النّسا بیگم، زاہدہ خاتون، نواب سلطان جہاں عباسی بیگم، نذر سجاد حیدر، زہرہ فیضی، صغرا ہمایوں مرزا، مشتاق فاطمہ، بیگم ڈاکٹر عبدالغفور، تہذیب فاطمہ عباسی، بلقیس جہاں، فاطمہ بیگم، نور الصباح بیگم، اماں بی، بیگم محمد علی جوہر، لیڈی نصرت عبداللہ ہارون، بیگم سلمیٰ تصدق حسین، محترمہ فاطمہ جناح، بیگم رعنا لیاقت علی، بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم وقار النّسا نون، حسن آرا بیگم، نواب اسماعیل خاں، لیڈی ہدایت اللہ اور بیگم رضاء اللہ کے نام سرفہرست

ہیں۔موجودہ دور میں انہی بزرگوں کی تعلیم نسواں کے لیے کی جانے والی کاوشوں کے نتیجے میں خواتین خود باشعور ہیں۔اب وہ اس مقام پر ہیں کہ اپنے لیے نئی نئی راہیں خود تلاش کر سکتی ہیں لیکن طبقۂ نسواں کی تمام کوششیں اسی وقت سودمند ثابت ہوں گی جب وہ علامہ اقبال کی نصیحتوں پر کاربند ہو کر اور اسلام اور مشرقی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے مثبت سمتوں میں قدم اٹھائیں گی۔

۲۔ سرسید اور ان کے رفقا کا کردار

عہدِ سرسید کی اہمیت یہ ہے کہ اس دور میں نہ صرف یہ کہ ادب کے نئے سانچے وجود میں آئے، مغربی اصناف متعارف ہوئیں بلکہ سماج اور معاشرت کے متعلق قدیم تصورات کو بھی زد پہنچی۔ قدیم تصور کی رُو سے شعروادب سے انسان کا تخیلی، روحانی اور تفریحی رشتہ تھا جبکہ نئے عہد کے تقاضے بدل گئے تھے۔اسی لیے مولانا حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں شاعر کو سوسائٹی کے تابع قرار دیا۔ پرانا سماج پرانی معاشی اقدار کا تشکیل کردہ تھا جو مغلوں کی پیداوار تھا اور مغلوں کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی مسلم اشرافیہ کا معاشی غلبہ بھی اپنے اختتام کو پہنچا۔اس کمزور طبقے کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ یہ اپنے اسلوبِ حیات میں تبدیلی پر آمادہ نہ تھا جبکہ سرسید اور انگریزوں کا نیا تعلیمی نظام اس اسلوبِ حیات میں تبدیلی کے لیے کمر بستہ تھا۔[۶]

انگریزوں کی تعلیم نسواں کے باب میں سعی و کوشش کا ایک مقصد تو اپنا اقتدار مضبوط کرنا تھا اور دوسری طرف وہ دینِ عیسوی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت و معاشرت کو ہندوستان پر مسلّط کرنا چاہتے تھے۔ ہر ذہین اور سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص انگریزوں کے اس نام نہاد تعلیمی نظام کے پردے میں چھپے ہوئے مقاصد بخوبی سمجھ رہا تھا۔سرسید احمد خان برِعظیم میں جدید تعلیم کے بانی ہیں۔انہوں نے احیائے علوم کی تحریک شروع کی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی (۱۸۶۳ء) قائم کی، ایم اے او کالج (۱۸۷۷ء) کی بنیاد رکھی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ(۱۸۶۶ء) اور تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ء) جاری کیے، ان رسائل میں انھوں نے اصلاحِ اخلاق، تہذیب و شائستگی، قومی عزت و وقار، جدید تعلیمی ترقی اور تعلیمی مقاصد وغیرہ پر بیسیوں مضامین و مقالات تحریر کیے۔مقصد یہ تھا کہ مسلمان جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر ایک طرف تو

انگریزوں سے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کریں اور دوسری طرف ان ہتھیاروں سے لیس ہو جائیں جن کی مدد سے وہ آزادی حاصل کر کے اپنا الگ تشخص برقرار رکھ سکیں۔

تہذیب الاخلاق میں شائع کردہ ان کے مفصل مضامین کا ماحصل یہ ہے کہ: مسلمان اندھا دھند تقلید کا راستہ چھوڑ کر ہر چیز کو سوچ کی کسوٹی پر پرکھیں، مشرکانہ عقائد ترک کر دیں، ایسے اوہام سے کنارہ کش ہو جائیں جن سے اسلام کا کوئی لینا دینا نہیں، ایک ایسا طریقۂ تعلیم جاری کریں جس سے دینی اور دنیاوی دونوں مقاصد حاصل ہوں۔ لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انہیں دستکاریاں سکھانے کا کوئی عمدہ بندوبست کیا جائے۔ قوم میں ہر قسم کے ہنر سیکھنے اور صنعت و حرفت کی ترویج کا ذوق پیدا کیا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان اعلیٰ قسم کی تہذیب اپنائیں۔[9]

سرسید احمد خان کی تعلیمی تحریک بنیادی طور پر مردوں کی اعلیٰ تعلیم کی تحریک تھی جو انھیں جدید علوم کے ذریعے معاشی اور سماجی طور پر ترقی یافتہ قوموں کے برابر لانا چاہتی تھی۔ اس وقت ہندُستان کی مسلم خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔ نہ ہی حالات اس کے لیے سازگار تھے، سرسید احمد خان کے زمانے تک تعلیم خواتین کے لیے غیر ضروری ہی نہیں بلکہ نامناسب بھی سمجھی جاتی تھی اور بہت کم گھرانوں میں پڑھی لکھی خواتین تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کی اکثریت جاہل تھی اور معاشی نظام میں ان کی حیثیت بڑی حد تک عضوِ معطل کی سی تھی۔

سرسید کی تمام تعلیمی کاوشوں میں لڑکوں ہی کو مقدّم رکھا گیا۔ جس سے پہلے پہل تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ سرسید تعلیم نسواں کے کلی طور پر مخالف تھے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ تعلیمِ نسواں کے مخالف نہ تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ لڑکوں کی تعلیم ہی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے راہیں کھولنے کا سبب بن سکتی ہے۔ ۱۸۹۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے تحت فیصلہ کیا گیا کہ مردوں کے تعلیم کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے تاکہ آئندہ نسلوں کو ان کی تربیت سے فائدہ پہنچے۔ اسی کانفرنس میں سرسید احمد خان نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف نہیں۔ انھوں نے کہا:

میرے صرف دو مطلب ہیں جن کو میں پھر بیان کرتا ہوں۔ اوّل یہ خیال کہ میں

> عورتوں کی تعلیم کا مخالف ہوں غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ ذریعہ عورتوں کی تعلیم کا سوائے اس کے اور نہیں ہے کہ مردوں کی تعلیم ہو اور اسی لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ بچوں کی تعلیم ہو جب وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو اپنی بیویوں اور بچوں کی تعلیم سے آراستہ کریں گے۔[۱۰]

سرسید کا یہ کہنا سچ ثابت ہوا کہ مرد جب تعلیم پالیں گے تو وہ عورتوں کی تعلیم کا خود انتظام کر لیں گے۔ ان ہی کے کالج کے پڑھے ہوئے طالب علموں نے تحریک نسواں کو آگے بڑھایا چاہے وہ خواجہ غلام الثقلین ہوں (۱۹۲۲ء۔۲۰۰۲ء) یا شیخ عبداللہ۔

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا آغاز سرسید احمد خان نے ہی ۱۸۸۲ء میں کیا تھا۔ اس نے مسلم خواتین کی تعلیم کی راہ ہموار کرنے میں بڑا فعّال کردار ادا کیا۔ اس کی ایک شاخ ۱۸۹۰ء میں تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے قائم کی گئی۔ خان بہادر شیخ عبداللہ اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ وہ اور ان کی بیگم تعلیمِ نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے خواتین کے لیے رسالہ خاتون جاری کیا جس نے تعلیمِ نسواں کے باب میں بڑی معاونت کی۔[۱۱]

سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے بھی معاشرتی ترقی کے لیے خواتین کی ذہنی بیداری کو اہم تصور کیا۔ وہ اسلامی تعلیمات کے لیے خواتین کو علم سے بہرہ ور کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ تاہم یہ ادب یا پردے کی حدود سے تجاویز نہیں کرتے تھے اور خواتین کے لیے نئے طریقۂ تعلیم کی بجائے پرانے طریقۂ تعلیم کے حامی تھے۔ سرسید بھی لڑکیوں کے لیے قدیم طرزِ تعلیم ہی کو پسند کرتے تھے جس میں قصص الانبیا، حکایاتِ اولیا، حکایات مثنوی مولانا روم، مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ، حصن حصین، فوائد الفوائد اور تزکِ جہاں گیری وغیرہ پڑھانے کا رواج تھا۔

سرسید کے افکار کا اگر جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریک کی ابتدا میں ہی تعلیمِ نسواں کے زبردست حامی کے طور پر سامنے آئے تھے۔ انہوں نے مسلمان خاندانوں کو شرم دلائی تھی کہ وہ اپنی خواتین کو زیورِ تعلیم سے آراستہ نہیں کریں گے تو وہ انسانیت کی معراج سے محروم رہ جائیں گی:

ہم تعجب کرتے ہیں ان حضراتِ شرافت شعار کی شرافت پر کہ وہ کیسے اپنی عورتوں کی ناشائستگی کو پسند کرتے ہیں اور کیوں اس تعلیم کو ناپسندیدہ جانتے ہیں۔ انسان کی آراستگی کے واسطے بالاتفاق زیورِ علم سے زیادہ اور کوئی سی آرائش و زیبائش نہیں ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ عورتوں کی نسبت جہالت پسند کی جائے۔ کیا عورتیں ان کی فی نفسہٖ مرتب انسانیت سے خارج ہیں جو ان کو مثل جانوروں کے رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ [۱۲]

سرسید کو اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ مسلم معاشرے میں مغربی تعلیم کے حوالے سے نفرت موجود ہے۔ اور مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی تعلیم حاصل کر لینے سے لڑکے اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں گے۔ جو معاشرہ ان شکوک وشبہات کی بنا پر لڑکوں کی تعلیم کے حق میں نہیں تھا تو وہ لڑکیوں کو کیسے ان انگریز مدرسوں میں ڈالنا گوارہ کر لیتا۔ اس صورت میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے آواز بلند کرنا لڑکوں کی تعلیم کی راہ میں بھی رکاوٹ بن سکتا تھا۔ اس لیے سرسید نے دُور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے تعلیمِ نسواں کو کچھ عرصے کے لیے مؤخر کر دیا تاکہ اِس دوران مسلمانوں میں ایک تعلیم یافتہ نسل تیار ہو جائے تو وہ خود خواتین کی تعلیم کے لیے راہ ہموار کر دے گی۔ اور آج سرسید کی اسی مصلحت اور دور اندیشی کا ثمر ہمیں نظر آ رہا ہے کہ انہی کے رفقا اور ساتھی ادیبوں کی کاوشوں سے تعلیمِ نسواں کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج سے سو سال پہلے اس راہ کی دشواریوں کو مدِّ نظر رکھیں تو سرسید کی جذبات سے عاری حقیقت بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے اور پھر یہ احساس ہوتا ہے کہ سرسید تعلیمِ نسواں کے مخالف نہیں بلکہ بہت بڑے حامی تھے مگر تعلیمِ نسواں کے لیے کچھ خاص کوشش نہ کرنا صرف مصلحت کے تحت تھا۔

سرسید کے ارکانِ خمسہ میں سے نذیر احمد دہلوی وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے نئے اسلوبِ حیات کی نمو کے لیے محدود معنی میں ہی سہی عورت کو اہم گردانا۔ ان کا خیال تھا کہ نئے حالات میں ایک ایسی مہذب تعلیم یافتہ عورت کی ضرورت ہے جو مردوں کی صلاح کار اور غمگسار بن سکے۔ نذیر احمد صاحب مولوی تھے اور فکری اعتبار سے قدامت پسند بھی، وہ اس سے زیادہ نہیں سوچ سکتے تھے۔ انہوں نے یہ سوچا کہ گھریلو انتظامات کی درستگی اور تہذیب و شائستگی سے بگڑے ہوئے سماج کو سدھارا جا سکتا

ہے۔ان کے ناولوں کے طفیل اتنا ضرور ہوا کہ ادب اور خصوصاً افسانوی ادب میں عورت کے وجود کا ادراک کیا جانے لگا اور جزوی طور پر ہی سہی اس کی تعلیم کی ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی۔

مولوی نذیر احمد دہلوی نے مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) میں خانہ دار عورت کو مرد کے معاملاتِ حیات میں مشیر و معاون بننے کی ترغیب دی۔بنات النعش (۱۸۷۳ء) میں انہوں نے عورت کے معلوماتی افق کو وسیع اور روشن کیا اور توبۃ النصوح (۱۸۷۷ء) میں معاشرتی معائب سے تربیتِ اولاد کا موضوع ابھارا جس کی ذمہ داری عورت نے سنبھالی تھی اور جس کے لیے تعلیم ضروری تھی۔[۱۳]

مراۃ العروس اردو کا پہلا ناول ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا ناول بھی ہے جو نسائی تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے مقصد کو سامنے رکھ کر لکھا گیا۔اس ناول کے دو مرکزی کردار ہیں۔اکبری کے ذریعے جہالت اور جہالت سے پیدا ہونے والی تنگ نظری، کم عقلی، پھوہڑ پن اور نتیجتاً رونما ہونے والے نقصانات کو پیش کیا گیا ہے جبکہ اس کی چھوٹی بہن اصغری کے ذریعے تعلیم کی خوبیوں اور تعلیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سوجھ بوجھ، شائستگی، سلیقہ اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد کو پیش کیا گیا ہے۔بنات النعش میں حسن آرا کے کردار کے ذریعے ڈپٹی نذیر احمد نے عورتوں کی جہالت سے پیدا ہونے والے برے نتائج واضح کیے اور ساتھ ہی جدید علوم کے حصول کی ترغیب بھی دی۔توبۃ النصوح میں تعلیم کے ساتھ ساتھ نصیحت بھی ہے۔انھوں نے اس ناول کے ذریعے تعلیم و تربیت، اخلاق کی اصلاح اور رویوں میں اعتدال کی جانب توجہ دلائی ہے۔ان تمام ناولوں میں لڑکیوں کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق تعلیم مہیا کرنے پر زور دیا گیا تا کہ وہ گھر اور معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا کر کے ان نقصانات سے بچ سکیں جو لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے انہیں اور ان کے خاندان کو اٹھانے پڑتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کی یہ کتابیں نہ صرف نسائی تعلیم کی محرک ثابت ہوئیں بلکہ ایسا نمونہ بھی بنیں جنھیں سامنے رکھ کر اس زمانے کی خواتین نے تحریر و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ڈپٹی نذیر احمد، سرسید تحریک سے وابستہ لوگوں میں سے ایک تھے،ان کا مطمعِ نظر بھی قوم کی اصلاح تھا۔اس مقصد کے لیے

انھوں نے قصہ گوئی کے فن کو اپنایا اور ایسا ادب تخلیق کیا جس کا تعلق خواص سے زیادہ عوام سے تھا۔ نذیراحمد کو سرسید کے رفقا میں سب سے زیادہ عوامی کہا جا سکتا ہے۔ [۱۴]

انہوں نے طبقۂ نسواں کے مسائل پر قلم اٹھایا اور دلچسپ مکالموں، روزمرہ اور طنز و مزاح کے ذریعے حکمت آفریں اور نصیحت آمیز باتیں انتہائی سادہ اور دل نشیں کر دیں۔ ڈپٹی نذیر احمد نے مراۃ العروس میں خواتین کے لیے ایک مکمل نظام تعلیم پیش کیا جو اس دور کے تقاضوں کے مطابق تھا۔ وہ خواتین کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف لانا چاہتے تھے اور طبقۂ نسواں کے لیے تعلیم کو اسی قدر اہم سمجھتے تھے جس قدر مردوں کے لیے۔ مراۃ العروس کے دیباچۂ دوم میں لکھتے ہیں:

> اے عورتو! تم مردوں کے دل بہلاؤ، ان کی زندگی کو سرمایۂ عیش، ان کی آنکھوں کو باغ و بہار، ان کی خوشی کو زیادہ اور غم کو غلط کرنے والیاں ہو۔ اگر تم سے مردوں کو بڑے کاموں میں مدد ملے اور تم کو بڑے کاموں کے انتظام کا سلیقہ ہو تو تمھارے پاؤں دھو دھو کر پئیں اور تم کو اپنا سرتاج بنا کر رکھیں۔۔۔ پس سوائے اس پڑھنے لکھنے کے اور کیا تدبیر ہو سکتی ہے بلکہ مردوں کی نسبت عورتوں کو پڑھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔۔۔ پڑھنا سیکھو کہ پردے میں بیٹھے ہوئے تمام دنیا کی سیر کر لیا کرو، علم حاصل کرو کہ اپنے گھر میں زمانے بھر کی باتیں تم کو معلوم ہوا کریں۔ [۱۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی نذیر احمد کا معاشرتی شعور کتنا گہرا اور ان کی نگاہ کتنی دُور رس اور دُور بین تھی کہ اس دور کے حالات کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا اندازہ کر لیا تھا کہ طبقۂ اناث کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا ضروری ہے جبکہ ان کے معاصر خواتین کی صرف واجبی تعلیم کے حامی تھے۔ حتیٰ کہ سرسید احمد خان جیسے مصلح قوم جو مردوں کی تعلیم و ترقی کے لیے دن رات کوشاں تھے۔ خواتین کی تعلیم کے حوالے سے بالکل خاموش نظر آتے تھے لیکن موقع آنے پر انہوں نے اپنی رائے کا اظہار بلا تکلف کر دیا ہے۔ مولوی ممتاز علی کو لکھتے ہیں:

> میری نہایت دلی آرزو ہے کہ عورت کو نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجے کی تعلیم دی جائے مگر موجودہ حالت میں کنواری عورتوں کو تعلیم دینا ان پر سخت ظلم کرنا اور ان

> کی تمام زندگی کو رنج و مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔۔۔عورتوں کی تعلیم قبل مہذب ہونے مردوں کے، نہایت ناموزوں اور عورتوں کے لیے آفتِ بے درماں ہے۔یہی باعث ہے کہ میں نے آج تک عورت کی تعلیم کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔[۱۶]

اس اقتباس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سرسید مرحوم اپنے عہد میں کچھ وجوہات کی بنا پر جدید تعلیم سے عورتوں کو روشناس کروانے کے حق میں نہ تھے۔لیکن ڈپٹی نذیر احمد اس معاملے میں زیادہ ترقی یافتہ نظر آتے ہیں۔انہیں اس بات کا بڑا احساس تھا کہ جب تمام مسلمان اسلامی اقدار کو نہیں اپنائیں گے وہ ذلّت و گمراہی میں گرتے چلے جائیں گے اور اگر عورتیں جاہل رہ جائیں گی تو پوری قوم تباہی کے کنارے جا لگے گی۔مولانا کا سماجی شعور بڑا گہرا تھا وہ جانتے تھے کہ عورت کے سپرد ایک پوری نسل کی پرورش و پرداخت ہے۔اگر ماں تعلیم یافتہ ہوگی تو وہ بچے کی بہترین پرورش کر سکے گی اور اس کی تربیت کے زیر اثر بچے بھی اسی قدر شائستہ اور مہذب ہوں گے۔اسلام نے خواتین کو جو حقوق عطا کیے اور جن کو مردوں نے ہندو معاشرے کے زیرِ اثر غصب کر لیا تھا مولانا نے ان کے لیے آواز بلند کی اور اپنی تصانیف کی بنیاد انہی پر رکھی۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے اصلاحی ناولوں میں معاشرتی گمراہیوں، جاہلانہ توہمات، شادی بیاہ کی فضول رسموں، بے جا اخراجات، تجہیز و تکفین کے موقع پر خلاف شرع رسوم سب کا مذاق اڑایا ہے۔ خواتین کے لیے یہ تمام باتیں جہالت کی بنا پر دین اور ایمان کا درجہ رکھتی تھیں۔مولانا نے اپنی تحریروں کے ذریعے ان کے دل و دماغ کو ان باتوں سے پاک کیا اور صحیح اسلامی اقدار کو اپنانے کی طرف مائل کیا۔[۱۷]

رفقائے سرسید میں سے مولانا حالی نے ''مناجات بیوہ'' اور ''چپ کی داد'' جیسی نظمیں لکھیں۔جن میں خواتین کی مظلومیت کا نقشہ کھینچ کر ان کے لیے حصول علم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ مولانا حالؔی کی کتاب مجالس النساء (۱۸۷۴ء) خواتین کے معاشرتی مقام کے تعین اور ان کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے حوالے سے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔اور اس میں افسانوی ہیئت کا

سہارا لینے کے باوجود خواتین کے مسائل کو دلائل اور منطق سے ثابت کیا گیا ہے۔ حالؔی کے اس مثبت عمل نے توجہ بھی حاصل کی اور اسے فروغ بھی حاصل ہوا۔[۱۸]

حالی کی تصنیف مجالس النساء سے حالؔی کے افکار و خیالات سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ وہ ابتداء ہی سے تعلیم نسواں اور اصلاح نسواں کے حامیوں میں سے تھے۔ اس کتاب میں خواتین کی تعلیم و تربیت اور معاشرتی زندگی کے بارے میں بڑی جامع معلومات ملتی ہیں۔ اس کتاب میں اصل زور تعلیم کی اہمیت پر ہے۔ خاص طور پر عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کو حالؔی بہت اہم سمجھتے ہیں۔ مولانا حالؔی نے اس قصے میں ان توہمات اور بدعات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن میں اس دور کی مسلمان خواتین ہندو معاشرے کے زیر اثر مبتلا تھیں اور ان کو دین و ایمان کا درجہ دیتی تھیں اور اس سلسلے میں اسلامی تعلیمات انہوں نے یکسر فراموش کر دی تھیں۔ حالی کی اس کتاب کا مقصد بھی اصلاح نسواں تھا۔

حالی کی دردمندی اور ہمدردی نے انہیں مظلوم طبقۂ نسواں کی طرف متوجہ کیا۔ مجالس النساء کے علاوہ بھی مولانا نے متعدد مقالات و مضامین بہبود نسواں کے لیے تحریر کیے۔ اردو شاعری میں خواتین کو ان کا جائز مقام دیا۔ پانی پت میں حالؔی نے لڑکیوں کا ایک پرائمری اسکول ۱۸۹۴ء میں کھولا جو تعلیمِ نسواں کی طرف ان کی عملی پیش رفت کا مظہر ہے۔

مولانا حالؔی کے دل میں خواتین کے مظلوم طبقے کے لیے جو درد ہے وہ ان سے پہلے اردو کے کسی شاعر اور ادیب کے ہاں نظر نہیں آتا۔ وہ قدرت کی طرف سے ہی ہمدرد دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ سادگی ان کی تمام تخلیقات میں نمایاں ہے۔ نظم ہو یا نثر، مرثیہ ہو یا رباعی، تنقید ہو یا سوانح نگاری سب میں سلاست، سادگی اور روانی ہی نظر آتی ہے۔ ان کی ساری زندگی ہمدردی، دردمندی اور ایثار کا پیکر ہے۔ حالؔی کی یہی صفات انہیں خواتین کے مظلوم طبقے کی طرف مائل کرنے کا موجب بنیں۔ ہندستان کے جاگیردارانہ نظام نے خواتین سے ان کا اصل مقام چھین کر انھیں محکوم رعایا بنا دیا تھا۔ اسلام کے عطا کردہ مراعات و حقوق سے خواتین کو یکسر محروم کر دیا گیا تھا وہ محض قرونِ اولیٰ کی لونڈیوں، باندیوں والی زندگی گزار رہی تھی۔ مرد حاکم تھا اور عورت محکوم، اس کی رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

اس پر ستم یہ کہ ہندو معاشرے کے اثرات نے مسلمان خواتین میں ضعیف الاعتقادی، اوہام پرستی، رسم و رواج کی پابندی، اور بے جا تقلید جیسی کمزوریاں پیدا کر دی تھیں۔ اسلام کے بنیادی عقائد وارکان کے بجائے رسوم ورواج کی پابندی مذہبی فریضہ بن گئی تھی۔ حالی کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر خواتین کو مہذب اور تعلیم یافتہ نہ بنایا گیا تو قوم کا ترقی کرنا محال ہے۔ اولاد کی ابتدائی تعلیم و تربیت عورت ہی کے ہاتھوں سرانجام پاتی ہے، ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہے۔ ماں جس قدر بااخلاق، تعلیم یافتہ اور تہذیب سے آراستہ ہوگی بچے بھی اس کے زیر تربیت رہ کر اتنے ہی مہذب اور شائستہ ہوں گے۔ اسلام نے علم کی دولت بلاتخصیص مرد وعورت دونوں کے لیے عام رکھی ہے۔

ہندستانی معاشرے کی حالت انتہائی سقیم تھی۔ مسلمان خواتین کا قرآن پاک ناظرہ پڑھ لینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ حالی نے خواتین کے حق میں آواز بلند کی اور اپنے قلم کو ان کے حق کے لیے استعمال کیا۔ حالی نے اپنی نظم ''چپ کی داد'' میں عورت کی سیرت اور خدمات پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ وہ بحیثیت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے کس طرح معاشرے کے لیے فعال ثابت ہوتی ہے۔ اس نظم کے ایک ایک بند سے عورت کی ثناخوانی اور محبت واحترام جھلکتا نظر آتا ہے:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے — ملکوں کی بستی ہو تمھی قوموں کی عزت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو — ہو دین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے

اس ایک شعر کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح حالی نے خواتین کو عزت و وقار کی اونچی مسند پر بٹھا کر انھیں دین کی پاسباں کہہ کر ان کا حق فوقیت ثابت کر دیا۔

اس پوری نظم میں حالی نے عورت کی ایک ایک خوبی گنوا کر اسے دنیا کی قابل فخر مخلوق قرار دیا۔ حالی نے بتایا کہ خواتین کو جاہل رکھنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کہیں وہ تعلیم یافتہ ہو کر اپنے حقوق کے لیے آواز نہ بلند کرنے لگیں۔

ہندو تہذیب کے زیر اثر مسلمان بھی ہندوانہ رسم و رواج کی تقلید کرنے لگے تھے۔ مثلاً لڑکیوں کی پیدائش پر غم کرنا، ان کو بوجھ سمجھنا اور نوعمری میں شادی کے بندھن میں باندھ دینا۔ شادی بیاہ کے سلسلے میں لڑکے یا لڑکی کی پسندیدگی کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ ماں باپ خاندانی دباؤ میں آ کر جہاں

مناسب سمجھتے ان کا رشتہ کر دیتے حتیٰ کہ عمروں کا فرق بھی ان کے نزدیک کوئی معنی نہ رکھتا۔ خواتین کے مسائل کے متعلق کوئی بات ایسی نہیں جو حالیؔ نے اپنی تصنیفات میں زیر بحث نہ لائی ہو۔ بیوہ عورتوں کے ساتھ بدسلوکی اور عقدِ ثانی نہ کرنے کی رسم کے خلاف احتجاجاً انہوں نے ''مناجاتِ بیوہ'' لکھی۔ ہندستان میں بیوہ کی شادی کا کوئی رواج نہ تھا۔ اگر لڑکی نوعمری میں بیوہ ہو جاتی تو ساری عمر اسے باپ بھائی کے در پر کاٹنی پڑتی اور اسے انتہائی منحوس سمجھ کر کسی خوشی کے موقع پر شریک نہ کیا جاتا۔ اس زمانے کے حالات و واقعات میں حالیؔ کا ''مناجات بیوہ'' لکھنا ان کی جرأت اور بے باکی کا مظہر ہے۔ یہ نظم اردو ادب کا شاہکار ہے۔ بقول ڈاکٹر غلام مصطفیٰ:

> حالی نے بیوہ کے دکھ درد کو اسی کی زبان سے ایسے پردرد انداز میں بیان کیا ہے کہ پتھر کا دل بھی پگھل جاتا ہے۔ اس نظم کی سلاست، روانی، سوز و گداز اور درد و اثر اپنی نوعیت میں یکتا ہے۔[19]

''مناجات بیوہ'' ایک بیوہ کی دکھ بھری کہانی ہے جس میں ایک مظلوم بیوہ اپنا دکھ درد، نفسانی کیفیات، دنیا کی بے ثباتی، اپنی تنہائی اور حالتِ زار اپنے مالکِ حقیقی کے سامنے انتہائی عجز و انکساری سے پیش کرتی ہے۔ ایک کم سن بیوہ کس طرح اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرتی، اپنے فطری نفسانی جذبات کو کچلتی اور پاک و صاف زندگی گزارتی ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو حالیؔ نے خوب سمجھ کر بڑے دل گداز انداز میں ایک بیوہ کے سچے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ غرض حالیؔ نے اپنی تصنیفات میں نہ صرف ہندستان بلکہ پوری دنیا کے سب سے مظلوم طبقے طبقۂ نسواں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ خواتین آج دنیا میں مردوں کے مقابل اور شانہ بشانہ بڑی شان سے اپنے حقوق کی جنگ لڑتی نظر آتی ہیں۔

بلاشبہ انیسویں صدی کو برِّعظیم میں اسلامی تاریخ کا دورِ اصلاح کہا جاتا ہے۔ اسی دور میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے جہاں مسلم معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا اصلاحی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ وہاں انھوں نے خواتین کے بنیادی مسائل کو بھی اپنی تحریر کا موضوع بنایا ہے۔ ان ادیبوں نے خاص طور پر جدید تعلیم اور معقول تربیت کی عدم موجودگی کی بنا پر خواتین میں موجود برائیوں

کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح کے لیے معقول تجاویز پیش کیں۔ ایک ایسے دور میں جہاں خواتین مظلوم تھیں اور مردوں میں ان کا ذکر بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ خواتین اور ان کے مسائل کو اپنی تصانیف کا موضوع بنانا بلاشبہ ان ادیبوں کا عہد آفریں کارنامہ ہے۔ یہ انہی کی کاوشوں کا ثمر ہے کہ ہمارے ادب میں خواتین کے تہذیبی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر لکھنے کا رواج عام ہوا۔ چنانچہ آج ہمارے یہاں خواتین کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ انہی ادیبوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ مردوں کے شانہ بشانہ آج خواتین خود بھی اپنے مسائل پر قلم اٹھا رہی ہیں اور عورت ہونے کی بنا پر مردوں کے مقابلے میں عورت ذات کی نفسیات، مزاج، افتادِ طبع، عادات و خصائل اور مسائل پر بہتر تخلیقات پیش کر رہی ہیں۔ لیکن یہ یقیناً سرسید اور ان کے رفقا کی طویل کاوشوں کا ہی ثمر ہے جو انھوں نے خواتین کے لیے کیں۔

۳۔ بیسویں صدی کی تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی صورتحال

انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان کی خواتین تعلیمی اعتبار سے پسماندگی کے اندھیرے میں گم تھیں۔ خواتین تو کیا جدید تعلیم کے حصول میں مردوں کا رویہ بھی بے لچک تھا۔ مسلمان مردوں اور بالخصوص خواتین کی حالت تو اس سے بھی ابتر تھی۔ برعظیم کی خواتین خصوصاً مسلم معاشرے میں خواتین اپنے اوپر عائد بے جا پابندیوں کے اثرات سے محفوظ نہ تھیں۔ خواتین ان بے جا رسوم و رواج اور مردانہ بالادستی کے معاشرے میں بے زبان و مجبور زندگی گزارنے پر مجبور تھیں۔ حساس ذہن یہ محسوس کر رہے تھے کہ معاشرے میں خواتین کو بحیثیت انسان جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ جہالت اور بے جا انانیت کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ خواتین کے لیے ذہن تو کیا زبان، آنکھ اور کان کا استعمال بھی ممنوع تھا۔ نظریں نیچی، زبان خاموش، کان کچھ بھی سننے کی صلاحیت سے محروم، یہ ایک آئیڈیل ہندستانی عورت کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا۔

دوسری جانب برعظیم کے ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کی نسبت مسلمان دیر سے جدید علوم کی جانب متوجہ ہوئے۔ مسلمان انگریزی تعلیم اور انگریزوں کی تعلیم کے لیے کی جانے والی کاوشوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے اور انھیں اپنے مذہب اور تہذیب کے لیے خطرہ گردانتے تھے۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے دشمنی کی حدود تک پہنچ گئے تھے۔

مغلیہ حکومت کے خاتمے کے بعد بھی مسلمان قدیم تہذیب اور نظام تعلیم پر ہی قائم رہے۔ان کے پیشِ نظر یہ خدشہ تھا کہ لڑکوں کو انگریزوں کے سرکاری سکولوں میں تعلیم دلوانے سے وہ اپنا مذہب تبدیل کر لیں گے۔انگریزی کو فارسی کی جگہ سرکاری زبان کی حیثیت سے قبول کرنے میں بھی انہیں تامّل تھا۔ عیسائیوں کی زبان سیکھنا مسلمانوں کے نزدیک خلافِ تہذیب و شرافت تھا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے سخت رویے نے بھی تعصب کے جذبات کو مستحکم کیا۔

۱۸۸۳ء میں انڈین ایجوکیشن کمیشن نے مقامی حکومتوں کی رپورٹوں کا جائزہ لیا تو تمام رپورٹوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جدید تعلیم کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے مسلمان اعلیٰ تعلیم کے میدان میں دیگر اقوام سے پیچھے رہ گئے اور ترقی نہ کر سکے۔ان رپورٹوں میں تعلیمی پسماندگی کے اسباب بھی پیش کیے گئے تھے جن میں کچھ نمائندگان نے مسلمانوں کے مذہبی عقائد کے لیے انگریزی تعلیم کو ناسازگار قرار دے دیا جبکہ کچھ کے خیال میں انگریزی تعلیم کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔سرکاری سکولوں میں مسلمان اساتذہ کی کمی، سرکاری تعلیمی اداروں میں مسلمانوں سے رابطے میں کمی اور بے توجہی پر بھی تنقید کی گئی، مسلمانوں کی غربت، خوشحال مسلمان گھرانوں کے گھر میں بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا، نصاب میں جذبات کو مجروح کرنے والی کتابوں کا شامل ہونا، مسلمانوں کے نسلی تفاخر اور ماضی کے احساس برتری وغیرہ کو بھی ایسے ہی چند عوامل قرار دیا گیا۔

کمیشن کی رپورٹوں کے نتیجے میں ایک طرف تو مقامی حکومتوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایسے اقدامات کیے جن میں مسلمانوں میں جدید تعلیم کا رجحان پیدا ہو۔دوسری طرف روشن خیال مسلمانوں نے مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کئی تحریکیں شروع کیں جن میں سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک، کلکتہ کے نواب عبداللطیف کی محمڈن لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی، شیخ عبداللہ کی انجمن خواتین اسلام، سید امیر علی کی سنٹرل نیشنل ایسوسی ایشن، اور بدرالدین طیب کی انجمن اسلام نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی حالت کو سدھارنے کے لیے بڑے پیمانے پر عملی جدوجہد کا آغاز کیا جس سے برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بلاشبہ ان حضرات کی کاوشوں سے ہی مسلمانوں کی آزادی اور تعلیم نسواں کے لیے میدان ہموار ہوا۔

سیاسی طور پر یہ عہد برِعظیم کے مسلمانوں کو ایک ایسی ڈگر پر لے آیا تھا جہاں وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ کر نہیں پا رہے تھے۔ حالات ان کے مخالف چل رہے تھے۔ انگریز آقاؤں کے پیش نظر اپنے وہ مفادات تھے جس سے سادہ لوح مقامی آبادی بالکل ناواقف تھی۔ یورپ میں صنعتی انقلاب آ چکا تھا اور اب ساری دنیا میں ان کی مارکیٹ کی دوڑ شروع ہو چکی تھی جس کا نتیجہ عالمی جنگوں کی صورت میں بعد میں سامنے آیا۔ ترکی کی شہنشاہیت اس کا شکار ہوئی تو برِعظیم کے سادہ لوح مسلمانوں نے اسے خلافت کا خاتمہ جان کر خلافت بچانے کے لیے تن، من، دھن کی بازی لگا دی۔ مسلم اشرافیہ جو عالمی سیاست سے واقف تھی اپنے مفادات کے تحت چپ تھی، برِعظیم کی بڑی آبادی دیہاتوں میں رہنے کے سبب تعلیم سے قطعاً محروم تھی۔ خصوصاً مسلم خواتین میں تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان حالات میں وہ چند تعلیم یافتہ افراد جو مغرب کی درسگاہوں سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے وہ بھی صرف انگریزی تعلیم کی حد تک حالات سے باخبر تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں بادشاہت کے خلاف شدید ردِعمل انقلاب کی صورت میں رونما ہوا تو اس سے ہندوستانی معاشرہ بالکل بے خبر رہا۔ تاہم حالات کے پے در پے تھپیڑوں نے مسلمانوں کو متحد ہونے اور اپنی سمت مقرر کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ وہ دور تھا جب برِعظیم کے مسلمانوں میں تعلیم کی وجہ سے سیاسی شعور پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اخبارات، جرائد، ناول، رسائل اور متعدد خواتین کے رسائل کا اجرا ہوا۔ یہ اخبارات و جرائد اپنے عہد کی تصویر کشی کے ساتھ رائے عامہ بھی ہموار کر رہے تھے۔ اس دور کے بہت سے اہم واقعات میں سب سے اہم مسلم لیگ کا قیام ہے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ تمام مسلمان قائدین نے مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت کے قیام پر اتفاق کیا اور یوں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ مسلم لیگ کا نام سر محمد شفیع (۱۸۶۹ء۔۱۹۳۲ء) نے تجویز کیا جو منظور کر لیا گیا۔

بین الاقوامی سطح پر بھی مسلمان مشکلات میں گھرے ہوئے تھے۔ ترکی کی حکومت بدعنوانیوں کا شکار تھی اور اس کے زیر اثر سارے علاقے میں سیاسی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اسی دور میں جنگ طرابلس شروع ہوئی۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی کے ساتھ جنگ شروع ہو گئی جو ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء تک جاری رہی۔ جنگ طرابلس کے حوالے سے ''فاطمہ بنت عبداللہ'' اور ''طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس

میں'' جیسی معرکتہ الآرا نظمیں وجود میں آئیں۔ اقبالؔ (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کے علاوہ بھی اس دور کے شاعروں نے جنگ طرابلس کے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں ظفر علی خان (۱۸۵۳ء۔۱۹۵۶ء)اور زخ ش (۱۸۹۴ء۔۱۹۲۲ء) قابلِ ذکر ہیں۔ [۲۰]

۱۹۱۴ء میں عالمی جنگ شروع ہوئی، ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا اور ہزیمت اٹھائی، اس جنگ میں ایک طرف جرمنی، ترکی اور بلغاریہ اور دوسری طرف برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی، رومانیہ، پرتگال، جاپان اور امریکہ تھے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو جرمنی نے جنگ بند کر دی اور صلح کی درخواست کی۔ ۲۸ جون ۱۹۱۹ء کو فریقین کے مابین واسائی کے مقام پر صلح کا معاہدہ ہوگیا۔ جنگ عظیم میں دونوں فریقین کے تقریباً ایک کروڑ آدمی مارے گئے اور دو کروڑ کے لگ بھگ ناکارہ ہو گئے۔ [۲۱]

ان حالات میں ہندستان کے مسلمان مسلسل اضطراب اور بے چینی کا شکار رہے۔ ان کے دل اپنے ترک مسلمان بھائیوں کے ساتھ تھے۔ ۱۹۱۱ء کے بعد مسلمانانِ ہند نے ترکی کے مستقبل اور مسلمانوں کے متبرک مقامات کی حفاظت کے لیے اپنی تشویش کا اظہار تین طریقوں سے کیا۔ اس وقت کے اردو ادب کے ذریعے، اردو اخبارات کی اشاعت کر کے اور مادی امداد کر کے۔ اس دور کے اردو ادب میں بھی مغربی سامراج پر کڑی تنقید کی گئی اور مسلم کش پالیسی پر افسوس کا اظہار اور احتجاج کیا گیا۔ شبلی نعمانی، اکبرالہ آبادی اور علامہ اقبالؔ کی خدمات اس حوالے سے قابلِ قدر ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کا اخبار زمیندار (۱۹۰۳ء) مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۱ء) کا ہفت روزہ کامریڈ (۱۹۱۱ء) اور روزنامہ ہمدرد (۱۹۱۳ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء) کا الہلال (۱۹۱۲ء) جاری ہوا۔ ان اخبارات نے انگریز حکومت کی پالیسیوں اور ہندستان کے باشندوں خصوصاً مسلمانوں سے بدسلوکی کے خلاف بطور احتجاج صاف اور واضح انداز میں ایسے مضامین لکھے کہ حکومت کے ایوان لرز اٹھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء۔۱۹۳۸ء) اور ابوالکلام آزاد اپنی تحریروں اور تقریروں کی وجہ سے کئی دفعہ گرفتار ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی کی حمایت میں یہاں کئی تحریکیں چل پڑیں جن میں تحریک خلافت بہت اہم ہے۔ ترکی کی مدد کے لیے چندہ جمع کر کے بلقان کی جنگوں کے دوران ایک طبّی مشن ترکی روانہ کیا گیا۔ [۲۲]

۴ نومبر ۱۹۱۴ء کو ترکی کی جرمنی کی حمایت میں جنگ میں شمولیت کے فوراً بعد وائسرائے ہند نے حکومت انگلستان کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ یہ جنگ سیاسی ہے، اور اس میں کوئی مذہبی سوال شامل نہیں ہے۔حکومت نے وقتی طور پر مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ وعدہ بھی کیا کہ مسلمانوں کے متبرک مقامات کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی۔لیکن جنگ (۱۹۱۸ء میں) ختم ہونے کے بعد صلح نامہ کی شرائط میں ترکی کی قسمت کا فیصلہ ان تمام وعدوں کے برعکس کیا گیا جو انگریز حکومت مسلمانانِ ہند سے کرتی رہی تھی۔عراق، شام اور فلسطین کا انتظام حکومت برطانیہ کے سپرد اور اڈولیا اور سمرنا کو بالترتیب اٹلی اور یونان کے سپرد کر دیا گیا۔تھریس اور قسطنطنیہ کو بین الاقوامی شہر بنا دیا گیا۔یہ شرائط مسلمانوں کے لیے بہت سخت اور ذلت آمیز تھیں۔خلافت کو بالکل محدود کر دیا گیا اور اسلامی علاقوں پر غیر مسلم حکومتوں کا قبضہ ہو گیا۔

ہندُستانیوں کی امنگوں اور حسرتوں کو رولٹ ایکٹ جیسے تشدد آمیز قانون سے دبانے کی کوشش کی گئی۔اس کے بعد برعظیم کی سرزمین پر جو ڈراما کھیلا گیا وہ تاریخ کی یادگار بن گیا۔جلیانوالہ کا خونی سانحہ رچایا گیا اور پنجاب میں مارشل لا کے نام پر خوف و ہراس پھیلانے کی مذموم کوشش کی گئی۔ ترکی کی سلطنت کی شکست اور حالات کے خاتمے نے مسلمانوں کے جذبات و احساسات میں مزید تلخی پیدا کر دی۔ایک طرف جبر و استبداد اور دوسری طرف نہتے عوام تھے۔اس دور میں جہاں مولانا ظفر علی خاںؔ (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء)، چکبستؔ اور اقبالؔ آزادی کی ایک لہر پیدا کر رہے تھے وہاں صنف نازک بھی کسی سے پیچھے نہ تھیں۔زاہدہ خاتون شروانیہ زؔہت اس دور کی خواتین میں ایک نا قابلِ فراموش ہستی ہیں۔انھوں نے اس دور کے حالات و واقعات کو نہ صرف ایک باشعور اور حساس شاعرہ کی حیثیت سے محسوس کیا بلکہ ان پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتی رہیں۔انھوں نے اپنی شاعری، مضامین اور خطوط میں اس عہد کو قلم بند کیا ہے۔[۲۳]

پہلی جنگ عظیم میں دس لاکھ فرزندانِ ہند کا خون بہا اور اس کے بدلے نہیں رولٹ ایکٹ، سانحہ جلیانوالہ باغ اور مارشل لا کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ان داخلی عناصر کا تقاضا تھا کہ ہندُستان کی اقوام باہم مل جائیں۔اسی لیے کانگریس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔اس دور میں ہندستان کے راہنما گاندھی جی کو چھ سال کے لیے قید کر دیا گیا۔۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات تحریک کے

تحت ہزاروں لوگ افغانستان ہجرت کر گئے، ہزاروں لوگ پابندِ سلاسل ہو گئے۔ اس سیاسی وسماجی پس منظر میں خواتین شاعرات کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ اب ان کی شاعری صرف حسن وعشق تک محدود نہ رہی۔ اب شاعری میں اصلاحی، معاشرتی، تمدنی اور ہر طرح کے موضوع زیر بحث لائے گئے۔ جو عورتیں اس وقت قلم اٹھاتے ہوئے ہچکچاتی تھیں ان حالات میں ان کے مجموعے طبع ہو کر منظر عام پر آ گئے۔ حالیؔ اور آزادؔ نے جس عوام کی بنیاد ڈالی تھی وہ خواتین میں عام ہو گئی۔[۲۴]

خواتین کی تعلیمی بیداری کا یہ دور سیاسی بیداری کا دور بھی ہے۔ ۱۹۲۲ء کے دوران تحریک خلافت کی جدوجہد میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ آبادی بیگم جو "بی اماں" (۱۸۵۲ء۔۱۹۲۴ء) کے نام سے پہچانی گئیں اپنے دور اور آنے والے دور کے لیے ایک روشن مثال ثابت ہوئیں۔ بی اماں نہ صرف خود تحریک خلافت کے دوران باہر آ کر میدان عمل میں سرگرم ہوئیں بلکہ اپنی نوجوان بہو امجدی بیگم، بانو بیگم، بیگم مولانا محمد علی کو بھی ساتھ لانا شروع کیا جن سے مسلمان خواتین میں جدوجہد آزادی میں شرکت کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اسی حوصلے کی بدولت وہ قائدِ اعظم (۱۸۷۶ء ۔۱۹۴۸ء) اور فاطمہ جناح (۱۸۹۴ء۔۱۹۶۷ء) کے شانہ بشانہ مسلم لیگ کے پرچم تلے آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوئیں اور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشے پر معرضِ وجود میں آیا۔ یہ بلاشبہ مسلمانانِ ہند کی ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد اور کاوشوں کا ثمر ہی تھا جو ایک الگ اور آزاد وطن کی صورت میں ہمیں حاصل ہوا۔

۴۔ بیداریِ نسواں کی تحریک کا آغاز وارتقا

اقوام عالم کی معاشرتی، تمدنی اور سیاسی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آئی کہ ظہور اسلام سے قبل کسی بھی دور میں خواتین کی اہمیت اور قدر ومنزلت نہ تھی۔ دنیا کی تمام اقوام اور تمام ادیان ومذاہب میں ہمیشہ ہر موقع پر خواتین کا استحصال کیا گیا۔ عزت واہمیت دینا تو درکنار بحیثیت انسان اس کے جائز حقوق کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ طبقۂ انسانی میں سب سے کم تر اور حقیر مخلوق، خواتین کو گردانا جاتا تھا۔

ہندُستان میں بھی جو اپنی تمدّنی اور تہذیبی تاریخ کے اعتبار سے منفرد اور مقدّم سمجھا جاتا تھا۔ خواتین کا کوئی مقام متعین نہیں کیا گیا، بلکہ ہمیشہ ان کے حقوق پامال ہوتے رہے۔ ہندو دھرم میں

عورت کو ملیچھ اور شودر سے بھی گرا کر جانوروں کے ہم پلہ لا کھڑا کیا گیا۔ عورت کو عقل و شعور سے بے بہرہ تصور کیا گیا۔ نہ اسے عبادت کا حق حاصل تھا اور نہ ہی نکاح و طلاق جیسے تمدنی اور معاشرتی امور میں وہ عمل دخل کی مستحق تھی۔ یہی حالت جین مت اور بدھ مت میں بھی عورت کی تھی۔ عیسائیت اور یہودیت میں بھی عورت کو کوئی مرتبہ و مقام حاصل نہ تھا۔

مذاہب عالم کے علاوہ اپنے زمانے کی تہذیب یافتہ اقوام نے بھی عورت کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھا۔ یونان میں بھی، جو تہذیب و تمدن کا گہوارہ، عقل و دانش اور علم و حکمت کا سرچشمہ رہا ہے، عورت کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ یونانیوں کے نزدیک عورت کا مصرف، صرف نسلِ انسانی میں اضافہ کرنا تھا۔ ہسپانویوں کا خیال تھا کہ عورت خواہ کتنی ہی زیادہ باشعور اور عقل مند کیوں نہ ہو، اس پر ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ چینیوں کے ہاں یہ ضرب المثل عام تھی کہ عورت کی بات سن لینی چاہیے مگر اس کے نیک و بد مشورے پر عمل نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ اس کی نیکی میں بھی برائی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ رومی تو عورت کو شوہر کی ملکیت قرار دیتے تھے۔[۲۵]

مذاہب و ادیان اور مہذب اقوام میں جب عورت کی یہ حیثیت ہو کہ وہ ہر لحاظ سے حقیر اور کمتر خیال کی جاتی ہو تو یہ کیسے خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس نے علم و عمل اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے کوئی کارنامے سر انجام دیے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد قدیم کی تاریخ، ایسی خواتین کے تذکروں سے خالی ہے جو مردوں کے مد مقابل آ سکیں۔ لیکن جب آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام آیا تو اس نے مرد اور عورت دونوں کے برابر حقوق متعین کیے۔ اسلام کا طبقۂ نسواں پر اس سے زیادہ اور کیا عظیم احسان ہو سکتا ہے کہ اس نے انھیں تمام شعبہ ہائے زندگی میں عملی حیثیت سے مردوں کے مقابل لا کھڑا کیا۔ اس کی بطور انسان حیثیت متعین کی اور اس کی قدر و منزلت بڑھا کر اپنے علم و عمل، عقل و شعور اور حکمت و دانائی کو کام میں لا کر دنیا کے کام آنے کا موقع فراہم کیا۔ مذاہب اقوامِ عالم میں صرف اسلام اور مسلمانوں ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ علم و فن کی ذیل میں خواتین کی طویل فہرست پیش کر سکتے ہیں اور یہ فہرست صدیوں پر محیط ہے۔[۲۶]

لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی پورے معاشرے پر جمود طاری ہو گیا اور تہذیبی و تمدنی اقدار کے بدلنے سے علم و عمل کا فقدان ہو گیا۔ روایت پسندی اور تقلید پرستی نے رواج پایا، جس

سے پورا معاشرہ جہل کی طرف راغب ہو گیا۔ اسی جمود و جہل نے خواتین کو بھی، جو مسلم معاشرے میں مردوں کے مدمقابل علمی سرگرمیوں میں ان کی ہمسر تھیں، علمی افق سے اس طرح رخصت کیا کہ مسلم معاشرے میں تعلیمِ نسواں کا تصور ہی ختم ہو کر رہ گیا۔

اٹھارہویں صدی میں برِّعظیم میں تعلیمِ نسواں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کا کام پہلے عیسائی مشنریوں، ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی راج نے انجام دیا۔ اٹھارہویں صدی میں عیسائی مبلغین، ان کی بیویوں اور تبلیغی مشن کی دوسری کارکن خواتین نے سب سے پہلے ہندو اور مسلمان عورت کی پستی اور اس کی ذلت آمیز زندگی کو محسوس کیا۔ اگر چہ ان کا مقصد ہندُستانی خواتین کو عیسائیت کی طرف راغب کرنا تھا، وہ اپنے اس مقصد میں تو کامیاب نہ ہو سکیں، البتہ ان کی ان کاوشوں کی بدولت برِّعظیم میں جدید خطوط پر تعلیمِ نسواں کی بات ہونے لگی۔ تعلیم نسواں کی ابتدائی کوشش مدارس پریزیڈنسی کے گورنر کی بیوی لیڈی کیمبل کے قائم کردہ زنانہ یتیم خانے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ۱۷۸۷ء میں قائم ہونے والا LADY CAMBELL FEMAL ORPHAN ASSYLUM پہلا ایسا تعلیمی ادارہ تھا جہاں ہندُستانی خواتین کو اس وقت کے تقاضوں کے مطابق جدید تعلیم دی جاتی تھی۔ [۲۷]

اٹھارہویں صدی کے خاتمے تک انگریز عملی طور پر ہندُستان پر قابض ہو چکے تھے۔ انھوں نے عام تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں پر بھی خصوصی توجہ دی۔ ڈیوڈ ہیئر (David Hare) وہ پہلا شخص تھا جس نے ۱۸۲۰ء میں بنگالی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کلکتہ میں انجمن اطفال قائم کی۔ [۲۸]

انیسویں صدی کے اوائل تک ہندُستانی خواتین میں تعلیم کی رفتار کافی سست رہی۔ ولیم ایڈم ایک باہمت اور سرگرم مشنری تھا جس نے ۱۸۳۵ء سے ۱۸۳۸ء کے درمیان تعلیمی ترقی کے حوالے سے اپنی رپورٹیں مرتب کیں۔ اس کی دوسری رپورٹ کے مطابق تعلیمی لحاظ سے بنگال کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ ایڈم کے مطابق ۴،۹۶،۹۷۴ کی کل آبادی میں ۲۱،۹۰۷ مردوں کے مقابلے میں صرف ۴ خواندہ خواتین تھیں۔ [۲۹]

تعلیم نسواں کی تحریک میں مسیحی مشنریوں کا بہت بڑا کردار ہے۔ مشنریوں نے ۱۸۱۹ء میں ہندستانی لڑکیوں کے لیے علیحدہ اسکول قائم کیے۔ خصوصاً ۱۸۱۳ء اور ۱۸۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضہ علاقوں میں عیسائی مشنریوں نے تعلیمی حوالے سے بہت کام کیا۔۱۸۲۴ء میں لیڈی امہرسٹ کی سرپرستی میں (LADIES SOCIETY FOR NATIVE FEMALE EDUCATION) کا قیام عمل میں لایا گیا جس کی زیرنگرانی خواتین کے ۳۰ اسکول قائم کیے گئے۔اسی طرح لندن میں مشنری سوسائٹی اور چرچ مشنری سوسائٹی نے تعلیم نسواں کے فروغ کے سلسلے میں مفید خدمات سرانجام دیں۔لیکن مشنریوں کی ان کوششوں کے باوجود تعلیم نسواں کی رفتار سست رہی۔اس کی کئی وجوہات تھیں۔مثلاً دیسی اسکولوں کی تعداد بہت کم تھی۔کرسچن مشنریوں کے قائم کردہ اسکولوں میں اونچی ذات کے ہندو اور مسلمان اپنی خواتین کو تبدیلیء مذہب کے ڈر سے بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔خود برطانوی حکومت نے ان اسکولوں کو اپنی سرپرستی میں لینے سے انکار کردیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہندُستان میں عوام تعلیم نسواں کے خلاف اتنے متعصب تھے کہ اس سلسلے میں کی گئی حکومتی کوششیں، ملک میں شدید بحران کا باعث ہوسکتی تھیں۔

برِّعظیم کی خواتین ہمیشہ لارڈ بنٹنک اور لارڈ ڈلہوزی کی احسان مندرہیں گی۔بنٹک نے نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھا کر ستی کی وحشیانہ رسم کو ختم کیا اور لارڈ ڈلہوزی (جو ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ء تک گورنر جنرل کے عہدے پر فائز رہے) نے کہا کہ ہندُستان میں کوئی بھی بات خواتین کی تعلیم سے زیادہ اہم بنیادی تبدیلی لانے کا سبب نہیں ہوسکتی۔چنانچہ انہوں نے خواتین کی تعلیم کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم نسواں کو حکومت کے زیر سرپرستی لانے کی کوشش کی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ آزادی کے بعد تعلیمِ نسواں پر اور زیادہ توجہ دی گئی۔[۳۰]

تعلیمِ نسواں کی اشاعت اور اس کے فروغ میں ان روشن خیال انگریزوں کا بھی بہت اہم کردار ہے جو سیکولر نظام تعلیم کے حامی تھے اور تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں ہندُستانیوں کی ذاتی کاوشوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے تھے۔لارڈ ایف۔ای۔ڈی۔بیتھون (F.E.D Bethune) (۱۸۰۱ء تا ۱۸۵۱ء) تعلیمِ نسواں سے خصوصی دلچسپی رکھتا تھا اور اسے یہ احساس تھا کہ اونچی ذات کے ہندو اپنی لڑکیوں کو مشنری اسکولوں میں نہیں بھیجیں گے، چنانچہ اس نے اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی سے ہندُستانی لڑکیوں کے لیے پہلا سیکولر اسکول ۱۸۴۹ء میں قائم کیا، جو بعد میں کالج بنا اور آج بھی بیتھون کالج کے نام سے مشہور ہے۔[۳۱] اس سکول کی کارکردگی کی بدولت کم مدت میں ہی اچھی خاصی لڑکیاں یہاں تعلیم

حاصل کرنے لگیں۔ جن کی ذہانت بیتھون کی رائے میں نہ صرف لڑکوں کے برابر بلکہ اپنی ہم عمر یورپین لڑکیوں سے بھی زیادہ تھی۔ [۳۲]

یہ تعلیمِ نسواں کی سرکاری سرپرستی تھی جس کی بنا پر BORTHWIK یہ لکھنے کے قابل ہوا کہ ۱۸۵۴ء میں بنگال پریذیڈنسی، مدراس پریذیڈنسی، بمبئی پریذیڈنسی، اسکے علاوہ شمال مغربی صوبے اور اودھ میں خواتین کے ۶۲۶ اسکول قائم ہو چکے تھے جن میں ۲۱،۷۵۵ خواتین حصول علم میں مشغول تھیں۔[۳۳] انگریز عمل داری میں ۱۸۶۰ء کے قریب، علم دوست انگریز حکام کی راہنمائی میں جابجا علمی اور ثقافتی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا۔ آگرہ، بنارس، شاہجہاں پور اور لکھنؤ میں معاشرتی اصلاح، اور تعلیمِ نسواں پر زور دیا گیا۔ اس سلسلے میں گورنر شمال مغربی صوبہ جات سر ولیم مور اور ڈائریکٹر تعلیمات مسٹر کیمپسن (M. Kempson) کی کوششیں قابلِ ذکر ہیں۔ مسٹر ولیم مور کو اشاعت تعلیم سے گہری دلچسپی تھی اور وہ تعلیم نسواں کے بڑے داعی تھے۔ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ آف پنجاب نے تعلیمِ نسواں کی طرف توجہ کی۔ پنجاب کے گورنر ڈونلڈ میکلوڈ کی سرکردگی میں میجر فلر اور کیپٹن ہالرائڈ نے تعلیم نسواں پر توجہ دی اور اس غرض سے الگ کتابیں لکھوائیں۔ ان حضرات کی کوششوں کے نتیجے میں مدارس برائے خواتین اور نارمل اسکول معرض وجود میں آئے۔ لیکن اس ضمن میں قوم کی یکسر بے توجہی نے اس کوشش کا ہونا نہ ہونا برابر کر دیا۔ ان مدارس میں معمولی گھرانوں کی لڑکیاں داخلہ لیتیں۔ اعلیٰ درجے کے مسلم گھرانے اپنی لڑکیوں کو ان سکولوں میں تعلیم دلوانا، اپنی شان کے خلاف سمجھتے نیز لڑکیوں کی کم سنی میں شادی بھی تعلیمِ نسواں کے فروغ میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ [۳۴]

اگرچہ مذہبی جوش اور تبلیغی ضرورتوں کے تحت ہی سہی، برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور امریکہ سے آئی ہوئی مشنری خواتین نے ہی ہندوستانی خواتین کی سیکولر تعلیم کے لیے راہ ہموار کی اور اسکول قائم کیے۔ چرچ آف انگلینڈ، زنانہ مشنری سوسائٹی اور زنانہ بائبل سوسائٹی کے نام سے کام کرنے والی تبلیغی تنظیموں سے وابستہ ان خواتین نے اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں تعلیم نسواں کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی بھتیجی مہارانی تپسوینی (Maharani Tapasvini) نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور سزا کاٹ کر رہائی کے بعد انہوں نے بنگال میں تعلیم نسواں کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح مرشد آباد کے راجہ کرشنو ناتھ کمار کی

بیوہ رانی شرنومئی (Rani Sharnomoyee) نے تعلیمِ نسواں کے لیے مالی امداد فراہم کی اور ۱۸۸۶ء میں کلکتہ کے میڈیکل کالج میں خواتین کے لیے ایک ہاسٹل تعمیر کروایا۔ برطانوی نژاد میری کارپنٹر نے تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۷ء کے دوران چار مرتبہ ہندُستان کا سفر کیا اور خواتین کے لیے اسکول قائم کیے۔ ۱۸۷۳ء میں مانک جی کرسٹ نے بمبئی میں پارسی خواتین کے لیے ایک اسکول کھولا جس میں ہندو اور مسلمان لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کرسکتی تھیں۔ اینتی اکرائڈ Annette Akroyd نے ۱۸۷۳ء میں بعض ہندُستانیوں کی مدد سے ہندو خواتین کے لیے اسکول قائم کیا۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن کی تعلیمی رپورٹ میں سرکاری سرپرستی میں چلنے والے اسکولوں میں خرابیوں کی نشاندہی کی گئی اور خواتین کی تعلیم پر اصرار کیا گیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے ۱۸۸۹ء میں خواتین کے اسکولوں کی گرانٹ میں اضافہ کیا گیا۔[۳۵]

انگریزی نظامِ تعلیم کے مسلط ہوجانے کے بعد ہندُستان کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ مغربی افکار اور مغربی تعلیم کی وجہ سے ہندُستانی عوام میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا دائرہ وسیع ہوا۔ مغربی علوم کے مطالعہ نے ہندُستانی عوام کو دنیا کی مختلف تحاریک، انقلابات اور ان کے اثرات کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ کے۔ ایم پنکر نے انگریزی تعلیم کے اثرات کے حوالے سے لکھا ہے کہ جہاں برٹش ایڈمنسٹریشن نے ہندُستانیوں کے لیے بہت کام کیا ہے وہاں صرف انگریزی تعلیم کے نفاذ سے ہندُستانیوں کے فرسودہ رسم و رواج، ان کے تعصّبات اور مافوق الفطرت عقائد دور کرنے اور ان کے اندر ایک نئی سوچ پروان چڑھانے میں مدد ملی۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیداری نے ہندُستانی دانشوروں کو بھی ابھارا اور انہوں نے بھی سماج کی فرسودہ رسوم، مافوق الفطرت عقائد اور جہالت کو دور کرنے کے لیے اصلاحی مہم شروع کی اور اپنے خیالات و افکار کی اشاعت کے لیے ہندُستان میں مختلف مقامات پر مختلف انجمنیں قائم کیں مثلاً برہمو سماج، آریا سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، پرارتھنا سماج اور رام کرشن مشن وغیرہ۔[۳۶]

انگریزوں نے تعلیمِ نسواں کے باب میں بہت سعی و کوشش کی، لیکن ان کوششوں کے پس پردہ مقاصد ڈھکے چھپے نہ تھے۔ ایک طرف وہ ان کوششوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتے تھے دوسری طرف دینِ عیسوی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافت و معاشرت کو ہندُستان پر مسلط کرنا

چاہتے تھے۔ ہر ذہین اور سوجھ بوجھ رکھنے والا ہندوستانی ان کے اس تعلیمی نظام کے پردے میں چھپے ہوئے مقاصد کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ خصوصاً مسلمان جو اپنی مذہبی روایات، اخلاقی اقدار اور نظام تعلیم کو بہتر خیال کرتے تھے، اس کو زیادہ ہی محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ثقافت و معاشرت اور نظامِ تعلیم کے تحفظ کے لیے جدوجہد بھی کی۔

سرسید احمد خاں برّعظیم میں جدید تعلیم کے بانی ہیں۔ انھوں نے احیائے علوم کی تحریک شروع کی۔ انہی کی تعلیمی تحاریک برّعظیم میں نسائی تعلیم کی بنیاد بنیں۔ سرسید کے رفقا میں تعلیمِ نسواں کے حامی بھی شامل تھے جنھوں نے تعلیم نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں عملی کردار ادا کیا۔ سرسید کی کوششوں سے مردوں میں جدید علوم کے حصول سے جو روشن خیالی پیدا ہوئی اس کی وجہ سے وہ اپنی خواتین کی تعلیم میں دلچسپی لینے لگے اور ان فرسودہ روایات سے باغی ہو گئے جو مسلم گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم اور ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ سرسید احمد خان کی توجہ مردوں کی تعلیم پر مرکوز رہنے کی وجہ اس زمانے کے حالات تھے۔ ہندوستانی معاشرہ جدید علوم کی آبیاری کے لیے اتنا زرخیز نہیں تھا کہ اس پر ہر طرح کے بیج ڈالے جا سکتے۔ مسلمان مردوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی سرسید کو جن تجربات سے گزرنا پڑا وہ کسی عام انسان کے حوصلے پست کرنے کے لیے کافی تھے۔ کافر، نیچری، انگریزوں کے ایجنٹ جیسے الزامات کے باوجود وہ اس میدان میں ثابت قدم رہے اور اپنی پوری قوت اپنے مقصد کے حصول پر صرف کر دی۔

۱۸۸۴ء میں انجمن حیات الاسلام لاہور نے لڑکیوں کے لیے دو پرائمری اسکول قائم کیے۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ تعلیم نسواں کا رواج بڑھ رہا تھا۔ صرف دو برس کے اندر انجمن کو مزید آٹھ اسکول کھولنے پڑے اور ۱۸۸۶ء میں صورت حال یہ تھی کہ انجمن دس اسکولوں کا نظم و نسق چلا رہی تھی۔ پنجاب میں ان اسکولوں کے قیام کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو جدید تعلیم سے بھی روشناس کرانا چاہتے تھے اور اس بات سے بھی خوفزدہ تھے کہ مشنری تعلیمی ادارے کہیں ان کی لڑکیوں کا مذہب تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔[۳۷]

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا آغاز سرسید احمد نے ۱۸۸۲ء میں کیا اور اس کی ایک شاخ ۱۸۹۰ء میں تعلیمِ نسواں کی ترقی کے لیے قائم کی گئی۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلم خواتین کی تعلیم کی راہ میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ ۱۸۸۹ء میں شیخ خیرالدین نے ایک قرارداد پیش کی کہ اسلامی قوانین

اور شرفا کی اقدار اور روایات کے مطابق مسلمان لڑکیوں کے لیے بھی تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ یہ قرار داد بحث و مباحثے کے بعد منظور کر لی گئی۔ ۱۸۹۱ء کے سالانہ اجلاس میں ایک اور قرارداد خواجہ غلام الثقلین نے بیرسٹر سید کرامت حسین کی تائید کے ساتھ پیش کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خواتین کی تعلیم بھی بہت ضروری ہے تاکہ آئندہ نسلوں کی تربیت میں وہ فعال کردار ادا کر سکیں۔ اسی کانفرنس میں سر سید احمد خاں نے بھی اس بات کی وضاحت کر دی کہ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف نہیں۔ ۱۸۹۶ء میں کلکتہ کی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں تعلیم نسواں کا الگ شعبہ قائم کیا گیا اور سید کرامت حسین اس کے سیکرٹری مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد ۱۸۹۹ء میں جسٹس سید امیر علی نے بھی ایک قرارداد پیش کی جس میں انھوں نے ہر صوبے کے دارالحکومت میں خواتین کے لیے ایسے اداروں کے قیام پر زور دیا جن میں خواتین کو اسلامی اصولوں اور مسلمان شرفاء کی روایات کے مطابق تعلیم دی جائے۔[۳۸]

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی اعانت اور ہمت افزائی سے شیخ عبداللہ اس کے شعبۂ خواتین کے سیکرٹری منتخب کیے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں لکھنو میں شعبۂ خواتین کے اجلاس میں علی گڑھ میں خواتین اساتذہ کی تربیت کے لیے ایک اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم تعلیم نسواں کی تحریک کو بڑھانے میں پیش پیش رہے۔ ۱۹۰۴ء میں انھوں نے خواتین کے لیے خاتون نامی رسالہ جاری کیا۔ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے خواتین کا ایک اسکول قائم کیا۔ جس کا افتتاح بھوپال کی نواب سلطانہ جہاں بیگم (۱۸۳۸ء۔۱۹۰۱ء) نے کیا۔ جو بہت روشن دماغ حکمران تھیں اور خواتین کی تعلیم میں خصوصی دلچسپی رکھتی تھیں۔ انھوں نے نہ صرف بھوپال بلکہ پورے ملک کی خواتین کی تعلیمی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔

بیگم بھوپال نے اپنی ریاست میں لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیا۔ شیخ عبداللہ کے قائم کردہ علی گڑھ اسکول کی مالی اعانت کی۔ انھوں نے تہذیب نسواں اور تربیت نسواں کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب خود لکھی اور ملک کے نامور مصنفین کو خواتین کے لیے کتابیں لکھنے اور مرتب کرنے پر مامور کیا۔ مولانا حالی نے انہی کے کہنے پر ایک معیاری کتاب مجالس النساء لکھی جو طویل عرصے تک لڑکیوں کے نصاب کا حصہ رہی۔ شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم نے ۱۹۰۸ء میں انجمن

TH-14446

خواتین اسلام کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں میں تعلیم کا چرچا ہوا تو بااثر خواتین بھی تعلیم عام کرنے کے لیے متحرک ہو گئیں اور انھوں نے اپنے اثاثے تعلیم نسواں کے لیے وقف کر دیے۔

آگرہ میں ۱۹۱۲ء تک لڑکیوں کا کوئی اسکول نہیں تھا۔ یہاں مولوی سعید احمد زبیری کی کوشش سے صغیر فاطمہ نسواں اسکول قائم ہوا۔ صغیر فاطمہ کا نوجوانی میں انتقال ہوا تھا۔ ان کے والدین نے ان کا زیور اور اثاثے اس سکول کے قیام کے لیے مولوی سعید احمد کے سپرد کر دیئے۔ بہار میں صغریٰ بیگم نے خواتین کی تعلیم کے لیے اپنی جائداد وقف کر دی۔ نواب بیگم بہاولپور نے ''دارالعلوم ندوہ'' کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ بیگم صغریٰ ہمایوں مرزا نے ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد دکن میں خواتین کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا۔ بمبئی میں ایک تاجر حاجی محمد اسمٰعیل کی کوششوں سے تعلیم کا چرچا ہوا جس کے اثرات اطراف کے علاقوں پر بھی پڑے۔ بیگم عطیہ فیضی نے اپنی بہنوں زہرہ فیضی اور نازلی بیگم آف جنجیرہ کے ساتھ ایک اسکول قائم کیا جس میں فنونِ لطیفہ کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں سید نذر محی الدین (جو بٹالہ کے سجادہ نشین تھے) نے گوجرانوالہ میں لڑکیوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ مولانا عبدالحق عباسی نے ۱۹۲۶ء میں جالندھر میں لڑکیوں کے لیے ''مدرسۃ البنات'' قائم کیا۔ بنگال میں سہروردی خاندان اپنی علمی روایات کے حوالے سے کافی نمایاں تھا۔ خجستہ اختر سہروردی (بیگم شائستہ اکرام اللہ کی پھوپھی) پہلی مسلمان خاتون تھیں جنھوں نے کلکتہ سے سینئر کیمبرج امتحان پاس کیا۔ انھوں نے مدناپور اور کلکتہ میں مسلمان لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے۔ ز۔خ۔ش (۱۸۹۴ء۔۱۹۲۲ء) (زاہدہ خاتون شروانیہ) نے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام میں بھرپور دلچسپی لی۔ اور اس سلسلے میں منظوم اپیل کی جو یونیورسٹی کے چندے کے لیے تھی۔[۳۹]

تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے جہاں مسلمانوں کے ایک گروہ نے عملی طور پر قدم اٹھایا وہاں مسلمانوں کے دوسرے گروہ نے تعلیم نسواں سے عام بیزاری اور بے حسی کو دور کرنے کے لیے اپنی تحریروں سے تحریک شروع کی۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو سرسید کی تعلیمی تحریک سے یا تو منسلک تھے یا اس کے حامی تھے۔ ان میں خاص طور پر ڈپٹی نذیر احمد، حالؔی، شبلی، شرؔر، محسن الملک (۱۸۳۷ء۔۱۹۰۷ء) اور پھر ان کے بعد بشیر الدین، صغریٰ ہمایوں مرزا، محمدی بیگم اور والدۂ سلیمان شامل تھے۔ ان لوگوں نے اپنی تحریروں سے خواتین کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کی کوشش کر کے

ایک طرف تو ان میں اکتسابی تعلیم کے شوق کو بڑھانے کے لیے انہیں نئے نئے علوم سیکھنے کی ترغیب دی اور دوسری طرف ان میں موجود سماجی و معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے ہندُستانی مسلمان خواتین کو یہ باور کرایا کہ تعلیم ہی وہ حربہ ہے جس سے انسان ساری برائیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اور تعلیم کسی مخصوص طبقہ اور مخصوص جنس کے لیے نہیں بلکہ یہ سب کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ خواتین اس کی زیادہ ضرورت مند ہیں کیونکہ ہماری آئندہ نسل کی تہذیب و ترقی اور تربیت کی ذمہ دار خواتین ہیں۔ تعلیمی اصلاح کی ان کوششوں کی وجہ سے خود ہندُستان میں تعلیم یافتہ مسلم خواتین کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور اپنی تصانیف و تالیفات سے خواتین میں بیداری، آزادی اور اصلاح کی لہر دوڑا دی۔[۲۰]

ہندُستانی مسلمانوں کی تعلیم نسواں کی تحریک کی نوعیت دو طرح کی رہی ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو برطانوی نظام تعلیم کو بہتر سمجھتا تھا اس نے مسلمان خواتین کے لیے جدید تعلیم کی تحریک شروع کی۔ سرسید کا تعلق اسی گروہ سے تھا۔ وہ ہندُستانی مسلمانوں کے لیے جدید علوم وفنون کو بہتر سمجھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انگریز تعلیم یافتہ و ترقی یافتہ قوم تھی۔ اور سائنس، ٹیکنالوجی، علم و ہنر ہر میدان میں وہ ہندستانی قوم سے سو سال آگے تھی۔ لہٰذا وقت کا تقاضا یہی تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے۔ اس مکتبۂ فکر کے حامیوں میں مولوی نذیر احمد، شیخ عبداللہ اور محسن الملک وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ شیخ عبداللہ کا رسالہ خاتون بھی اسی خیال کی ترجمانی کرتا تھا اور مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے ایک اہم ذریعہ مانا جاتا تھا۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو مسلمان خواتین کی تعلیم کو تو مقدم سمجھتے تھے لیکن وہ جدید تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خواتین کو تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے لیکن وہ تعلیم مذہب اور امور خانہ داری تک ہی محدود ہو کیوں کہ ایک عورت کی زندگی صرف گھر تک ہی محدود ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے صرف ایک اچھی بیوی ہی بننا چاہیے تا کہ وہ اپنے شوہر کی دیکھ بھال اور بچوں کی تربیت اچھی طرح کر سکے۔ اس مکتبۂ فکر کے حامیوں میں علامہ راشد الخیری کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے رسالے عصمت میں زیادہ تر ایسے مضامین شائع ہوئے جن کا تعلق خواتین میں مذہبی تعلیم کا رجحان پیدا کرنا، خاوند کی بڑائی کو تسلیم کرنا، پردہ کی اہمیت کو

ماننا وغیرہ سے تھا۔ تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاتا تھا لیکن انگریزی تعلیم، مشنری سکولوں کی تعلیم کی مخالفت کی جاتی تھی اور مسلمانوں خصوصاً مسلم خواتین کو مغربی تہذیب و تمدن کی چمک دمک سے دور رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ کوئی دقیانوسی رسالہ تھا بلکہ عصمت ایک متوازن و معتدل رسالہ تھا جس میں نہ صرف قومی، بلکہ بین الاقوامی حالات سے بھی خواتین کو آگاہ رکھا جاتا تھا۔ عالمی سیاست پر بھی گہری روشنی ڈالی جاتی تھی۔ غرض یہ کہ مذہبی، سیاسی، اخلاقی، تفریحی ہر قسم کی معلومات قارئین کی دلچسپی کے لیے عصمت کی زینت بنائی جاتی تھیں۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر نسیم آرا، اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ (کراچی :انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص ۶۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۳۔ ایضاً، ص ۷۵۔

۴۔ ندرت شبنم لودھی، ''اردو شاعری میں خواتین کا حصہ''، سہ ماہی اردو ج ۸۷، ش ۱ تا ۴ (۲۰۰۸ء): ص ۹۴۔۹۵۔

۵۔ محمد امین زبیری، مسلم خواتین کی تعلیم (کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ۱۹۷۱ء)، ص ۶۹۔

۶۔ ایضاً، ص ۶۹۔

۷۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۸۰۔

۸۔ احمد جاوید ، ''خواتین کا ادب ۔۔۔ ایک اجمالی جائزہ'' سہ ماہی ادبیات ج ۱۸، ش ۷۵۔۷۴ (جنوری تا جون ۲۰۰۷ء): ص ۳۶۱۔

۹۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، داستانِ صحافت (لاہور: مکتبۂ کارواں، س ن)، ص ۹۷۔

۱۰۔ محمد امین زبیری، ص ۱۵۱۔

۱۱۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن، زخ ش (حیات و شاعری کا تنقیدی جائزہ) (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء)، ص ۶۲۔

۱۲۔ عتیق احمد صدیقی، ''سرسید اور تعلیم نسواں'' سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر (دہلی: ۲۰۰۰ء): ص ۲۷۱۔

۱۳۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۰۲۔

۱۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سر سید ا حمد خان اور ان کے رفقا کی نثر کافنی و

فکری جائزہ (لاہور: علی کتب خانہ، ۱۹۷۹ء) ص ۲۱۸۔

۱۵۔ ڈپٹی نذیر احمد، مراۃ العروس مرتب شائستہ اکرام اللہ (کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۶۱ء) ص ۵۱۔۵۲۔

۱۶۔ سرسید احمد خان، مکتوب سرسید احمد خان مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی (لاہور: مجلس ترقی ادب، س ن) ص ۳۸۰۔۳۸۲۔

۱۷۔ مسز رابعہ اقبال، اردو ادب اور طبقۂ نسواں (حیدر آباد: ادارۂ اردو، ۱۹۹۰ء) ص ۱۷۔۲۱۔

۱۸۔ ڈاکٹر انور سدید، ص ۳۰۲۔

۱۹۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، حالیؔ کا ذہنی ارتقا (لاہور: مکتبہ کارواں، س ن) ص ۹۵۔

۲۰۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن، ص ۲۳۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۶۔

۲۴۔ ندرت شبنم لودھی، ص ۱۳۲۔

۲۵۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۵۹۔۶۰۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۱۔۶۴۔

۲۷۔ زاہدہ حنا، عورت: زندگی کا زنداں (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۷۳۔

۲۸۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۷۶۔

۲۹۔ ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل، ہندستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ (دہلی: اے ون فوٹو آفیسٹ، ۱۹۹۱ء)، ص ۸۵۔

۳۰۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۷۷۔

۳۱۔ زاہدہ حنا، ص۱۷۴۔

۳۲۔ ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل، ص۸۹۔

۳۳۔ زاہدہ حنا، ص۱۷۴۔

۳۴۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ''افسانہ نگار، قصہ نگار اور ناول نگار خواتین کا ادب'' پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء):ص۳۰۱۔

۳۵۔ زاہدہ حنا،ص۱۷۷۔

۳۶۔ ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل، ص۹۱۔

۳۷۔ زاہدہ حنا،ص۱۷۷۔

۳۸۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن، ص۶۱۔

۳۹۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن، ص۶۵۔

۴۰۔ ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل ،ص۱۱۵۔۱۱۶۔

باب دوم

اردو ادبی رسائل کے تناظر میں ماہنامہ
عصمت کی اہمیت اور انفرادیت

باب دوم

اردو ادبی رسائل کے تناظر میں ماہنامہ عصمت کی اہمیت اور انفرادیت

ا۔ اردو ادبی رسائل: آغاز و متنوع جہات

کسی بھی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے اور عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لیے رسائل و جرائد مؤثر وسیلۂ اظہار ہیں۔ یہ رسائل و جرائد جہاں زبان و ادب کی توسیع و ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں وہاں یہ لوگوں کو کسی نقطۂ نظر پر متفق کرنے اور ان کا ذہن بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کی ترقی میں ادبی رسائل کا ہمیشہ فعال کردار رہا ہے۔ ادبی رسالہ عوام کی ذہنی تربیت میں ایک مؤثر اور فعال قوت کے طور پر کام کرتا ہے۔ ادبی رسالے کے پڑھنے والوں کا حلقہ جتنا وسیع ہوگا ادب کا عمل اتنا ہی زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔

ادبی رسالے میں ممتاز ادبا کے ساتھ نئے لکھاریوں کو بھی چھپنے کا موقع ملتا ہے۔ کلاسیکی روایت کے ساتھ پرانی اصناف میں نئے تجربات کو بھی سامنے لایا جاتا ہے۔ اس طرح ادبی رسالہ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ایک نسل کی میراث آنے والی نسلوں کے سپرد کرتا ہے۔ ادبی رسالہ صرف زمانۂ حال کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ آج کا ادب جب ماضی کا حصہ بن جاتا ہے تو ادبی رسالہ ہی اس خزانے کو محفوظ کرتا ہے اور یہ تنقید و تحقیق کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ کسی قوم کی تہذیبی رفعت کے اندازے کے لیے صرف یہی دیکھنا کافی ہوتا ہے کہ اس قوم میں کس معیار کے ادبی رسائل شائع ہوتے ہیں اور ان رسائل کا حلقۂ قرات کتنا وسیع اور عرصہ حیات کتنا طویل ہے۔ ادبی رسائل اپنے دور کے تخلیقی سفر کے اہم ترین دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جہاں وہ ایک طرف اہل قلم کی متنوع تحریروں سے قارئین کو استفادے کا موقع دیتے ہیں وہاں وہ ناقدین، مورخین اور محققین کے لیے بھی ایسا مواد فراہم کرتے ہیں جس سے کسی مخصوص دور کے ادبی رجحانات و میلانات کا

اندازہ لگایا جا سکے اور احساسات و جذبات کی تفہیم کی جا سکے۔

برِّعظیم میں ادبی رسائل انیسویں صدی میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ادبی صحافت کی طرف پہلا قدم مولوی محمد باقر نے اٹھایا تھا جو مولانا محمد حسین آزاد کے والد گرامی اور دہلی اردو اخبار کے مدیر تھے۔ لیکن ادبی جریدہ نگاری کو فروغ ماسٹر رام چندر (۱۸۲۱ء۔۱۸۸۰ء) اور سر سید احمد خان نے دیا جو ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مصلح قوم بھی تھے۔ رسالہ فوائد الناظرین ماسٹر رام چندر کی روشن خیالی کا اور تہذیب الاخلاق سر سید کی کشادہ فکری کا عکاس تھا۔ اس بامعنی ابتدا کو میر ناصر علی دہلوی (۱۸۴۷ء۔۱۹۳۳ء)، عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء۔۱۹۲۶ء) اور حسرت موہانی (۱۸۷۸ء۔۱۹۵۱ء) نے فکر انگیز اور مثبت جہت دی۔ انھوں نے صدائے عام، دل گداز اور اردوئے معلی جیسے رسائل سے نہ صرف ادب کو ترقی دی بلکہ ان رسائل کی مدد سے قوم کی ذہنی، فکری، تہذیبی اور ادبی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔

بیسویں صدی میں ارتقا کے اس سفر میں مخزن کے مدیر شیخ عبدالقادر، ستارۂ صبح کے مدیر مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) زمانہ (۱۸۸۰ء) کے مدیر دیا نرائن نگم، الہلال (۱۹۱۲ء) کے مدیر ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء)، ادبی دنیا کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد (۱۹۳۵ء۔۱۹۹۴ء)، ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی (۱۹۰۶ء۔۱۹۶۷ء)، شاہکار کے مدیر تاجور نجیب آبادی (۱۸۹۳ء۔۱۹۵۱ء) ہمایوں (۱۹۲۲ء) کے مدیر میاں بشیر احمد (۱۸۹۳ء۔۱۹۷۱ء) اور مولانا حامد علی خان (۱۹۰۱ء۔۱۹۹۵ء) اور نگار کے نامور مدیر نیاز فتح پوری (۱۸۸۴ء۔۱۹۶۶ء) شامل ہوئے اور ان سب نے ادبی رسائل سے فکری تحریکیں برپا کرنے کا کام نہایت دانش مندی سے لیا۔ یہ ادبی رسائل ادب کے فروغ و ارتقا اور معاشرے کی علمی ترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کرتے رہے۔[۱]

اردو کا پہلا ماہانہ رسالہ خیر خواہ ہند ہے۔ جو عیسائی مذہب کی تبلیغی ضرورتوں کے لیے مرزا پور سے پادری ایف. جی برایت نے جاری کیا۔ اس کے مدیر آر۔ سی ماتھر تھے۔ خیر خواہ ہند میں پہلی دفعہ علمی اور تبلیغی قسم کے مضامین کو خبروں پر فوقیت دی گئی۔ یہ رسالہ ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا لیکن

۱۸۵۷ء میں ہنگاموں کے ایام میں کچھ عرصے کے لیے بند کر دیا گیا۔ ۱۸۴۵ء میں مسٹر اشپر نگر دلی کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے تو انہوں نے ایک ہفتہ وار اردو رسالے قرآن السعدین کی بنیاد ڈالی۔ اس رسالے کے مقاصد تعلیمی تھے اور اس میں سائنس، ادب اور سیاست پر بحث ہوتی تھی۔ اس رسالے نے دلی کالج کے طلبا کے علمی و ادبی ذوق کی آبیاری میں نمایاں کردار ادا کیا۔

دلی کالج کے ہی نامور استاد ماسٹر رام چندر نے غیر ملکی رسائل کے نمونے پر اردو میں ماہنامہ خیر خواہ ہند جاری کیا جو طبعیات، ہیئت اور اخلاقیات جیسے مضامین کے لیے وقف تھا۔ یہ ماہنامہ ستمبر ۱۸۴۷ء میں جاری ہوا۔ نومبر ۱۸۴۷ء میں اس کا نام تبدیل کر کے محب ہند کر دیا گیا۔[۲] نام کی تبدیلی اس لیے عمل میں لائی گئی کہ اسی نام سے ایک اور رسالہ مرزا پور سے بھی نکل رہا تھا۔ محب ہند میں تاریخی نوعیت کے جو نادر ادبی مضامین شائع ہوئے ان میں یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامہ کے علاوہ بہادر شاہ ظفر اور شاہ نصیر کی غزلیات بہت اہم ہیں۔ محب ہند کی نوعیت اگر چہ علمی تھی لیکن اس نے ادب کے فروغ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اس میں علمی موضوعات کو بھی اہمیت دی گئی۔ بعض شعرا مثلاً فردوسی کی شاعری پر تنقیدی محاکمہ پیش کیا گیا۔ سفر نامے کی صنف کے ابتدائی نقوش ابھارے اور علمی موضوعات میں استدلال و شائستگی کو فروغ دیا۔

محب ہند کی اشاعت کے بعد ادبی صحافت کو ایک نئی کروٹ مل گئی۔ چنانچہ جنوری ۱۸۵۳ء میں منشی دیوان چند نے لاہور سے رسالہ ہمائے بے بہا جاری کیا۔ محمد حسن احسن کلانوری نے جولائی ۱۸۵۴ء میں ماہنامہ معلم ہند کی بنیاد لاہور میں ڈالی۔ منشی ہر سکھ رائے کا علمی و ادبی ماہنامہ خورشید پنجاب جنوری ۱۸۵۶ء میں شائع ہوا۔ جنوری ۱۸۵۶ء میں سیالکوٹ سے رسالہ نورٌ علیٰ نور اور آگرہ سے منشی شیونرائن آرام کی ادارت میں ادبی ہفت روزہ مفید خلائق جاری ہوا۔[۳] مفید خلائق کی ادبی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ منشی آرام اس میں دوسرے شعرا کے علاوہ مرزا غالب کا کلام بالالتزام چھاپتے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد السنۂ شرقیہ کی نامور شخصیت ڈاکٹر لائینز کی صدارت میں ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' قائم کی گئی۔ ۱۸۶۵ء میں اس انجمن کے تحت رسالہ انجمن

جاری کیا گیا جس کے مدیر مولانا محمد حسین آزاد مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس رسالے کی ادبی جہت کو تقویت دی اور اس میں علمی و ادبی مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔

اردو ادبی صحافت کی ابتدا صحیح معنوں میں سرسید احمد خان کے رسالے تہذیب الاخلاق سے ہوئی۔ یہ رسالہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو جاری ہوا۔[۷] اس رسالے کے دو نام تھے، اردو میں تہذیب الاخلاق اور انگریزی میں دی محمڈن سوشل ریفارمر یہ اردو زبان میں ہر ماہ تین بار شائع ہوتا تھا۔ تہذیب الاخلاق نے مسلمانوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس اخبار نے مسلمانوں کو فرسودہ روایات، رسومات کی اندھا دھند تقلید ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنی زندگیوں میں اسلام کو رائج کریں۔ لڑکیوں کے لیے بھی تعلیم کا انتظام کریں اور ہر قسم کے علوم وفنون سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں۔ اس رسالے نے تہذیبی، علمی اور ادبی پہلوؤں پر لوگوں کو کام کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ اس رسالے کے ذریعے سرسید نے مضمون نویسی کو رواج دیا۔ سادگی عبارت پر توجہ دی گئی۔ تہذیب الاخلاق کی منفرد عطا یہ بھی ہے کہ اس نے زندگی کے معمولی مظاہر اور اشیاء پر غیر رسمی نظر ڈالنے کی روایت ڈالی اور انشائیہ جیسی شائستہ اور نرم خو صنفِ ادب کے ابتدائی نقوش فراہم کیے۔ اس رسالے سے متعدد مسلمان مفکر اور ادیب سامنے آئے۔ ان میں سرسید احمد خاں، محسن الملک، مولوی پیر بخش، مولوی فارقلیط اللہ، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ء)، مولوی چراغ علی (۱۸۴۴ء۔۱۸۹۵ء)، وقار الملک (۱۸۹۱ء۔۱۹۱۷ء)، وحید الدین سلیم (۱۸۶۹ء۔۱۹۲۸ء)، مرزا عابد علی، منشی مشتاق حسین اور مہدی علی افادی (۱۸۷۷ء۔۱۹۲۱ء) کے نام معروف اور ممتاز ہیں۔ ادیبوں کی اس جماعت کے لیے ادب زندگی کی بامعنی سرگرمی تھا۔ اس جماعت نے ادب کو پیشے کے بجائے مشن کے طور پر قبول کیا۔

آگرہ سے میر ناصر علی (۱۸۴۷ء۔۱۹۳۳ء) کا رسالہ تیرھویں صدی اکتوبر ۱۸۷۹ء میں جاری ہوا۔ یہ پرچہ ادب و انشاء کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ فکر ونظر کے اعتبار سے اس نے علی گڑھ تحریک کی مخالفت کی اور سرسید اور حالی کے نظریات پر شدید نکتہ چینی کی۔ تیرھویں صدی کے حصہ نثر کے مدیر میر ناصر علی تھے اور حصہ نظم کی ادارت حافظ رحیم اللہ صابری اکبر آبادی کے سپرد تھی۔ میر ناصر علی نے

صلائے عام کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے میں انہوں نے ادبی مسائل اور علمی موضوعات کے علاوہ انشائیہ نگاری کے چند ابتدائی نمونے بھی پیش کیے اور تیرھویں صدی اور صلائے عام کو ادبی خزینوں سے مالا مال کر دیا۔[۶]

محمد عسکری وسیم نے خیر آباد لکھنوء سے اردو علم وادب کی ترویج و ترقی کے لیے جنوری ۱۸۹۱ء کو ماہنامہ گل چین جاری کیا۔ اس رسالے میں اس دور کے نامور اردو شعرا کا کلام اہتمام کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اپنی جدت طرازی کی بنا پر یہ رسالہ ادبی حلقوں میں معتبر پرچہ قرار پایا۔[۷] ۱۸۹۷ء میں ''محبّ حسین'' کی ادارت میں حیدر آباد دکن سے ماہنامہ افسر جاری ہوا۔ دو سال کے بعد ''مولوی عبدالحق'' اس کے مدیر مقرر ہوئے اور بہت جلد اس ماہنامے نے ایک علمی و ادبی پرچے کی شہرت حاصل کر لی۔ افسر کے قلمی معاونین میں مولانا حالؔی، مولوی عزیز مرزا، چراغ علی، ذکاء اللہ، اکبر خان، مولانا ظفر علی خاں، نواب عماد الملک، مولوی غلام الثقلین اور مولانا گرامی (۱۹۲۰ء۔۱۹۷۶ء) جیسے ادبا شامل تھے۔ اس پرچے کی خصوصی اہمیت کتابوں پر تبصروں کی وجہ سے بھی تھی۔ ہر ماہ بہترین مقالے پر مضمون نگار کو نقد انعام دیا جاتا تھا۔ افسر مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) بابائے اردو کی روشن خیالی اور آزاد خیالی کا مظہر تھا۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو اس دور میں بہت کم رسائل نے ادب کے خالص مسائل پر توجہ دی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی امور کو اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ ان تمام رسائل میں ادبی اسلوب پر تنقید کرنے کا انداز نمایاں ہے۔ شعری تنقید میں فنی مباحث اور عروضی و لفظی غلطیوں کی اصلاح کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ اس دور میں ادبی رسائل کی اشاعت میں باقاعدگی نظر نہیں آتی۔ پھر بھی ان ادبی رسائل نے قوم کی فکر اور ادبی آبیاری اور ذہنی تربیت میں جو کردار ادا کیا وہ قابلِ تعریف ہے۔[۸]

۲۔ بیداری نسواں میں اردو ادبی رسائل کا کردار

برِّعظیم پاک و ہند کے قدیم تہذیبی معاشرے میں عورت خاتون خانہ تھی، اسے حصول علم کے کشادہ اور وافر مواقع میسر نہیں تھے۔ خانہ داری اور ابتدائی مذہبی کتب کی تعلیم تک اسے محدود رکھا گیا

تھا۔انیسویں صدی کے وسط میں نئی طرز کے مدارس کے قیام کے ساتھ خواتین کی تعلیم کی ضرورت کو بھی محسوس کیا گیا، اس مقصد کے حصول کے لیے ایسی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں دلچسپی لی گئی جن سے خواتین کی ذہنی اور مجلسی تربیت کا کام لیا جاسکے۔ گارساں دتاسی نے ۸ دسمبر ۱۸۵۳ء کے خطبہ میں مولوی کریم الدین کی تحسین اس لیے بھی کی ہے کہ انہوں نے خواتین کی تعلیم پر ایک کتاب لکھی تھی اور بقول گارساں دتاسی:

''یہ وہ مسئلہ ہے جس کے متعلق ہندستان میں بہت غفلت برتی جاتی ہے۔'' [9]

انگریزی حکومت نے معلمات کے لیے نارمل سکول قائم کرائے اور ۱۸۵۱ء میں تعلیم نسواں کی تحریک چل پڑی۔ اس دور میں معاشرتی اور سماجی بہبود کے لیے جو انجمنیں مختلف شہروں میں قائم ہوئیں ان میں سے بیشتر نے تعلیم نسواں کے فروغ میں گہری دلچسپی لی اور بنارس، آگرہ، دہلی اور لکھنؤ جیسے مرکزی شہروں میں لڑکیوں کے متعدد مدارس قائم ہوئے اور اب تعلیم نسواں کے لیے مناسب، مفید اور دلچسپ کتابوں کی شدید کمی محسوس کی جانے لگی۔ اس ضرورت کو صوبہ شمال مغربی کے گورنر سر ولیم مور اور ڈائریکٹر تعلیمات نے محسوس کیا اور نہ صرف اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مصنفین کی حوصلہ افزائی کی بلکہ ۱۸۶۴ء میں داستان جمیلہ خاتون کے نام سے خود بھی ایک سبق آموز کتاب لکھی۔ رسوم ہند (۱۸۶۸ء) کے چند قصوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی معاشرتی زندگی کے عکاس چند قصے ملتے ہیں جن میں خصوصاً ایسی رسوم کا تذکرہ کیا گیا ہے جن پر خواتین کاربند تھیں۔ اس دور میں تعلیم نسواں کی تحریک کو عام کرنے اور خواتین کی تربیت کے مقاصد کے پیش نظر ایسے رسائل کے اجرا کی ضرورت بھی محسوس کی جانے لگی جو ان مقاصد کے حصول میں معاون ثابت ہوں۔

مولوی محبّ حسین نے معلم کے نام سے ۱۸۸۱ء میں ایک پرچہ نکالا جو خالصتاً علمی و ادبی رسالہ تھا۔ جس میں فلسفہ، اخلاق، سائنس، طب، تاریخ اور ادب پر مضامین شامل ہوتے تھے۔ اس رسالے نے طبقۂ نسواں پر خصوصی توجہ دی اور اس طبقے کی اصلاح، تعلیم اور حقوقِ نسواں پر مضامین شائع کیے۔ مولوی محبّ حسین کو ابتدا سے ہی طبقۂ نسواں کی اصلاح و ترقی کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کی تڑپ تھی۔ جب انھوں نے معلم شفیق اور معلم جاری کیے اس وقت جلسۂ خیر خواہ ہند

سے یہ تڑپ اور بڑھ گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ وہ معلم کے مقاصد میں طبقۂ نسواں کی بہبود اور تعلیم نسواں کو شامل کریں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مولوی محبّ حسین وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے طبقۂ نسواں سے متعلق عملی قدم اٹھایا۔ لیکن خالصتاً طبقۂ نسواں کے لیے رسالہ نکالنے کا سہرا سید احمد دہلوی ہی (۱۸۴۶ء، ۱۹۱۸ء) کے سر ہے۔

معلم میں تعلیمِ نسواں، حقوق نسواں اور پردے پر مضامین شامل ہوتے تھے۔ ''اخبارِ نسواں'' کے عنوان سے خواتین کی خبریں دی جاتی تھیں۔ سب سے اہم ''مسدس نسواں'' ہے جو اس رسالے کے ذریعے منظرِ عام پر آئی۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں عورتوں کی جملہ خصوصیات تاریخی حقائق کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں۔ اولاد پر ان کے اثرات، موجودہ معاشرے میں ان کی حیثیت، رسم و رواج کے خواتین پر مہلک اثرات اور موجودہ پردے کی رکاوٹوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مغرب کی مشہور خواتین کے اصلاحی، معاشرتی اور تعلیمی کارنامے بیان کر کے غیرت دلائی گئی ہے اور بارگاہِ ایزدی میں دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہیں کہ اس طبقے کی حالت کو بہتر بنا دے۔ الطاف حسین حالؔی نے جس طرح مسدس ''مدروجزرِ اسلام'' میں مسلمانوں کا پُر درد مرثیہ لکھا ہے اسی طرح مولوی محبّ حسین نے اسی جوش و خروش سے ہندستانی عورتوں کا مرثیہ لکھا ہے:

یہ تاکید ہے جا بجا اپنے دیں میں — کہ باعلم ہوں عورتیں مسلمیں میں
کریں علم حاصل جو ہو ملکِ چیں میں — اگر شک ہو دیکھو، حدیثِ متیں میں
فریضہ پیمبر نے جس کو بتایا
اسے ہم نے، افسوس دل سے بھلایا

محبّؔ مانگ اب یہ دعا تُو خدا سے — رہائی ہو نسواں کی دامِ بلا سے
تعصّب کے پھندے سے، حرص و ہوا سے — جہالت کے ظلم اور جور و جفا سے
تو کر ان کی حالت پہ اب رحم داتا!
نہیں ان کو مردوں سے کوئی بھی آسا

۲

مولوی سید احمد دہلوی (۱۸۴۶ء۔۱۹۱۸ء) مؤلف فرہنگ آصفیہ نے خواتین کی تعلیمی اور

سماجی ترقی میں گہری دلچسپی لی اوران مقاصد کے حصول کے لیے یکم اگست ۱۸۸۴ءکو رسالہ اخبار النساء جاری کیا جسے خواتین کے لیے پہلا باقاعدہ رسالہ شمار کرنا چاہیے۔اس رسالے میں خواتین کی خانہ داری کے امور کے علاوہ ان کی تعلیمی تربیت کے حوالے سے بھی مضامین لکھے جاتے تھے۔اخبار النساء نے مشرقی روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ قدامت، جہالت اور کم علمی کے اندھیروں کو دور کرنے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔اخبار النساء چونکہ خواتین کا پہلا ادبی رسالہ تھا اس لیے اس پر پھبتیاں بھی کسی جاتی رہیں۔مولانا رازق الخیری کے بقول اخبار النساء کو ''اخباروں کی جورو'' کہا جاتا تھا لیکن مولوی سید احمد دہلوی اس کا برا نہیں مانتے تھے۔

اخبار النساء صحیح معنوں میں طبقۂ نسواں کا نمائندہ تھا، اس کے ذریعے اردو زبان میں خواتین اہلِ قلم کی نگارشات چھپ کر سامنے آئیں جو دوسری خواتین کے علمی وتحریری ذوق کے لیے تازیانہ ثابت ہوئیں۔مولوی سید احمد دہلوی کی جرأت و ہمت قابلِ داد ہے کہ ایسے دور میں جب مردوں کی تعلیم کی بھی ہر طرف مخالفت ہو رہی تھی، خواتین کو علمی میدان میں لانا ان ہی کا کام تھا۔یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ان کے اس جرأت مندانہ قدم کے آگے بڑے بڑے مصلح پیچھے نظر آنے لگتے ہیں۔

منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کو بھی تعلیم نسواں سے شروع ہی سے بہت دلچسپی رہی۔چنانچہ انہوں نے ۱۸۹۳ء میں ایک ماہوار رسالہ شریف بیبیاں جاری کیا۔اس رسالے کو جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کی لاکھوں بے زبان مخلوقات (فرقۂ نسواں) کی خانہ داری کی تعلیم سے متعلق ایسے مضامین جاری کیے جائیں جن سے نہ صرف گھر جنت کا نمونہ بن جائیں بلکہ آئندہ نسل کی تربیت میں بھی اس رسالے سے مدد ملے۔یہ رسالہ منشی محبوب عالم کی جدت پسند طبیعت کا آئینہ دار ہونے کی وجہ سے اپنے دور کے باقی رسائل سے بالکل جداگانہ انداز کا حامل تھا۔اس رسالے میں ادب وصحافت کے ملے جلے رجحانات نظر آتے تھے۔اس میں جہاں تعلیمِ نسواں اور ترقی نسواں پر مضامین ہوتے تھے وہاں معاشرتی واصلاحی ناول اور ادبی وتاریخی مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔اس رسالے کے مستقل عنوانات یہ تھے: ''ممتاز عورتیں''، ''شریف بیبیاں''، ''زنانہ

بہادری کی مثالیں''، ''روئے زمین کی عورتیں''، ''انتظام خانہ داری''، ''دسترخوان''، اور ''تربیت اطفال''۔

''ممتاز عورتیں'': یہ مستقل عنوان تاریخی نوعیت کا حامل تھا۔ اس کے ذریعے دنیا کی مشہور و ممتاز عورتوں کے حالات و واقعات سے روشناس کرایا جاتا تھا۔ لیکن زیادہ تر مسلمان خواتین پر مضامین ہوتے تھے۔ اس عنوان کے تحت ممتاز محل، ارجمند بانو، فلورنس نائٹ اینگل اور رانی کرنا تھ وغیرہ کے حالات بیان کیے گئے۔ اسی طرح ایک اور تاریخی عنوان ''روئے زمین کی عورتیں'' تھا۔ اس میں مختلف ممالک کی عورتوں کے حالات، طرزِ زندگی اور طرزِ معاشرت سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ گویا یہ رسالہ ہندستان کی خواتین سے متعلق جملہ معلومات پر حاوی تھا۔ لیکن تاریخی پہلو اس میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے منشی محبوب عالم اپنے زمانے کی خواتین کو تاریخ کا آئینہ دکھا کر ان کی اصلاح کے خواہاں تھے۔ اس لیے اس رسالے میں زیادہ تر تاریخی مواد ہی ہوا کرتا تھا۔ تہذیب و شائستگی اس رسالے کا طرۂ امتیاز تھا۔ شریف بیبیاں کے بند ہونے کے بعد منشی محبوب عالم نے دوبارہ جولائی ۱۹۰۹ء میں نام بدل کر شریف بی بی جاری کیا۔ اس رسالے کے تمام مندرجات اور مستقل سلسلے وہی تھے جو رسالہ شریف بیبیاں کے تھے۔ منشی محبوب عالم اعتدال پسند طبیعت کے مالک ہونے کی بنا پر پردے کے مخالف نہ تھے۔ اپنے رسالے میں بھی انہوں نے اعتدال پسند رویے ہی کو پیش نظر رکھا۔ وہ اسلامی روایات ہی کے تحت خواتین کو ترقی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں مرکوز کر دی تھیں۔ پھر زبان و بیان کی سادگی نے ان کی بات اور زیادہ مؤثر بنا دی۔

مولوی محبّ حسین نے معلم کو نومبر ۱۸۹۴ء میں معلم نسواں کا نام دے دیا۔[۱۱] چنانچہ سرورق پر ''معلم'' کے نیچے ''نسواں'' کا لفظ خفی قلم سے لکھ دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ عبارت بھی درج کر دی گئی:

> اس رسالے کی غایت ترقی و تعلیم نسواں ہے اور اس میں فقط عورتوں ہی کی حالت سے بحث کی جاتی ہے۔[۱۲]

نام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ رسالے کے مندرجات میں بھی واضح تبدیلی کی گئی۔ اس شمارے کے ذریعے وہ زیادہ پر جوش ہو کر خواتین سے متعلق مضامین لکھنے لگے۔ مثلاً اس شمارے میں اخبارِ نسواں کا عنوان معلم کے سابقہ پرچوں کی طرح تسلسل کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ اس کے علاوہ ''موجودہ پردہ شرعی پردہ نہیں''، ''صوبہ بہار میں تعلیمِ نسواں کی ترقی'' اور ''عورتیں اور طبابت'' وغیرہ جیسے عنوانات پر عمدہ مضامین تھے۔ تمام مضامین عورتوں کی فلاح و بہبود، تعلیمِ نسواں، پرورشِ اطفال اور مختلف ممالک کی خواتین کے حالات سے متعلق ہوتے تھے۔ گویا صحیح معنوں میں یہ رسالہ اب ''معلمِ نسواں'' بن کر ابھرا۔ مولوی محبّ حسین نے خواتین کے ہاتھ میں قلم دیا، انھیں لکھنے پر اکسایا اور ان کے مضامین کو اپنے رسالے میں جگہ دے کر ''خادمِ نسواں'' ہونے کا ثبوت دیا۔ انہوں نے مستورات کی حمایت میں ہر محاذ پر کام کیا۔ خواتین کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جو اپنے قلم سے رسالے کی زینت نہ بنایا ہو۔ معلمِ نسواں ۱۹۰۱ء تک کامیابی کیساتھ نکلتا رہا اور اپنی زندگی کے ۲۰ سال پورے کر کے بالآخر شائع ہونا بند ہو گیا۔[۱۳]

پنجاب میں تعلیم و بہبودِ نسواں کی تحریک کو جن لوگوں نے فروغ دیا، ان میں سید ممتاز علی (۱۸۶۰ء-۱۹۳۵ء) کو یہ اہمیت بھی حاصل ہے کہ انہوں نے تہذیبِ نسواں کے نام سے محمدی بیگم کی زیرِ ادارت ایک ہفتہ وار رسالہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو اپنے ادارہ دارالاشاعت لاہور سے جاری کیا۔ پرچے کا نام سرسید احمد خان کی جانب سے تجویز کردہ تھا۔[۱۴] خواتین کے لیے اس پرچے کے اجرا پر پرانے خیالات کے مسلمانوں نے شدید ردِعمل ظاہر کیا لیکن بتدریج لوگ اس رسالے کی افادیت کے قائل ہوتے چلے گئے۔ سید ممتاز علی نے اس رسالے میں خواتین کے سماجی، تہذیبی، مذہبی اور فکری مسائل کو زیرِ بحث لانے کا سلسلہ وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ ان کا مقصد خواتین کو صرف امورِ خانہ داری سے واقف کرانا نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے خواتین کی خوابیدہ ادبی صلاحیتوں کو بیدار کر کے انھیں اپنے مسائل کا خود ادراک کرنے کا شعور بخشا۔ تہذیبِ نسواں کو ایک ایسے ادبی پرچے کی حیثیت حاصل تھی جسے مرد ادبا مرتب کرتے تھے لیکن جس کا رجحان بہبودیِ نسواں کی طرف تھا۔ اس رسالے نے خواتین کی ذہنی بیداری، شعور کی پختگی، تعلیم میں پیش قدمی اور مسائلِ حیات میں براہِ

راست شرکت کے رجحان کو تقویت دی۔ تہذیب نسواں کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ یہ نصف صدی تک خواتین کے حقوق کی جنگ لڑتا رہا۔ اس رسالے نے خواتین میں لکھنے کا اعتماد پیدا کیا اور انہیں اپنا تخلیقی کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ رسالہ اس دور کی نئی لکھاری خواتین کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں کے لیے اس رسالے نے پہلی سیڑھی کا کام کیا۔

تہذیب نسواں کا بنیادی مقصد تعلیمِ نسواں تھا۔ اگر چہ اس رسالے کے اجرا سے قبل تحریکِ تعلیمِ نسواں شروع ہو چکی تھی تاہم تہذیب نسواں نے اس تحریک کو بڑے زور و شور سے آگے بڑھایا۔ تعلیمِ نسواں کی اہمیت و ضرورت پر مسلسل مضامین شائع کیے اور علمی طور پر خواتین میں پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا کیا۔ ''عورتوں کی تعلیم''، ''ہماری تعلیم''، ''عورتوں کی اعلیٰ تعلیم''، ''تعلیم کا شوق'' جیسے عنوانات پر ۱۹۰۵ء میں مضامین شائع ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں مستورات میں ترقی تعلیم، قومی کانفرنس اور تعلیمِ نسواں وغیرہ جیسے موضوعات پر مضامین لکھے گئے۔ اس کے علاوہ اسکولوں سے متعلق خبریں، مختلف علاقوں کی تعلیمی حالت، عورتوں کی دینی تعلیم، تعلیم نسواں کے لیے نصاب وغیرہ پر بے شمار مضامین لکھے گئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ملک کے کونے کونے میں نئے اسکول قائم ہوئے۔

تعلیمِ نسواں کے ساتھ ساتھ تہذیب نسواں نے اصلاحِ رسوم و عقائد اور معاشرتی امور پر بھی بہت زور دیا۔ دراصل معاشرتی و اخلاقی بگاڑ میں بے جا رسوم، غلط عقائد اور کردار کی بے راہ روی کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور ہندستان میں سلطنت مغلیہ کے دورِ آخر میں یہ چیز بہت نمایاں ہو گئی تھی۔ شادی بیاہ اور عقیقے وغیرہ میں بہت سی فضول رسمیں رائج ہو گئی تھیں۔ قبر پرستی، تعویز گنڈے اور چڑھاوؤں کا زور ہو گیا تھا۔ یہ سب تعلیم کے فقدان کا نتیجہ تھا۔ خصوصاً خواتین میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے تہذیب نسواں میں ایسے مضامین لکھے گئے جن کے ذریعے رسوم و عقائد اور معاشرتی امور کی اصلاح کی جا سکے۔

تہذیب نسواں اس اعتبار سے اسم بامسمّٰی اخبار تھا کہ اس کے ذریعے جہاں اور امور پر توجہ دی گئی وہاں تہذیب اور شائستگی پر بھی توجہ مرکوز کی گئی۔ بری عادتوں کی نشان دہی کی گئی، اچھے اخلاق پر مضامین پیش کیے گئے تا کہ قوم کی بہن، بیٹیوں کو سوچنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس

رسالے نے خواتین میں مذہبِ اسلام سے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کی اور یہ باور کرانے کی ہر ممکن سعی کی کہ مسلمان خواتین کی ترقی کا راز دین داری میں مضمر ہے۔ تہذیب نسواں کا سب سے بڑا کارنامہ خواتین میں علمی و ادبی ذوق اور تصنیف و تالیف کا شوق پروان چڑھانا ہے۔ خواتین میں جس قدر معروف اہلِ قلم ہوئی ہیں ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جس نے تہذیب نسواں سے الگ رہ کر اپنا نام کمایا ہو۔ غرض یہ کہ تہذیبِ نسواں نے تربیتِ اطفال اور امور خانہ داری سے لے کر سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنے تک ہر سطح پر خواتین کی رہنمائی کی۔

سفیرِ قیصر کے نام سے محمد نذیر سعد نے ۲۵ ستمبر ۱۹۰۰ء کو میرٹھ سے ایک رسالہ جاری کیا۔ سرورق پر درمیان میں رسالے کا نام اور دائیں بائیں جانب ''تعلیم'' اور ''نسواں'' کے الفاظ تحریر ہوتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''تعلیمِ نسواں'' اس رسالے کا موٹو تھا۔ اس رسالے میں تعلیمِ نسواں، امور خانہ داری اور تاریخی و معاشرتی موضوعات پر لکھا گیا۔ اس رسالے میں تعلیمِ نسواں کو زیادہ سے زیادہ رواج دینے پر زور دیا گیا تا کہ نسوانی ادب میں اضافہ ہو۔[۱۵]

مولانا عبدالحلیم شرر (۱۹۲۶ء-۱۸۶۰ء) ادب و صحافت کی بڑی قدآور شخصیت ہیں۔ ان کے ادبی مقالات و مضامین اور تاریخی ناول زبان و بیان، اسلوبِ نگارش اور طرزِ ادا کے لحاظ سے ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے نومبر ۱۹۰۰ء میں لکھنؤ سے پردۂ عصمت جاری کیا۔ سرورق کی پیشانی پر پردۂ عصمت جلی حروف میں اور اس کے نیچے خطِ نسخ میں یہ حدیث مع ترجمہ دی جاتی تھی:

خِیَارِکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَائِکُم

ترجمہ: تم میں اچھے وہی لوگ ہیں جو اپنی بیویوں کے حق میں اچھے ہیں۔

یہ رسالہ خواتین کی اصلاح کے لیے نکالا گیا تھا اور خاص طور پر غیر شرعی پردے کی ممانعت میں نکالا گیا تھا۔ مولانا صاحب تاریخ، ادب اور علوم دینیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ حضرت علامۃ العصر نذیر حسین محدث سے علمِ حدیث حاصل کیا تھا اس لیے پردے کی اہمیت اور اس کی شرعی حدود و قیود سے بخوبی واقف تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ خواتین کی تعلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پردہ ہے۔

جوانہیں مسجدوں اور مدرسوں میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے انہوں نے غیر شرعی پردے کی مخالفت میں یہ رسالہ نکالا۔ اس پر قدیم رجحانات کے حامل لوگوں نے ان پر شدید تنقید کی اور ملک کے گوشے گوشے سے ان کی مخالفت کی گئی۔

ماہنامہ خاتون جولائی ۱۹۰۴ء میں شیخ محمد عبداللہ کی ادارت میں علی گڑھ سے جاری ہوا۔ ۱۶؎ خواتین کی تعلیم اور بیداری کے سلسلے میں شیخ محمد عبداللہ کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے برصغیر کی خواتین میں تعلیم کی ترقی کے لیے ہر ذریعہ اپنایا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تعلیمِ نسواں شاخ سے آل انڈیا مسلم لیڈیز کے قیام تک انھوں نے تعلیم کی راہ میں حائل بہت سی دشواریوں کا سامنا کیا۔ رسالہ خاتون کے اجراء کا مقصد بھی ان خیالات کی ترویج اور عملی اقدامات کی حمایت کے لیے رائے عامہ ہموار کرنا تھا۔ ۱۷؎ یہ رسالہ علم وادب کا مرقع ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سائنسی اور معلوماتی مضامین کے اعتبار سے بھی بڑا معیاری رسالہ تھا۔ اس رسالے کی تمام تر کوششیں طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود کے لیے تھیں۔ یہ رسالہ خواتین میں فکری شعور پیدا کرنا چاہتا تھا اور ان کے علمی و ادبی ذوق کی آبیاری کر کے انہیں ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ لانا چاہتا تھا لیکن ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے اس رسالے نے اسلامی آداب اور پردے کی تمام روایتیں برقرار رکھتے ہوئے تعلیمِ نسواں پر زور دیا۔

اس رسالے میں مذہبی شخصیات اور ارکان اسلام پر بھی مضامین ہوتے تھے تاکہ خواتین کے دل میں مسلمانوں کی برگزیدہ شخصیات کی عظمت قائم ہو اور ارکانِ اسلام سے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں، نیز ان پر عمل پیرا ہو کر اسلامی تشخص برقرار رکھا جا سکے۔

خاتون اپنے سے پیشتر نکلنے والے نسوانی رسائل معلم نسواں، شریف بیبیاں، تہذیب نسواں، سفیر قیصر وغیرہ میں نہ صرف ہر اعتبار سے ممتاز تھا بلکہ بعد میں نکالے جانے والے رسالوں پر بھی فوقیت رکھتا تھا اور اپنے مقاصد میں بھی بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ ۱۹۱۵ء تک یہ رسالہ بڑی کامیابی کے ساتھ نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔

مولوی ممتاز علی نے تہذیب نسواں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے فائدے کے لیے اور

ماؤں کی تربیت کے لیے ۱۹۰۵ء میں مشیرِ مادر کے نام سے بھی ایک رسالہ نکالا۔اس رسالے کی مدیرہ بھی محمدی بیگم تھیں۔اس رسالے کے اجراء کا مقصد یہ تھا کہ بچوں کی اخلاقی، جسمانی، روحانی غرضیکہ ہر قسم کی تربیت کے حوالے سے کوئی ایسی بات نہ رہ جائے جو اس رسالے کے توسط سے ماؤں کے لیے رہنمائی کا باعث نہ بنی ہو۔بچوں کی تربیت کے حوالے سے چھوٹی یا بڑی، مکمل یا نامکمل ہر طرح کی باتیں اور ہدایتیں اس رسالے میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی اور ملک کے ہر حصے سے خواتین کو اس مقصد کے لیے لکھنے کی دعوت دی گئی۔درحقیقت خواتین کا سب سے بڑا مقصدِ زندگی تربیتِ اولاد ہی ہے اور ان معنی میں یہ رسالہ تعلیمِ نسواں کے باب میں دوسرا قدم تھا۔یہ رسالہ ایک سال تک پابندی سے نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔

آگرہ سے مسز خاموش نے مئی ۱۹۰۶ء کو پردہ نشین کے نام سے رسالہ جاری کیا۔۱۸ یہ رسالہ پردے کی حمایت اور اس کو رواج دینے کے لیے نکالا گیا تھا۔اس رسالے میں کوشش کی جاتی تھی کہ تمام مضامین خواتین ہی کے ہوں تاہم بحالتِ مجبوری مردوں کے مضامین بھی شائع کیے جاتے تھے۔یہ رسالہ خالصتاً نسوانی رسالہ تھا۔اس میں تعلیمی، معاشرتی، تاریخی، اخلاقی اور مذہبی مضامین کے علاوہ خواتین کے مکتوب اور باورچی خانے کے عنوانات بھی ہوتے تھے۔اس رسالے میں تاریخی اور معاشرتی مضامین کے ذریعے خواتین کی اصلاح و تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔''عورت'' کے مستقل عنوان کے تحت خواتین کے اخلاق و کردار کی درستی کے لیے دنیا کے نامور لوگوں کے اقوال جمع کر کے شائع کیے جاتے تھے۔جن میں لوتھر، چاسر، جان لیک، ملٹن وغیرہ شامل تھے۔لیکن ان میں حضورؐ کے اقوال سرفہرست ہوتے تھے۔رسوم باطلہ کے خاتمے کے لیے بھی اس رسالے میں مضامین شائع ہوئے۔یہ رسالہ خواتین کی تعلیم اور اصلاح و تربیت کے لیے خاصا عرصہ کام کرتا رہا۔ڈاکٹر انور سدید کے مطابق ۱۹۱۵ء تک اس رسالے کے آثارِ حیات ملتے ہیں۔جبکہ ڈاکٹر نسیم آرا کی تحقیق کی روشنی میں یہ رسالہ ۱۹۳۲ء کے بعد تک نکلتا رہا لیکن اس کے بند ہونے کی حتمی تاریخ کہیں سے پتہ نہیں چل سکی۔۱۹

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خواتین میں شعور بیدار کرنے اور ان کی ذہنی، اخلاقی،

مذہبی، سماجی، ادبی اور سیاسی تربیت کرنے میں اردو ادبی رسائل نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ان تمام رسائل کے اجرا سے اختتام تک یہ کمی کافی کھٹکتی ہے کہ ایک دو رسائل کے علاوہ یہ تمام رسائل باقاعدگی سے شائع نہیں ہوئے اور زمانے کے سرد وگرم کا شکار ہو کر بالآخر شائع ہونا بند ہو گئے۔ ان حالات میں حقیقتاً خواتین کے لیے ایک ایسے رسالے کی ضرورت تھی جو ان کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ کسی تعطل کا شکار ہوئے بغیر باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے عصمت کا اجرا عمل میں لایا گیا جو بلاشبہ ایک صدی سے زائد عرصہ تک شائع ہو کر خواتین کی خدمت میں برسرِ پیکار رہا۔

۳۔ ماہنامہ عصمت کا اجرا

ماہنامہ عصمت سے پہلے کوئی نصف درجن خواتین کے رسائل ہندستان میں شائع ہو رہے تھے۔ خالصتاً خواتین کے لیے نکالا جانے والا سب سے پہلا پرچہ اخبار النساء[۲۰] تھا جسے منشی سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ نے یکم اگست ۱۸۸۴ء کو دہلی سے جاری کیا تھا۔ یہ آٹھ صفحات پر مشتمل دس روزہ اخبار تھا جو مطبع ارمغان، دہلی میں چھپتا تھا۔ اس اخبار کے مالک آغا مرزا بیگ تھے اور اخبار کی ادارت سید احمد دہلوی کے سپرد تھی۔ دہلی سے شملہ تبادلہ ہونے کے بعد وہ وہیں سے یہ اخبار مرتب کرنے لگے۔ یہ اخبار خالصتاً عورتوں کی اصلاح و تربیت کی غرض سے جاری کیا گیا تھا اور کسی خاص طبقے یا مرتبے کی خواتین کے لیے مخصوص نہ تھا۔ اس اخبار پر یہ اعلان چھپتا تھا:

> یہ پہلا اخبار ہندستان میں عورتوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے اور طالب علموں کو[۲۱]

تعلیم نسواں میں دلچسپی کی بدولت منشی محبوب عالم مدیر پیسہ اخبار لاہور نے ۱۸۹۳ء میں ایک ماہوار رسالہ شریف بیبیاں[۲۲] جاری کیا۔ یہ رسالہ خادم التعلیم پریس لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے سرورق پر ''سورۃ النساء'' کی یہ آیت درج ہوتی تھی۔

فالصّٰلحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ

اس کے بعد رسالے کے نام کے نیچے یہ عبارت درج ہوتی تھی:

> تعلیم نسواں کا ماہوار رسالہ جس میں سعادتمند لائق بیٹی، سلیقہ شعار، نیک بخت بی

بی اور مہربان عقل مند ماں بننے کی ہدایات درج ہوتی ہیں۔[۲۳]

اس رسالے کے سرورق پر خواتین کی اہمیت کے حوالے سے ایک بہت خوبصورت عبادرت درج ہوتی تھی:

> عورت مرد کی پسلی سے بنائی گئی ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ نہ آقا بننے کے لیے بنائی گئی اور نہ غلام بننے کے لیے۔ بلکہ مرد کا جزو بدن (یعنی رفیق طریق) بننے واسطے، دنیا (معاشرت) کی گاڑی میں عورت اور مرد دو پہیئے ہیں۔ کسی ایک پہیے کے کمزور یا شکستہ ہو جانے سے گاڑی کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتی۔[۲۴]

یہ رسالہ زیادہ عرصہ چل نہ سکا اور بند ہو گیا۔ شریف بیبیاں کے بند ہونے کے بعد منشی محبوب عالم نے دوبارہ جولائی ۱۹۰۹ء میں اسی رسالے کا نام بدل کر شریف بی بی کے نام سے ماہوار رسالہ جاری کیا۔ اس کی مدیرہ فاطمہ بیگم دختر منشی محبوب عالم تھیں۔ اس رسالے کا رجسٹریشن نمبر ۷۶۹۴ ہے۔ جس کے تحت پہلے شریف بیبیاں نکلتا رہا۔ یہ ماہوار رسالہ بعد میں مستورات کے ہفتہ وار اخبار شریف بی بی کی صورت میں نکلتا رہا۔[۲۵]

یکے بعد دیگرے یہ تینوں رسائل و اخبارات نکال کر ''منشی محبوب عالم'' کم و بیش چالیس سال تک طبقۂ نسواں کے حقوق کی جنگ لڑتے رہے۔

مولوی سید ممتاز علی نے تہذیب نسواں کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو لاہور سے جاری کیا۔ محمدی بیگم اس کی مدیرہ تھیں۔ یہ رسالہ تسلسل کے ساتھ نصف صدی تک نکلتا رہا۔[۲۶] تعلیم نسواں کے سلسلے میں سب سے پہلے بلند نام شیخ عبداللہ کا ہے۔ انہوں نے تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لیے جنوری/ جولائی ۱۹۰۴ء میں خاتون رسالہ جاری کیا۔ جو مطبع احمدی علی گڑھ سے چھپتا تھا۔ مئی ۱۹۰۶ء میں مسز خاموش نے آگرہ سے پردہ نشین جاری کیا۔[۲۷] جو عزیز پریس آگرہ سے چھپتا تھا۔ ان کے علاوہ چند اور پرچے نکلتے تھے۔

جس وقت عصمت جاری ہوا جدید تعلیم بالکل ابتدائی حالت میں تھی اور اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرنے والے گھرانے بڑے بڑے شہروں میں بھی بہت کم تھے اور جو تھے ان میں بھی

زیادہ تر ایسے تھے جو اخبارات و رسائل تک خواتین کی رسائی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے اور خواتین کا کاروباری خطوط لکھنا یا رسائل و اخبارات میں لکھنا اور اپنا نام چھپوانا بہت معیوب سمجھتے تھے۔ خواتین کی تعلیم اور حقوق نسواں کے حوالے سے لکھنے والے مرد وحضرات کا بھی مذاق اڑایا جاتا۔ ایسے حالات میں جن لوگوں نے خواتین کے رسائل جاری کیے وہ حقیقی معنوں میں عورتوں کی ترقی اور اصلاح کے خواہاں تھے۔

تعلیم نسواں کی اس مخدوش حالت کے باوجود خواتین کے پرزور اصرار پر عصمت جاری کیا گیا۔ اس پرچے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اور مخزن پریس دہلی سے مخزن ہی کے معیار کا ایک زنانہ رسالہ جاری کرنے کی خواہش خواتین کی طرف سے کیوں ظاہر کی گئی؟ اس کا سبب یہ نہیں کہ دہلی میں خواتین کا کوئی رسالہ نہ تھا بلکہ اصل سبب حضرت علامہ راشد الخیریؒ (۱۸۶۸ء۔۱۹۳۶ء) کی خواتین کے ساتھ وہ ہمدردی تھی جس کا چرچا شروع ہو چکا تھا۔ اور کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ علامہ کے اسلوب کی دلآویزی، انداز بیاں کی دردانگیزی، قلعۂ معلّٰی کی بیگماتی زبان لکھنے پر عبور اور مظلوم خواتین کے حقیقی جذبات کی ترجمانی اور اس صنف کے لیے علامہ کی دلسوزی اور دردمندی کا تذکرہ تعلیم یافتہ طبقہ میں ہونے لگا۔

مخزن میں علامہ کے جو مضامین شائع ہوتے تھے ان سے پہلے خواتین کی مظلومیت کی اس قدر جامع تصویر کشی کسی اخبار یا رسالہ میں نہ کی گئی تھی۔ ان مضامین کو پڑھنے والی خواتین نے سوچا کہ دفترِ مخزن سے اگر خواتین کا ایک علیحدہ رسالہ جاری کیا جائے تو وہ خواتین کے جذبات کی ترجمانی، خیالات کی اشاعت اور خواتین کی ضروریات کو زیادہ اچھے انداز میں پیش کر سکے گا۔ شیخ عبدالقادر صاحب کی بیرسٹری کی مصروفیت تھی اور علامہ راشد الخیری سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے خود پرچہ جاری نہیں کر سکتے تھے۔ مخزن پریس کا تمام کام شیخ محمد اکرام صاحب سرانجام دے رہے تھے۔ انہوں نے بڑی جانفشانی سے عصمت کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ اور جب جون ۱۹۰۸ء میں عصمت کا پہلا شمارہ شیخ محمد اکرام کی ادارت میں شائع ہوا تو اس اہتمام سے کہ ہندوستانی پریس میں دھوم مچ گئی اور پہلا شمارہ دیکھتے ہی تعلیم یافتہ خواتین اس کی گرویدہ ہو گئیں۔

عصمت کے سرورق پر یہ عبارت درج ہوتی تھی:

شریف ہندستانی بیبیوں کے لیے اردو میں پاکیزہ خیالات، علمی اور ادبی مضامین اور مفید معلومات کا ذخیرہ ہر انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے اور ہر پرچہ ملک کے ممتاز اہلِ قلم کے مضامین کے علاوہ معزز خواتین کے طبع زاد مضامین اور مشہور مقامات اور مناظر کی تصاویر سے بھی مزین ہوتا ہے۔ [۲۸]

۱۔۳۔ مقاصدِ عصمت

عصمت کے مدیر شیخ محمد اکرام صاحب نے جولائی ۱۹۰۸ء کے شمارے میں عصمت کے حسب ذیل مقاصد بیان کیے:

حرم کی حرمت قائم رکھنا، عالمِ نسواں کی ترقی، تعلیم نسواں کی حمایت، معلومات عامہ و خاصہ، مشہور مقامات کے مختصر حالات مع تصویر دینا، علمی، ادبی، تاریخی، معاشرتی غرضیکہ مستورات کے لیے مفید اور ضروری سمجھے جانے والے تمام مضامین کا اندراج اور زنانہ لٹریچر کو وسعت دینا۔ [۲۹]

عصمت کے اجرا کے حوالے سے علامہ راشد الخیری کے ایک اشتہار سے اخذ کیے گئے مقاصد درج ذیل ہیں:

خواتین کی دینی و دنیوی فلاح و بہبود، کنواری لڑکیوں کی زندگی گزارنے کے سلسلے میں رہنمائی، ماں باپ کا ادب، بہن بھائیوں کی خدمت، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں سے محبت کی تاکید، شادی شدہ زندگی کی تیاری، بیاہتا کی حیثیت سے زندگی کی مشکلات کا سامنا، ساس نندوں کے ساتھ تعلقات، بیاہتا خواتین کی خانہ داری، گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش کے سلسلے میں رہنمائی، آمدنی کو کفایت شعاری سے خرچ کرنا اور بچوں کی ذمہ داریوں سے بہ حسن وخوبی عہدہ برآ ہونا۔ [۳۰]

عصمت کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا بھی تھا۔ اس مقصد کے لیے علامہ راشد الخیری نے نہایت ہی عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، حفظان صحت وغیرہ جیسے موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضامین عورتوں کے فرضی ناموں سے لکھے۔

تاکہ ایسے سیدھے سادھے مضامین پڑھ کر خواتین میں خود بھی لکھنے کی ہمت ہو اور علامہ اپنے اس مقصد کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

۲.۳۔ ماہنامہ عصمت کے مدیران

عصمت کے مدیران کی تفصیل یہ ہے:

شیخ محمد اکرام ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء

علامہ راشد الخیری ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۲ء

مولانا رازق الخیری ۱۹۳۲ء سے ۱۹۷۹ء

بیگم آمنہ نازلی، صائمہ خیری اور طارق الخیری فروری ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۸ تک [۳۱]

۱۔ شیخ محمد اکرام (۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۰ء)

شیخ محمد اکرام لاہور کے رہنے والے تھے اور شیخ عبدالقادر (مرحوم) کے بڑے عزیز دوست اور مخزن کی ادارت میں ان کے شریک تھے۔ ۱۹۰۷ء میں جب مخزن کا دفتر دلی آ گیا تو شیخ محمد اکرام "دفترِ مخزن" ہی میں مقیم رہے۔ ۱۹۰۹ء میں مخزن لاہور چلا گیا تو نہ صرف عصمت کی بلکہ تمدن کی ادارت میں بھی علامہ راشد الخیری کے شریک رہے۔ بہت اچھے منتظم تھے اور مخزن و عصمت کے دفتر کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے چلاتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں بیرسٹری کے لیے لندن چلے گئے۔ جنوری ۱۹۳۹ء میں خواتین کے لیے ایک رسالہ انیسِ نسواں جاری کیا۔ مئی ۱۹۴۱ء میں دلی ہی میں انتقال کیا۔[۳۲]

۲۔ علامہ راشد الخیری (۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۲ء)

علامہ راشد الخیری ۱۸۶۸ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے بعد عربی، فارسی اور دیگر مروجہ علوم اس دور کے معروف اساتذہ سے حاصل کیے۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت کر لی۔ ۱۹۱۰ء میں عصمت پر ملازمت قربان کر دی اور عصمت کی ادارت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف ہو گئے اور مرتے دم تک یہ کام جاری رکھا۔ ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔ علامہ راشد الخیری نے عورتوں کی فلاح و بہبود اور طبقۂ نسواں کے لیے متعدد ناول اور افسانے

لکھے۔ ان میں صبحِ زندگی،شامِ زندگی، شب زندگی، طوفانِ حیات، سنجوگ، سوکن کا جلاپا، ستونتی، سیدہ کا لال، نانی عشو، سمرنا کا چاند وغیرہ بہت مشہور ہیں۔[۳۳]

۳۔ مولانا رازق الخیری (۱۹۳۲ءتا۱۹۷۹ء)

مولانا رازق الخیری ایک صاحبِ طرز ادیب اور اپنے والدِ مرحوم کے صحیح جانشیں تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بعد میں کالج سے بی اے تک تعلیم مکمل کی۔ فروری ۱۹۲۳ء میں خاتونِ اکرم سے شادی ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۲۹ء میں دوسرا نکاح آمنہ نازلی صاحبہ سے ہوا۔ مولانا رازق الخیری نے ۱۹۲۳ء میں عصمت ،بنات اورجوہر نسواں کے ذریعے بے شمار اہلِ قلم پیدا کیے۔ ناشر کی حیثیت سے علامہ راشد الخیری کی کتابوں کے علاوہ ممتاز ادیبوں کی سو کے قریب کتابیں شائع کیں۔ خود بھی آٹھ،نو کتابوں کے مصنف تھے۔ ہجرت کے بعد انھوں نے ''انجمنِ ادبی رسائل'' کی بنیاد ڈالی، جو پاکستان کی پہلی ادبی انجمن تھی۔ دس سال سے زیادہ عرصے تک انہوں نے اس کی صدارت کی۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو کی ایگزیکٹو کمیٹی میں بیس سال تک ایک ماہر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ مصوّرِ غم ''علامہ راشد الخیری'' کی سوانح عمری بھی لکھی۔ ان کی مشہور کتابیں ابوجہل عکرمہ، سیدہ کی بیٹی، اور مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔[۳۴]

۴۔ آمنہ نازلی (۱۹۸۰ءتا حال)

آمنہ نازلی کا نام بحیثیت ادیبہ اور مدیرہ کے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جوہر نسواں اور عصمت جیسے معروف پرچوں کی عرصۂ دراز تک بہت احسن طریقے سے ادارت کی۔ آپ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۲۹ء میں مولانا رازق الخیری سے شادی ہوئی تو کم عمری کے ساتھ علمی استعداد بھی قابلِ ذکر نہ تھی۔ مگر علامہ راشد الخیری کی صحبت نے ان کی علمی استعداد میں تیزی سے اضافہ کیا۔ چنانچہ ان کا پہلا مضمون جون ۱۹۲۹ء میں ''باغ میں دردناک منظر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ عصمت ،جوہر نسواں، بنات کے علاوہ ساقی اور

ہمایوں جیسے معروف علمی و ادبی پرچوں میں ان کی تحریریں شائع ہوئیں۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں مولانا رازق الخیری کے انتقال کے بعد عصمت کی ادارت فروری ۱۹۸۰ء سے آمنہ نازلی نے سنبھال لی۔ ان کے ساتھ طارق الخیری اور صائمہ خیری بھی شامل ہیں۔

۵۔ صائمہ خیری

صائمہ نام اور یہی تخلص ہے۔ علامہ راشد الخیری کی پوتی، مولانا رازق الخیری کی صاحب زادی ہیں۔ آپ کی والدہ آمنہ نازلی ہیں۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان تشریف لائیں ۱۹۶۵ء میں جامعہ کراچی سے نفسیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۵ء سے باقاعدہ لکھنے لگیں۔ اصناف سخن میں نظم، غزل اور گیت وغیرہ پر طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی متوجہ ہوئیں۔ صحافت سے وابستگی ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ بڑی خوبی سے بنات کی ادارت سنبھالی۔ مولانا رازق الخیری کے انتقال کے بعد اپنی والدہ آمنہ نازلی اور بڑے بھائی طارق الخیری کے ساتھ عصمت کی ادارت سے وابستہ ہوگئیں۔[۳۵]

۶۔ طارق الخیری

طارق الخیری ۲۳ جون ۱۹۳۷ء کو پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ احباب کا دائرہ وسیع ہے۔ کم سخن، خوش لباس، صفائی پسند اور بہت نازک مزاج ہیں۔ رازق الخیری کی وفات کے بعد فروری ۱۹۸۰ء سے اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ عصمت کی ادارت سنبھالی اس سے قبل بنات کی ادارت بھی یہی کرتے تھے۔[۳۶]

۴۔ ماہنامہ عصمت کے لکھاریوں کا تعارف

بیسویں صدی کے آغاز میں قومی بیداری کی لہر نے معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ خواتین کی سماجی حیثیت میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ اس دور میں خواتین کے لیے متعدد رسائل جاری کیے گئے۔ جن کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ اور پردہ نشین خواتین میں بھی تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار باصلاحیت تخلیق کار خواتین سامنے آئیں۔ ان میں سکول کالج کی تعلیم یافتہ خواتین بہت کم تھیں۔ بیشتر خواتین نے گھروں پر ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کا مطالعہ و مشاہدہ بھی محدود تھا۔ دور

اوّل کی خواتین بڑی حد تک اپنی تحریروں میں نذیر احمد دہلوی اور علامہ راشد الخیری سے ہی متاثر نظر آتی ہیں لیکن بعد میں یہ تاثر بدل گیا اور پھر خواتین ادب کی مختلف تحریکات کے زیرِ اثر مردوں کے شانہ بشانہ لکھتی رہیں اور آگے چل کر انہوں نے ادب کے میدان میں نمایاں کارنامے سرانجام دیئے۔

عصمت کی مقبولیت کا گراف بلند ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے لکھنے والوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں کی تعداد مردانہ ادبی رسائل کے مضمون نگاروں سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ عصمت کی قدیم معروف لکھنے والی خواتین میں سے کچھ خواتین کا مختصر تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱.۴۔ ز۔خ۔ش

جواں مرگ شاعرہ اور نثر نگار زاہدہ خاتون شروانیہ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد نواب سر مزمل اللہ خان، سرسید احمد خان کی تحریک سے متاثر تھے۔ اس لیے ان کی اور ان کی بڑی بہن احمدی بیگم کی تعلیم و تربیت کا گھر میں خصوصی اہتمام کیا گیا۔ ان کو علمی اور ادبی ماحول کے ساتھ ساتھ باقاعدہ فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی۔ بہت کم عمری میں انھوں نے لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ برصغیر کے سماجی اور سیاسی مسائل کا شعور خصوصاً مسلمانوں کو درپیش مسائل کا ادراک حاصل کر لیا۔ ان کی نظموں میں شاعرانہ خوبیوں کے علاوہ مضامین کا تنوع، عصری حسیّت و مسائل سے ہم آہنگی اور نسائی شعور کا بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ ان کا تخلص ابتداء میں گُل اور بعد میں نزہت تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنی نظموں کا مجموعہ فردوس تخیل مرتب کر لیا تھا۔ ان کے گھر میں غزلیں لکھنے پر پابندی تھی۔ جو لکھیں وہ بھی تلف کر دی گئیں۔ چند غزلیں زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئیں۔ ان کی حزنیہ نظموں، روزنامچے کے اوراق اور خطوط سے ان کی دلی کیفیت اور ان صدمات کا اندازہ ہوتا ہے جن سے وہ مختصر دورِ حیات میں گزریں۔

ز۔خ۔ش کو حصولِ علم کی اجازت تو ملی لیکن اظہار کی وہ آزادی نہیں جو ان جیسی علمی و ادبی استطاعت رکھنے والی شخصیت کو ملنی چاہیے تھی۔ وہ اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھیں۔ والد کی نافرمانی کا خوف، پہچانے جانے کا ڈر، معاشرے کا ردِعمل اور تحریر سے زیادہ صاحب تحریر کی ذات میں دلچسپی لینے والے لوگوں سے تحفظ کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ اپنا نام تبدیل کرنا پڑا اور

کچھ عرصے کے لیے نہ لکھنے کا فیصلہ بھی کرنا پڑا۔ چونکہ تخلیقی اظہار کو پابند نہیں کیا جا سکتا اس لیے وہ لکھتی رہیں مگر چھپنے میں محتاط رہیں اور صرف وہی کلام و مضامین زیر طباعت آسکے جو اس وقت برصغیر کے معاشرے کے لیے قابلِ قبول تھے۔ ز۔خ۔ش کو اس بات کا مکمل احساس تھا کہ برصغیر کی خواتین پر تعلیم کے دروازے بند ہیں۔ جو ایک طرف تو خود ان سے ناانصافی ہے اور دوسری طرف قومی انحطاط کا سبب بھی۔ بہت کم عمری میں انہوں نے خواتین کی علمی وادبی بیداری کے لیے کام شروع کر دیا تھا۔ انگریزی زبان کی تعلیم کو وقت کی ضرورت سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنی خانہ زاد انجمن کا نام بھی ''ینگ شروانیز'' رکھا۔

عصمت کے دورِاول میں نظمیں اکثر و بیشتر مردوں کی تھیں۔ شاعرات میں سب سے ممتاز نام محترمہ زاہدہ خاتون شروانیہ ز۔خ۔ش کا تھا۔ محمڈن یونیورسٹی کے لیے ۲۰ ہزار چندے کی اپیل کی گئی تھی تو اس سلسلے میں زاہدہ خاتون شروانیہ نے ایک نظم لکھی جو اکتوبر ۱۹۱۲ء کے پرچے میں شائع ہوئی۔

اے فخر قوم بہنو عصمت شعار بہنو

مردوں کی ہوا زل سے تم غمگسار بہنو

یہ نظم بہت مقبول ہوئی۔ ان کی ایک اور نظم ''آنکھیں میری تجھ کو ڈھونڈتی ہیں'' ستمبر ۱۹۱۲ء میں عصمت میں شائع ہوئی۔ ز۔ح۔ش نے اس بات کا بھی گلہ کیا ہے کہ اسلام نے عورت کو جو مقام اور حقوق دیئے ہیں۔ رسم و رواج نے وہ بھی ان سے چھین لیے ہیں۔ انہوں نے مسلسل کئی نظمیں اور مضامین عورتوں کی تعلیم، ان میں فکر و تدبر اور ذہنی، سیاسی و سماجی شعور کی بیداری کی حمایت میں لکھے۔ وہ خواتین کی تعلیم، سماجی و سیاسی تحریکوں میں ان کے فعال کردار اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھاتی رہیں۔ مسلمانوں کی اپنائی ہوئی صنفی امتیاز کی تمام قبیح رسموں پر انہوں نے نظم ''تصادمِ رواج و شرع''، لکھی۔ اس کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی وہ مسلسل ان حالات اور رسومات پر نکتہ چینی کرتی رہیں جو صنفی امتیاز کا باعث تھے۔ ان کا ایک مجموعہ ان کی وفات کے بعد آئینہ حرم کے نام سے شائع ہوا۔ ان کا انتقال ستائیس برس کی عمر میں ۲ فروری ۱۹۲۲ء کو ہوا۔[۳۷]

۴.۲۔ نذر سجاد حیدر

بیگم نذر سجاد حیدر، سید نذر الباقر رضوی کی صاحب زادی تھیں۔۱۸۹۲ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئیں۔نذر زہرا بیگ، بنت نذر الباقر، مس نذر الباقر اور بعد میں نذر سجاد حیدر کے نام سے مشہور ہوئیں۔روشن خیال گھرانے کی تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔تہذیب نسواں کے مطالعے سے لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو اپنی پھوپھی اکبری بیگم کے ساتھ تہذیب نسواں میں مضامین بھیجنے شروع کیے جو بہت پسند کیے گئے۔بعد میں خواتین علی گڑھ عصمت دہلی اور شریف بی بی لاہور وغیرہ میں بھی مضامین شائع ہونے لگے۔

عصمت میں ان کی تحریریں ''بنت نذر الباقر'' کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔جون ۱۹۱۲ء میں ان کی شادی اردو کے مشہور ادیب سجاد حیدر یلدرم سے ہوئی۔بچوں کے اخبار پھول کی ادارت کے زمانے میں بچوں کے لیے ان کی لکھی جانے والی کہانیاں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے سکول کے نصاب میں شامل کی گئیں۔انہوں نے اصلاحی ناول اختر النساء بیگم ،آہِ مظلوماں، حرماں نصیب، نجمہ، جاں باز اور ثریا جیسے ناول لکھے۔نذر سجاد حیدر کا شمار ان نامور اہلِ قلم خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے نصف صدی تک مسلسل خواتین کی اصلاح و تربیت، آزادی اور حقوق کے لیے کام کیا۔ان کے ہر افسانے، مضمون یا ناول میں عورت کی بے چارگی اور مظلومیت پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ان کی صاحب زادی قراۃ العین حیدر بھی اردو کی معروف ادیبہ ہیں۔نذر سجاد حیدر کا انتقال ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں بمبئی میں ہوا۔[۳۸]

۴.۳۔ مسز محمد اکرم

اصل نام ''شمس النساء'' بیگم تھا۔شیخ محمد اکرام بیرسٹر ایٹ لا سے شادی کے بعد مسز محمد اکرام کہلانے لگیں۔شیخ محمد اکرام سر عبدالقادر کے دوستوں میں سے تھے اور مخزن کی ادارت میں ان کے شریکِ کار تھے۔جون ۱۹۰۸ء میں جب دہلی سے عصمت جاری ہوا تو اس کے مدیر شیخ محمد اکرام صاحب اور معاون مدیرہ مسز محمد اکرام مقرر ہوئیں۔مسز محمد اکرام نے عصمت کی ترتیب میں نہ صرف شیخ صاحب کا ہاتھ بٹایا بلکہ تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے عملی کوششیں کرتے ہوئے عصمت میں مضامین لکھنے کے ساتھ ساتھ انجمنیں قائم کر کے خواتین کو بھی لکھنے پر آمادہ کیا۔

جنوری ۱۹۳۹ء میں شیخ محمد اکرام نے دہلی سے انیسِ نسواں جاری کیا تو اس میں بھی معاون مدیرہ کے طور پر ان کا نام شامل ہے۔ان کی عبارت سادہ اور آسان ہوتی تھی اور ان کے تمام مضامین اصلاحی نوعیت کے ہیں۔[۳۹]

۴.۴۔ محترمہ عطیہ بیگم فیضی

محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ عرب کے ایک شاہی خاندان کی رکن اور بمبئی کی مشہور خاتون تھیں جن کی قابلیت تمام ہندستان کے مسلمانوں بالخصوص طبقۂ نسواں کے لیے مایۂ ناز تھی۔محترمہ کے والد مسٹر حسن علی فیضی استنبول کے رہنے والے تھے۔عطیہ بیگم صاحبہ ۱۸۸۶ء میں بمقام آطہ پیدا ہوئیں[۴۰] جو ایشیائے کوچک کی طرف استنبول کے قریب ہے۔کسی مدرسے یا کالج میں تعلیم نہ پانے کے باوجود انہیں انگریزی زبان پر اتنا عبور تھا گویا ان کی مادری زبان ہو۔ان کی والدہ امیر النساء بیگم کئی کتابوں کی مصنف تھیں۔عطیہ بیگم صاحبہ کو ۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید خاں نے تمغۂ شفقتِ نشاں عطا فرمایا اس موقع پر ان کی بڑی بہن ہر ہائینس بیگم صاحبہ آف جنجیرہ (جن کا مشہور سفرنامہ ء یورپ عصمت میں شائع ہوا تھا) کو بھی سلطان نے درجۂ اول کا ''شفقت نشاں'' عطا فرمایا تھا۔

عطیہ فیضی رحمین صاحبہ علم موسیقی کی ماہر تھیں اور ان کی کتاب Music of India یورپ میں بہت مشہور تھی۔ وہ ایشیا کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی (ساربونی) یونیورسٹی میں ہندستانی موسیقی پر لیکچر دیئے اور غیر معمولی شہرت حاصل کی۔امریکہ میں ان کے دوسالہ قیام کے دوران کوئی شہر اور انسٹی ٹیوشن ایسا نہ تھا جہاں ان کے لیکچر نہ ہوئے ہوں۔برلن (جرمنی) میں ان کی تقاریر کی وجہ سے سفیر افغانستان ادیب نے (جو ہر مجسٹی ملکۂ افغانستان کے بھائی تھے) انھیں ''تمغۂ امانیہ'' عطا فرمایا۔علی گڑھ جوبلی کے موقع پر انہوں نے ''انجمن معین نسواں'' کی بنیاد ڈالی جس کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد ہندستان کے ہر شہر اور قصبہ میں لڑکیوں کے مدارس قائم کرنا تھا۔عصمت کے دور اوّل میں محترمہ عطیہ فیضی اور ان کی بہن ہر ہائینس بیگم صاحبہ آف جنجیرہ اپنی گراں قدر تحریروں سے رسالے کی رونق دوبالا کرتی رہیں۔

۴.۵۔ فاطمہ بیگم منشی فاضل

فاطمہ بیگم منشی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کی صاحب زادی تھیں۔ منشی محبوب عالم اپنے زمانے کی روشن خیال شخصیتوں میں سے تھے اور طبقۂ نسواں کے سچے ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ طبقۂ نسواں کی اصلاح و تربیت کے خیال کی وجہ سے انہوں نے اپنی بیٹی فاطمہ بیگم کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ فاطمہ بیگم نے عربی و فارسی کی مروجہ تعلیم کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ منشی محبوب عالم کا جاری کردہ ماہ نامہ شریف بیبیاں (۱۸۹۳ء) جب جولائی ۱۹۰۹ء میں لاہور سے شریف بی بی کے نام سے جاری ہوا تو فاطمہ بیگم اس کی مدیرہ تھیں۔ انھوں نے اپنی زندگی خواتین کی اصلاح و تربیت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ ۱۹۰۹ء میں ''انجمن بیگمات حامیٔ اردو'' لاہور کی جنرل سیکریٹری رہیں۔ بمبئی میں وہ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر فائز رہیں۔ لاہور میں جناح کالج فار گرلز قائم کیا۔

عصمت کی معروف لکھاری تھیں۔ ان کی تمام تر کاوشیں اس مقصد کے لیے تھیں کہ خواتین کو معاشرتی اور تعلیمی میدان میں اعلیٰ مقام حاصل ہو لیکن اس طرح کہ وہ مشرقی روایات اور اقدار کا پیکر ہوں نہ یہ کہ مغرب زدہ ہوں۔ انہوں نے مسلمان خواتین کو مغربی اقدار کی تقلید کرتے دیکھا تو قلمی جہاد کرتے ہوئے ''یہ اسلامی معاشرہ نہیں''، ''غیرت کی دھجیاں''، ''محدث عورتیں''، ''سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم'' اور ''حکومت اور ہندستانی عورت'' جیسے مؤثر مضامین لکھے۔ وہ کئی قابلِ قدر کتابوں وفا کی دیوی، صبر کا پھل، لالچ کا شکار اور غیرت کی پتلی کی مصنف ہیں۔[۴۱]

۴.۶۔ محمدی بیگم

اردو صحافت کی تاریخ میں طبقۂ نسواں میں سب سے محترم نام محمدی بیگم کا ہے۔ انہوں نے اس دور میں میدانِ صحافت میں قدم رکھا جب چند خواتین کے سوا طبقۂ نسواں میں لکھنے پڑھنے کا رواج تک نہ تھا اور زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کی اجارہ داری تھی۔ محمدی بیگم سید امتیاز علی تاج کی والدہ اور مولوی سید ممتاز علی صاحب کی زوجہ تھیں۔ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئیں۔ سید احمد شفیع ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صاحب زادی تھیں۔ جنھوں نے عام ماحول کی پرواہ نہ کرتے ہوئے امور خانہ داری کے ساتھ

ساتھ اپنی بیٹی کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ سید ممتاز علی شاہ نے شادی کے سات ماہ بعد یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو ایک زنانہ اخبار تہذیب نسواں محمدی بیگم کی صدارت میں جاری کر دیا۔ جسے خواتین مدیرہ کی ادارت میں نکلنے کی وجہ سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی ادارت میں مشیر مادر جاری ہوا۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے تعلیم نسواں کی تحریک کو بہت زور وشور سے آگے بڑھایا، رسوم وعقائد اور معاشرت میں اصلاح کی کوششیں کیں۔ تہذیب وشائستگی کو فروغ دیا۔ مذہبی معلومات میں اضافہ کیا۔ امور خانہ داری اور تربیت اطفال کا سلیقہ سکھایا اور علمی ذوق پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ خواتین میں سیاسی شعور بھی بیدار کیا۔ انھوں نے تہذیب نسواں کے علاوہ عصمت دہلی اور معلم نسواں دکن میں بھی مضامین بھیجے۔ ان کی تمام کہانیاں، منظومات اور کتابیں سبق آموز ہیں اور اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد ۲۵ سے زیادہ ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ سچے موتی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔[۴۲] جس میں مناظر فطرت کی عکاسی اور جذبات نگاری بہت اچھی کی گئی ہے۔

۷.۴۔ شائستہ اختر سہروردی

برِّعظیم میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، ذہین اور اونچے خیالات کا حامی خاندان سہروردی کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا۔ شائستہ اختر بانو سہروردی بھی اسی خاندان کا چشم وچراغ تھیں۔ وہ ۱۹۱۰ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی پھوپی خجستہ سہروردی عصمت کی اولین خریدار ہونے کے ساتھ ساتھ عصمت کی اولین لکھنے والیوں میں بھی شمار ہوتی ہیں۔ شائستہ اختر بانو سہروردی کے والد ڈاکٹر سر حسان سہروردی، بحر العلوم مولانا عبید اللہ عبیدی سہروردی مرحوم کے تیسرے بیٹے تھے اور ہندستان بھر میں دوسرے مسلمان تھے جنھوں نے ایف آر سی ایس کی ڈگری لی تھی۔ اور وہ پہلے ہندستانی مسلمان تھے جو ایسٹ انڈین ریلوے میں ڈسٹرکٹ میڈیکل آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔[۴۳] بیگم شائستہ سہروردی اکرام نے اس زمانے میں انگلستان سے اردو لکھنے والی خواتین کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی جب خواتین کی تعلیم معیوب سمجھی جاتی تھی۔ ان کی شادی مشہور آئی سی ایس افسر اکرام اللہ صاحب سے ہوئی۔

بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں شائستہ اکرام اللہ عصمت سے وابستہ ہوئیں اور

اپنی زندگی کی آخری سانسوں تک اس میں لکھتی رہیں۔ ان کی اولین پہچان عصمت بنا بعد میں انہوں نے بے شمار اخبارات ورسائل میں لکھا۔ لیکن ان کا نام عصمت سے ایسا جڑا کہ عصمت اور شائستہ یک جان دو قالب نظر آتے ہیں۔ اگر چہ ان کی باضابطہ تصانیف Behind the Veil Huseyn Shaheed suhrawardy،From Purdah to Parliament A Biography انگریزی زبان میں ہیں لیکن اپنی جگہ ادبی شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔ بیگم شائستہ ایک سرکاری افسر کی شریکِ حیات ہونے کے باوجود مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہیں اور قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی رکن بنیں۔

بیگم شائستہ اکرام نے جس موضوع پر پوری دردمندی سے قلم اٹھایا وہ خواتین کے حالات اور مسائل کا موضوع ہے۔ انہوں نے خواتین کی تعلیم، ذرائع معاش تک رسائی کی آزادی، شادی، دوسری شادی، طلاق، خلع اور دیگر کئی معاشرتی مسائل کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لایا۔ متحدہ ہندوستان کی عورت ہو یا آزادی کے بعد کے حالات کا شکار پاکستانی عورت بیگم شائستہ نے اس کی زندگی کے ہر پہلو پر اظہار خیال کیا ہے اور پدرسری معاشرے پر ان کی تنقید تعمیری انداز لیے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کا لہجہ تلخ بھی ہو جاتا ہے۔ خواتین کے مسائل کے حوالے سے وہ کسی طرح کی نرمی دکھانے کی قائل نہیں تھیں اور پدرسری نظام میں پلے بڑھے مردوں کو کھری کھری سنانے میں بھی کسی رعایت سے کام لینے کی قائل نہیں تھیں۔ دنیا بھر کے دارالحکومتوں، ائرپورٹوں، سفارتی سرگرمیوں اور جدید ترین رجحانات سے مانوس ہونے کے باوجود وہ اپنی تہذیبی قدروں سے وفادار رہیں۔

۸.۴۔ حجاب امتیاز علی

حجاب امتیاز علی ۱۹۰۳ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ والدہ عباسی بیگم اپنے دور کی نامور اہلِ قلم خاتون تھیں۔ شادی سے پہلے عصمت میں حجاب اسماعیل کے نام سے لکھتی تھیں اور ۱۹۳۴ء میں سید امتیاز علی تاج سے شادی کے بعد حجاب امتیاز علی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ انھیں برِّعظیم کی پہلی ہواباز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اردو میں رومانوی اور نفسیاتی ناول نگاری کی ابتدا حجاب امتیاز علی کے ناولوں ظالم محبت (۱۹۴۰ء) اور اندھیرا خواب (۱۹۵۰ء) سے ہوتی ہے۔ ان کا موضوع محبت اور سماجی اقدار کی کشمکش ہے۔ رومانوی ادیبہ ہیں۔ معاشرتی پابندیوں اور معصوم جذبوں

کے ازلی وابدی ٹکراؤ کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ان کی کہانیوں میں رومان کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تجزیہ بھی ملتا ہے۔ان کی افسانوی دنیا حقیقت سے بہت بعید ہے۔عصمت کے اولین لکھاریوں میں شمار ہوتی تھیں۔[۴۴] رسالہ پھول کے لکھنے والوں میں حجاب امتیاز علی کا نام بھی شامل ہے۔

۴.۹۔ صغریٰ ہمایوں مرزا

صغریٰ بیگم نام اور حیاؔ تخلص تھا۔ڈاکٹر صفدر علی مرزا سرجن افواجِ حیدرآباد کی صاحبزادی تھیں۔جوتر کی النسل تھے۔۱۸۸۴ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔عصمت کے دوراول کی مشہور لکھاری تھیں۔۱۹۰۲ء میں لیڈی واکر کے ساتھ مل کر''زنانہ سوشل ایسوسی ایشن'' کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۱۲ء میں''انجمن خواتین اسلام دکن'' کی بنیاد رکھی۔اس انجمن کے تحت کئی زنانہ مدرسے قائم کیے۔ مختلف کانفرنسوں میں شرکت کر کے خواتین کی اصلاح و بہبود کے ناقابلِ فراموش کارنامے سرانجام دیے۔

صغریٰ ہمایوں مرزا نے اپنے اصلاحی کاموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مضامین لکھنے کی طرف خصوصی توجہ دی۔شعروسخن سے دلچسپی کے باعث غزلیں،سلام اور نوحے لکھا کرتی تھیں۔ان کے کلام کا مجموعہ انوار پریشاں کے نام سے شائع ہوا۔وہ خواتین کے معاشرتی مسائل پر بے لاگ اظہارِ خیال کرتیں،انھیں مشورے دیتیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے ان کے مسائل کا سدِ باب کرتیں۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی ادارت میں النساء جاری ہوا اور کچھ عرصہ تعطل کے بعد ۱۹۳۴ء میں زیب النساء کے نام سے یہ رسالہ ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ ۱۹۵۸ء تک یہ اس رسالے کی مدیر رہیں۔[۴۵]

مندرجہ بالا خواتین کے علاوہ عصمت کی قدیم معروف لکھنے والیوں میں محترمات حامدہ بیگم الخیری،سلطان بیگم کے علاوہ محترمات نوشابہ خاتون قریشی بی اے،امۃ الوحی،رفیعہ کرمانی،بلقیس بیگم،مسز برلاس (اشرف جہاں بیگم دہلوی) خدیجہ بائی،خورشید آرا بیگم منشی فاضل،نواب قمر جہاں بیگم ،ظفر جہاں بیگم،تہذیب فاطمہ عباسی،جمیلہ بیگم،ابو فاطمہ انور علی،فاطمہ بیگم منشی لکھیم پور،نور جہاں بیگم ناز،بغدادی بیگم،جہاں بانو بیگم نقوی بی اے،علیا ظفر،کنیز محمد بیگم منشی فاضل،شہر بانو،مہر النساء،فاطمہ خیری برلنی،عائشہ بیگم،مسز غلام رسول،مسز فضلی،مسز امۃ الزمان،عطیہ نصرت خانم،انیس فاطمہ بنت

یموق، بیگم کپتان نصیرالدین احمد، خورشید اقبال حیا، سلطانہ آصف ہر ہائینس نواب فاطمہ، صدیقہ والیہ مانا دور، ممتاز رفیع، امتہ الحفیظ، ایس بی طاہرہ، ایس کے صغرا سبزواریہ، بلقیس جمال، رابعہ پنہاں، مرحومہ حمیدہ خانم ایم اے، وزیر فاطمہ، تہذیب النسا بی اے، مریم یوسف علی بی اے، سکینہ چراغ الدین بی اے، رحمت النساء بیگم بی اے کے نام بہت ممتاز ہیں۔ ان خواتین کے زیادہ تر مضامین عصمت میں بہت پسندیدگی سے دیکھے گئے۔ ان کے مضامین کو بہت سے قابل مرد حضرات نے بھی سراہا۔ ان خواتین کے بہت سے مضامین اپنے اپنے موضوع پر بہترین تھے اس لیے خاتون اکرم عصمتی انعامات کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ اس کے علاوہ ان میں سے کچھ خواتین کے کسی کسی سال سب سے زیادہ مضامین شائع ہوئے۔ مندرجہ بالا خواتین کے علاوہ بھی عصمت کے توسط سے بہت سی خواتین مصنفات سامنے آئیں۔ ان میں محترمات صالحہ خاتون پانی پتی، جلیلہ خاتون بدایونی، بیگم اصغر حسین لکھنوی، ب۔ن ابراہیم، امِّ عاصمہ گلبرگہ، حمیدہ نظیر، لطف النساء بیگم، مسز حمید، شرافت بیگم، گ۔ن۔ کپورتھلہ، نزہت افضل، سرور جہاں، رعنا بی اے، حفیظ جمال، بشیر النسا بیگم بشیر، افضل النساء بیگم جوہی، بیگم یار محمد بیگ، بیگم حفاظت علی، رضیہ دلشاد ایم اے، اختر خانم، سلیمہ مرتضٰی بی اے۔ آر بی، بیگم ظہیر الدین دہلوی، شہر آرا بیگم، قیصرہ بیگم کلکتہ، معتصمۃ الرحمٰن، منظور مبارک علی، نشاط افزا، عالم آرا بیگم، رقیہ بیگم، راجکماری جھینکن، کرشن کماری، مسز عجیب دہلی، مسز گرداج بہاری ماتھر، کستوری دیوی، عابدہ بیگم رعنا، ادریس بیگم، شمسہ شمع، نعیمہ بیگم، ص بیگم قریشی، ص نقی الحسن تسنیم، فردوس، رضیہ ناصرہ، سلطان بیگم، ک۔خاتون، مرحومہ حلیمہ خاتون، عطیہ سعید، اسماء سعید آر کے، کنیز فاطمہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان خواتین میں سے بعض نے شادی ہوجانے کے بعد، کچھ نے خرابیِ صحت اور کچھ نے گھریلو مصروفیات کی وجہ سے لکھنا چھوڑ دیا لیکن کثرت ان خواتین کی رہی جنھوں نے عورتوں کی اصلاح اور ترقی کے لیے مضامین لکھنے شروع کیے تو باوجود دنیاوی مصروفیات کے موقع پاکر عصمت کے لیے کچھ نہ کچھ لکھتی رہیں۔[۴۶]

عصمت میں خواتین ہی نہیں لکھتی رہیں بلکہ وہ مرد حضرات بھی لکھتے رہے جو خواتین کی اصلاح و ترقی کے خواہاں تھے اور خواتین کی دلچسپی اور مطلب کے مضامین لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ ان میں پروفیسر ستار خیری ایم اے، کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب، مولوی محمد ظفر صاحب ایم

اے، لالہ تلوک چند محروم بی اے، مولوی سید راحت حسین صاحب بی اے، ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی، مولوی عبدالغفار صاحب الخیری، منشی پریم چند صاحب بی اے، مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے، پروفیسر سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے، افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی، مولانا محوی صدیقی، ڈاکٹر اعظم کریوی، اور حضرت عشرت لکھنوی وہ اصحابِ قلم حضرات ہیں جن کے مضامین حاصل کرنے کے اردو رسائل انتہائی کوشش کرتے رہتے۔ ان حضرات کو مسائل نسواں سے بہت دلچسپی تھی اور اپنے اپنے انداز میں بہت اعلیٰ انداز میں انہوں نے مسائل نسواں پر قلم اٹھایا اور عصمت کو ذریعہ بنا کر ہندُستانی خواتین کی فلاح و بہبود میں اپنا کردار نبھایا۔

ان حضرات کے علاوہ افسوس حضرت عزیز لکھنوی، حضرت خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی، مولانا عبدالحلیم شررؔ، منشی عبدالخالق خلیق دہلوی، میر باقر علی داستان گو، مولوی نصیرالدین ہاشمی، مسٹر ضیاء الدین احمد برنی بی اے، مولانا اسعد الاشرفی عرشی دہلوی، مولوی عبدالغفور خان صاحب، حضرت امام اکبر آبادی، جے آر رائے صاحب، پرفیسر طاہر رضوی، حضرت محمود اسرائیلی، مرزا اعظیم بیگ صاحب چغتائی، پروفیسر طاہر جمیل، مرزا عثمان اشرف گورگانی، قاری محمد عباس حسین صاحب دہلوی اور سید ابو تمیم صاحب فرید آبادی جیسے مشہور اہلِ قلم حضرات کے مضامین بھی عصمت کے صفحات کی زینت بنتے رہے۔ ان کے علاوہ کچھ اور حضرات بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے خواتین کے رسالوں میں سب سے پہلے عصمت سے لکھنا شروع کیا۔ اور پھر ان کا شمار کامیاب لکھنے والوں میں ہونے لگا۔ مثلاً صاحبزادہ ولی احمد خاں صاحب ایم اے، مولوی عبدالرحمٰن صاحب کاکوروی بی اے، سید رضا احمد صاحب جعفری، مولوی عشرت صاحب جمالی، تقی علی صاحب یاسی، سید مغنی الدین صاحب شمسی ایم اے، مسٹر مفتاح الدین ظفر بی ایس سی، سید ابو طاہر صاحب داؤد بی ایس سی، ڈاکٹر ممتاز حسین صاحب مولوی اقبال احمد صاحب وغیرہ۔

۵۔ نمایاں موضوعات ورجحانات

نسوانی صحافت کو فروغ دینے، خواتین کی اصلاح وتربیت کرنے اور ان میں علمی وادبی ذوق پیدا کرنے میں عصمت نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس ماہنامے نے تمام اصناف سخن میں خواتین اہلِ علم کی اتنی بڑی تعداد سامنے لائی جسے کسی بھی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک صدی سے زائد

عرصے پر محیط خدمات کی بدولت ماہنامہ عصمت کا نسوانی رسائل و اخبارات تو کیا مردانہ رسائل میں بھی کوئی مدِّ مقابل نظر نہیں آتا۔

علمی و ادبی رسائل کے مدیران پرچہ مرتب کرتے ہوئے علمی و ادبی معیار کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لیکن خواتین کے لیے شائع کیے جانے والے رسائل ادبی معیار کے لحاظ سے خواہ کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں ان کو مرتب کرتے وقت خواتین کی ضروریات اور دلچسپیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ اسی لیے خواتین کے رسائل کا نصف سے زائد حصہ اگر چہ مردوں کے لیے کسی کشش اور جاذبیت کا حامل نہیں ہوتا مگر خواتین کے لیے وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عصمت نے زندگی کے تمام شعبہ جات کو احاطۂ تحریر میں لایا اور طبقۂ نسواں کی خدمت بجالانے میں پیش پیش رہا۔ تاریخی معاشرتی، سائنسی، تنقیدی و تعلیمی، سیر و سیاحت اور امور خانہ داری غرض یہ کہ طبقۂ نسواں کے لیے ہر لحاظ سے مفید اور کارآمد ثابت ہونے والے ہر قسم کے مضامین عصمت میں شامل کیے گئے۔

موضوعات کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ابتدا میں خواتین کو لکھنے کے لیے آمادہ کرنا اولین ترجیح تھی۔ اس لیے ان کی ضروریات اور دلچسپیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے متعلقہ مضامین عصمت کی زینت بنائے گئے۔ خواتین میں چاہے دنیا بھر کی خوبیاں جمع ہو جائیں لیکن اگر وہ سگھڑ، سلیقہ شعار اور ہنرمند نہیں تو ان کی باقی ساری خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ہر زمانے اور ہر قوم میں مرد کے مقابلے میں عورت کا گھر سے خاص تعلق رہا ہے۔ وہی گھر چلاتی ہے۔ اخراجات کے مقابلے میں آمدنی کم ہونے کی صورت میں خود نوکری کر کے بھی گھر چلانے کی ذمہ دار وہی ٹھہرتی ہے۔ اس لیے خواتین کو خانہ داری کے ہنر سے واقف کرانے کے لیے ''امور خانہ داری'' کا عنوان عصمت کا ایک مستقل حصہ بن گیا۔ خانہ داری کا بجٹ کیسے بنایا جاتا ہے؟ فضول خرچی بالآخر کیا رنگ لاتی ہے؟ کفایت شعاری کا کیا مطلب ہے؟ روپیہ بچانے کے کیا کیا طریقے ہیں؟ بچوں کی نظر میں روپے کی قدر و قیمت کس طرح ہوسکتی ہے؟ خرید و فروخت کے کیا اصول ہیں؟ غیر ملکوں اور دوسری قوموں میں خانہ داری کی کیا اہمیت ہے؟ گھر کے انتظام میں کیا کیا غلطیاں ہوسکتی ہیں؟ پانی کے انتظام پر خاص توجہ دینے کی کیوں ضرورت ہے؟ گھر بدلنے کی صورت میں چیزوں کی حفاظت اور پیکنگ کیسے کی جاتی

چاہیے؟ غرض خانہ داری کے حوالے سے اس طرح کے بیسیوں امور ہیں جن سے خواتین کو بخوبی آگاہ ہونا چاہیے۔

تربیتِ اطفال اور امور خانہ داری کے حوالے سے جو موضوعات عصمت کے صفحات کی زینت بنے ان میں سے کچھ حسبِ ذیل ہیں: ''مہذب گھر'' (بنت نذر الباقر صاحبہ) ''بہنوں کو نصیحت'' (اے ایف از بکسر کھیڑا ضلع میرٹھ) ''بچوں کے اخلاق کی درستگی'' (ن۔ ا۔ بیگم صاحبہ) ''عورتوں کے من گھڑت مسئلے'' (مولوی سید احمد صاحب دہلوی) ''بیماری اور تیمارداری'' (مسز خدیو جنگ بہادر از حیدرآباد دکن) ''ننھوں کی نگہداشت'' (فیروزہ سراج الدین صاحبہ) ''حفظِ صحت'' (زہرہ فیضی صاحبہ از بمبئی) ''بیوی کی تعریف'' (ایڈیٹر) ''بچوں کا رکھ رکھاؤ'' (مولوی سید احمد صاحب از دہلی) ''پان کھانا'' (ہر ہائینس نواب بیگم آف سچین) ''خانہ داری کے سنہری اصول'' (ترجمہ) ''کام کی باتیں'' (ترجمہ) ''چینی عورت اور اس کا طرز معاشرت'' (سید مناظر حسن صاحب بہاری) ''بیگم'' (مسز شیخ علی صاحبہ) ''بچوں کی پرورش'' (رابعہ سلطان بیگم صاحبہ) ''بیوقوف بیوی' (مسز راشد صاحبہ از دہلی) ''بچوں کا علاج'' (حکیم ناصر نذیر صاحب) ''کفایت شعاری'' (ر۔ صاحبہ رضوی) ''تعلیم و تربیت'' (مسز ریاض صاحبہ) ''نمائش و دستکاری'' (آبرو بیگم صاحبہ) ''صفائی و سلیقہ' (محمد عبدالرحیم صاحب) ''خانہ داری'' (نصیرہ شمس صاحبہ) ''گھر کی صفائی'' (لطیف صاحبہ) ''انتظام خانہ داری'' (جہاں آرا بیگم) ''ماں کا اثر بچہ کی صورت اور سیرت پر'' (آزاد دہلوی) ''بچوں کے مرض کا دورہ اور علاج'' (ا۔ب۔م) ''بیوی'' (ع۔ر۔ صاحبہ) ''بچوں کو زیور پہنانا'' (محمد حبیب الدین صاحب ناظر) ''بچوں میں مذہبیت'' (مہر النسا صاحبہ) ''حفظان صحت کے اصول'' (کلثوم سعید خانم صاحبہ) ''بچوں کے لیے موزہ'' (لطیف بیگم صاحبہ) ''تربیت اطفال'' (مولوی عبدالغفار صاحب الخیری) ''بچوں کی موت'' (مولوی راحت حسین بی اے) ''بچوں میں سگریٹ کا رواج'' (نصیرہ شمس صاحبہ) ''پرورشِ اطفال'' (مولوی عبدالغفار صاحب الخیری) ''خانہ داری کا بجٹ'' (بلقیس جہاں بیگم صاحبہ) ''غذا'' (سید خورشید علی صاحب حیدرآباد دکن) ''خانہ داری اور تربیت'' (منشی نور احمد صاحب وکیل) ''ہیضہ کی احتیاط اور علاج'' (اہلیہ حکیم عابد علی خان صاحبہ) ''پٹاری یا پاندان'' (بلقیس جہاں بیگم صاحبہ) ''بچوں کی صحت'' (سید محمد ابراہیم صاحب انجم) ''عورت کا سلیقہ'' (سید ضمیر الحسن صاحب)

وغیرہ۔

خوبصورت نظر آنا ہر انسان کا حق بھی ہے اور خواہش بھی اور خواتین میں تو یہ خواہش سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ کشش کا جو مادہ قدرت نے ہر عورت کو ودیعت کیا ہے اس میں اضافہ کی کوشش ہر عورت کا جائز حق ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک جسم کے ہر حصہ کو خوبصورت و خوشنما بنانے کی خواہش فطری ہے لیکن سنگھار اور آرائش کے صحیح طریقوں سے سب واقف نہیں۔ اس لیے عصمت میں سنگھار و آرائش اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے حوالے سے بھی بہت سے موضوعات کے تحت خواتین کی رہنمائی کی گئی۔ ''بال بنانا'' (فاطمہ محمد حسین صاحب) ''لباس'' (امیر النساء ہمشیرہ غلام دستگیر) ''پھنسیوں کی دیکھ بھال'' (د۔ا صاحبہ) ''بیماریاں اور ان کا علاج'' (کلثوم سعید خانم صاحبہ) ''تندرستی کے دوست'' (مولانا ستار خیری ایم اے از برلن) ''ٹھنڈے پانی کا استعمال'' (گ۔ن صاحبہ) ''چند تجربے'' (مسز حمید صاحب) ''گلہائے مخملی اور سلمہ کی ضرورت'' (سنجیدہ اشرف صاحبہ) ''گھریلو علاج'' (مس شریف الحسن صاحبہ) ''گرمیوں میں حسن کی حفاظت'' (امۃ الحفیظ صاحبہ) ''خوبصورت لیس'' (نذیر بیگم صاحبہ) ''نیند اور صحت'' (جمیلہ بیگم صاحبہ) ''دانتوں کی صفائی'' (امۃ الحفیظ صاحبہ) ''دانت بیسیوں بیماریوں کی جڑ'' (فاطمہ ستار خیری از برلن) ''موٹاپے کے اسباب اور علاج'' (ڈاکٹر ممتاز حسین صاحب) ''مسکراہٹ'' (ایس بی طاہرہ صاحبہ) ''صحت کس طرح قائم رہ سکتی ہے'' (بنت بلدیو پرشاد صاحب) ''صورت بگاڑنے والی باتیں'' (خواجہ لطیف احمد صاحب بی اے) ''صحت اور غسل'' (مسز ابو منصور صاحب) ''عورتوں کی ورزش'' (مسز عبدالصمد صاحب) ''رنگ اور صحت قائم رکھنے کی تدبیر'' (ترجمہ) ''نیند'' (بیگم صاحبہ یعقوب علی خان) ''غذا'' (سید خورشید علی صاحب از حیدرآباد دکن) ''ماں بننے والی لڑکی کی احتیاطیں'' (ترجمہ) وغیرہ اور اس طرح کے بیسیوں مضامین میں آرائشِ حسن و جمال کے حوالے سے خواتین کی رہنمائی و معاونت کی گئی۔ [۴۷]

چونکہ عصمت کی اشاعت کا بنیادی مقصد بیداریِ نسواں اور تعلیم نسواں کا فروغ تھا اس لیے خواتین میں تعلیمی شعور اجاگر کرنے کے لیے لاتعداد مضامین لکھے گئے۔ اس وقت اس معاشرے میں جہالت اور کم علمی عام تھی۔ خواتین کی تعلیم کا کوئی تصور نہ تھا۔ صرف قرآن پاک ناظرہ پڑھ لینا ہی ان کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ عام دنیوی تعلیم ان کے لیے شجرِ ممنوعہ تھی جسکے حصول سے ان کے بگڑنے

کا خدشہ تھا۔ اس غلط فہمی کے ازالے اور خواتین کے لیے حصول تعلیم کو ممکن بنانے کے لیے درج ذیل مضامین عصمت کی زینت بنائے گئے۔ ''مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم'' (سہروردی بیگم صاحبہ از کلکتہ) ''مذہب اور عورتوں کی تعلیم'' (ذکیہ صاحب ہمشیرہ مولوی حکیم عبدالحیٔ صاحب) ''اسلامی خواتین'' (حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خان صاحب) ''تعلیم کے فوائد'' (نظم) (سید عنایت حسین صاحب امداد عظیم آبادی) ''علمِ اخلاق'' (سروری بیگم از دہلی) ''تہذیب کی ترقی اور اکثر مضامین'' (سلطان بیگم صاحبہ) ''چینی عورت اور اس کا طرز معاشرت'' (سید مناظر حسن صاحب بہاری) ''ہندستان میں لڑکیوں کی حالت'' (مسز ڈپٹی لال صاحب) ''عیسائی استانیاں'' (ج۔ صاحبہ) ''ہماری بڑی ضرورت'' (ہمشیرہ احمد عبداللہ صاحب) ''ہمارے لیے علم کی ضرورت (م ن) تعلیم'' (نظم) (راقمہ الف خاتون) ''جاہل ماں اور تعلیم یافتہ بیٹی'' (والدہ اقبال میاں صاحب) ''ہندستان اور تعلیم نسواں'' (آر۔ کے بابو صاحب مضمر) ''تعلیمِ نسواں'' (سیدہ اصغری بیگم) ''تعلیم نسواں پر ایک مختصر نوٹ'' (سیدہ وحید النساء بیگم صاحبہ) ''جاپان میں زنانہ تعلیم'' (یٰسین حسن صاحب) ''لڑکیوں کو سکول میں تعلیم دینے پر ایک نظر'' (ز۔ خاتون) ''نسوانی نصاب تعلیم'' (کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب) ''عورت کی پیدائش کا مقصد'' (پروفیسر ستار خیری) ''تقدیرِ حقوقِ نسواں'' (صغرا ہمایوں مرزا) ''مسلم عورتوں کے فرائض'' (از مسٹر سید عبداللہ بریلوی) ''عورت کی ذہنی ترقی'' (محمود الحسن صدیقی) ''عورت کے حقوق کم نہیں'' (ظفر جہاں بیگم صاحبہ) ''انگلستان کی عورتیں'' (مولوی نصیرالدین ہاشمی) ''انسانی زندگی کتابوں کی روشنی میں'' (حنا مرحومہ) ''کیا انگریزی تعلیم ضروری ہے'' (سید احمد صاحب رضوی) ''ہندستانی عورتوں کے حقوق'' (شہر بانو صاحبہ) ''ہندستانی عورت اور آزادی'' (رفیع الزماں خاں صاحب بی اے) ''قدامت و جدّت پسندی کا پیمانہ'' (زبیدہ زریں صاحبہ) ''چین کی لڑکیاں'' (جمیلہ بیگم صاحبہ) ''خوداعتمادی اور ذمہ دارانہ زندگی کی ضرورت'' (جمیلہ بیگم صاحبہ) ''ترکی عورتوں کی اقتصادی آزادی'' (اسماء سعید صاحبہ) ''تعلیم نسواں کا مقصد'' (سید احمد صاحب رضوی) ''مذہبی تعلیم'' (جمیلہ بیگم صاحبہ) ''چین کی عورتیں'' (بدرالنساء صاحبہ ہاشمی) ''کتابوں کا انتخاب'' (مسز یوسف الزماں صاحبہ) ''کتب بینی'' (ز۔ ب۔ ن صاحبہ) ''اسلام میں عورت کا رتبہ'' (صاحبزادہ ولی امجد خاں صاحب) ''تعلیم اور آزادی'' (جمیلہ بیگم صاحبہ) ''حقوق نسواں''

(ر۔س۔ صاحبہ) ''رامائن اور عورت'' (راجکماری جھینکن صاحبہ) ''تعلیم یافتہ اور جاہل بیبیاں'' (ہمشیرہ عبدالرؤف صاحب عباسی) ''مسلمانوں کی علم پروری'' (لئیقہ بیگم صاحبہ) ''تحریک نسواں'' (مہرمحمد خان صاحب شہاب) ''تعلیم نسواں کا مذہبی رخ'' (حضرت امام اکبرآبادی) ''مسلم خواتین کا نصب العین'' (علامہ عبداللہ یوسف علی) ''ہماری تعلیم کا مقصد'' (جمیلہ بیگم صاحبہ) ''تعلیم جدید کا اثر لڑکیوں پر'' (مستبشرہ صاحبہ) ''حکیم عورتوں کی ضرورت'' (اے ۔جے طیبہ صاحبہ) ''حقوقِ نسواں کی موجودہ کشمکش'' (شہربانو) وغیرہ

سیر وسیاحت کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو خواتین کسی طور مردوں سے پیچھے نہیں رہیں۔انہوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کے احوال نہایت خوبصورت انداز میں قلم بند کیے ہیں۔ مقاماتِ مقدسہ، یورپ، آسٹریلیا، اور امریکہ کے سفر ناموں کے علاوہ محترمہ صغریٰ ہمایوں مرزا کے سیاحت نامے اور محترمات بیگم برلاس، بیگم فضلی، ڈاکٹر شائستہ سہروردی اور روح افزا حیدر کے مختلف ممالک کی سیاحت پر مبنی مضامین سے خواتین کی معلومات میں بہت اضافہ ہوا۔محترمہ مسز یلیین علی خاں حیدرآباد دکن کا ''سفر نامۂ آسٹریلیا'' دوڈھائی سال رسالہ عصمت میں شائع ہوتا رہا اور آسٹریلیا کے متعلق لکھا جانے والا یہ پہلا سفرنامہ ہے جس میں آسٹریلیا کے آثار قدیمہ اور قابلِ دید مقامات کا حال بیان کیا گیا ہے۔اس کے ساتھ براعظم آسٹریلیا کے رہنے والوں کے معاشرتی، اخلاقی، تجارتی اور تعلیمی حالات بھی ہلکے پھلکے طنز اور ظرافت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔محترمہ ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی کینیڈا میں اپنے ڈیڑھ دوسال کے قیام کے دوران متواتر وہاں کے حالات سے آگاہ کرتی رہیں۔اسی طرح محترمہ مسز برلاس (اشرف جہاں بیگم) مصنفہ فغانِ اشرف کئی سال جاپان میں قیام پذیر رہیں اور جاپان کی معاشرت سے متعلق انہوں نے بہت کچھ لکھ کر خواتین کی معلومات میں اضافہ کیا۔سیر وسیاحت کے حوالے سے لکھے جانے والے کچھ اہم مضامین درج ذیل ہیں: ''یورپ کی گھریلو زندگی'' (مسز حمید صاحب) ''لندن پر جنگ کے بادل'' (شائستہ اختر سہروردیہ صاحبہ) ''برما کی عورتیں'' (شہر بانو صاحبہ) ''جاپانی بچوں کی تربیت'' (مسز برلاس صاحبہ) ''سفر نامۂ ایران'' (صغریٰ سبزواریہ صاحبہ) ''صدر جمہوریہ امریکہ کی بیوی'' (بیگم علی اوسط صاحب) ''ترکی خواتین کی معاشرت'' (اسما محمد سعید صاحب) ''جاپان جدید کی خواتین'' (ملک سلمان الارشد صاحب فاروقی)

''تبت میں شادی کی رسمیں'' (شہر بانو صاحبہ) ''سیر و سیاحت'' (سید ابن حسن صاحب) ''جاپانی زچہ خانہ'' (مسز برلاس صاحبہ) ''مسولینی کی بیوی'' (فاطمہ انور علی بیگم صاحبہ) ''آگرہ کی ہوائی رصدگاہ'' (مسز لطافت اللہ خاں صاحب) ''برما میں شادی کا طریقہ'' (ج۔ا۔ ابو صاحبہ) ''ترکی خواتین کی ترقی'' (حضرت امام اکبر آبادی) ''سویڈن ناروے کے امور خانہ داری'' (بیگم محمد یامین صاحب قریشی) ''جرمنی میں ماؤں کی درسگاہ'' (صفیہ بی صاحبہ) ''چینی عورتوں کے معاشرتی حقوق'' (ب۔ ن۔ ابراہیم صاحبہ) ''جزیرہ نما بلقان'' (زبیدہ زریں صاحبہ) ''لندن میں تعلیم جاری رکھنے کے ذرائع'' (شائستہ اختر سہروردی) ''سیر یورپ'' (ہر ہائی نس بیگم صاحبہ جزیرۂ حبشاں) وغیرہ۔

مذہب سے لگاؤ مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ بھلے ان کی مذہبی معلومات مردوں کے مقابلے میں کم ہوں لیکن مذہبی رسومات کی ادائیگی اور عقائد کی پختگی میں وہ مردوں سے آگے ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود اردو کے مذہبی لٹریچر میں خواتین نے کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا۔ البتہ انہوں نے بعض مذہبی مباحث میں حصہ ضرور لیا ہے مگر وہ بھی آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس سلسلے میں ''دلہنوں کی نماز'' (بلقیس زمانی بیگم) ''اللہ اکبر'' (سردار محمدی بیگم صاحبہ) ''کیا مسلمانوں کے تنزل کا سبب اسلام ہے'' (شہر بانو صاحبہ) ''قرآن مجید اور مسلمان'' (ب۔ن ابراہیم صاحبہ) ''سب سے بڑی نیکی'' (افضل النساء صاحبہ) ''مسلمان عورت'' (سعیدہ ضمیر الدین صاحبہ) ''زینب خاتون'' (صالحہ خاتون صاحبہ) ''معاشرت صحابیات'' (ا۔ف بیگم صاحبہ) ''مسلمان اور کانگرس'' (ر۔س صاحبہ) ''خدمت الناس'' (زبیدہ زرین صاحبہ) ''زکوٰۃ و خیرات'' (ہمشیرہ اشرف حسین صاحبہ) ''پردہ کا نہیں جہالت کا کرشمہ'' (سردار محمدی بیگم صاحبہ) ''قرآن مجید کی تلاوت'' (ا۔م صاحبہ) ''والدین کے فرائض'' (کنیز محمد بیگم صاحبہ منشی فاضل) ''لڑکیوں کا پردہ'' (ا۔ر۔خ۔ صاحبہ) ''آداب معاشرت'' (سرور جہاں صاحبہ) ''گنڈے تعویز'' (بنت چودھر مبارک علی صاحبہ) ''پردہ'' (ف۔ر) ''نماز کی خوبیاں'' (محمد فاطمہ صاحبہ) ''مدینہ کی حور اور جنت کا دولہا'' (نظام المشائخ) ''نماز گرہن'' (فاطمۃ النساء صاحبہ) ''عالمِ ارواح کا جلسہ'' (صغریٰ ہمایوں مرزا صاحب) ''ایک بے بنیاد الزام'' (از محترمہ عطیہ نصرت خانم) ''پردہ پر میرا خیال'' (صغریٰ ہمایوں مرزا صاحبہ) ''مذہبی تعلیم'' (جمیلہ بیگم صاحبہ) ''شرعی پردہ'' (ہمشیرہ ڈاکٹر احمد الدین صاحب) ''رسول اللہؐ کی تشریف آوری''

(مہرالنساء صاحبہ)''پابندیِ نماز'' (فاطمہ بیگم صاحبہ)''سفر نامۂ حج'' (حامدہ بیگم صاحبہ خیری)''مدینہ الزہرہ'' (مہرالنساء بیگم)''پردہ کی ابتداء'' (مسز ایس ایم وصی صاحبہ)''ترجمہ قرآن شریف'' (مسز خدیو جنگ صاحبہ)''محرم اور پردہ'' (ریحان فاطمہ بیگم صاحبہ)''غیر اللہ سے دعا مانگنا'' (فاطمہ بیگم منشی فاضل صاحبہ)''عورتوں کی جماعت'' (مس فاطمہ محمد حسین صاحبہ)''دینی تعلیم'' (مس زاہدہ فضل الکریم صاحبہ)''پردہ وحیا ضروری چیز ہے'' (مسز ابوالخیر محمد اشرف صاحب)''اسلام کا پردہ'' (ہمشیرہ مقبول احمد صاحب)''اسلامی نماز کیا ہے'' (اختر کلاں مہر تلاوت علی خاں صاحب)''پردہ کے مخالفین سے دو دو باتیں'' (سیدہ سروری بیگم صاحبہ)''پردہ'' (ہمشیرہ احمد عبداللہ صاحب)''عشاء کی نماز'' (جناب زاہدہ بیگم صاحبہ) وغیرہ جیسے مضامین اہم ہیں۔

تمدنی اور معاشرتی مسائل پر بھی خواتین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ تمدن کی خرابیاں دور کرنے اور معاشرتی اصلاح کی غرض سے لکھے جانے والے مضامین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ ہمارے تمدن اور معاشرت کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا جس پر اہلِ قلم خواتین نے بحث نہ کی ہو۔ اور ایک ایک پہلو پر مختلف زاویوں سے روشنی نہ ڈالی ہو۔ صرف شادی ہی کا مسئلہ دیکھیں تو لاتعداد مضامین اس حوالے سے عصمت کی زینت بنتے نظر آتے ہیں۔ شادی سے پہلے کے مدارج، شادی کے بعد الگ اور ایک ساتھ رہنے کے فوائد ونقصانات، ازدواجی زندگی کی بہت سی گتھیاں اور تلخیاں اس طرح کے مضامین میں سلجھائی اور دور کی گئیں اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اس نوع کا جو ادب خواتین نے پیش کیا وہ نہ صرف دلچسپی کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے بلکہ خواتین کی اصلاح کے حوالے سے بھی قابلِ ستائش ہے۔ خواتین کے لیے لکھے جانے والے ادب میں صرف خواتین کے حقوق کی حفاظت اور حمایت ہی نہیں بلکہ ان کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں سے بھی انہیں آگاہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں لکھے جانے والے اہم مضامین حسبِ ذیل ہیں: ''جانثار بیوی'' (زہرہ سلطانہ صاحبہ)''جنتی بیوی'' (علامہ راشد الخیری)''پابندیِ رواج اور مرد کا ظلم'' (صغریٰ ہمایوں مرزا صاحبہ) ''ایک وفادار بیوی کی روح'' (مولوی احمد اللہ صاحب)''ساس بہو کے جھگڑے'' (سید محمد فاروق صاحب)''اولاد'' (مسز قمر صاحب)''کم عقلی کی شادی'' (محمد فاطمہ صاحبہ)''عورتوں کی وفاداری پر ایک نظر'' (احمد اللہ صاحب)''مستورات کی وفاداری'' (سید محمد معصوم صاحب)''عورت کی حمایت''

(مسز قمر صاحب) ''ماں کا اثر بچہ کی صورت اور سیرت پر'' (آزاد دہلوی) ''اچھی ساس کا خط بہو کے نام اور اس کا جواب'' (مسز مرزا حسین علی بیگم صاحبہ) ''میکے کے بیچ سسرال میں'' (علامہ راشد الخیری صاحب) ''بیوگی'' (مخفی حیدر آباد دکن) ''فضول مراسم'' (بیگم صاحبہ حامد حسین صاحب) ''بیٹا بیٹی کا بیاہ'' (ع۔ز۔ صاحبہ) ''ولی کے فرائض'' (ظہیرہ حسین صاحب) ''شوہر کا انتخاب'' (سید مجتبیٰ صاحب) ''حور'' (حضرت علامہ راشد الخیری صاحب) ''عورت کی محبت'' (رازق دلہن خاتون اکرم) ''تسخیر شوہر کا منتر'' (محترمہ مسز انعام الحق صاحب بی اے) ''لڑکی سسرال میں'' (محمد مرزا جان صاحب) ''دوسری بیوی، میاں بیوی کے تعلقات'' (محترمہ ہمشیرہ اشرف حسین صاحب ایم اے) ''بیوی'' (محمد انور صاحب) ''خاوند کی اطاعت'' (مسز صغیر حسین صاحب) ''ایک تعلیم یافتہ اور جاہل بیوی کا طرز معاشرت'' (ہیڈ معلّمہ صاحب مدرسۂ نسواں امروہہ) ''محبت کا تعویز'' (نصیرہ صاحبہ) ''اچھی بیوی'' (مسز محمد اکرام) ''عورت کا سلیقہ'' (سید میر الحسن صاحب دہلوی) ''کنواری بیٹی کو ماں کی نصیحتیں'' (فاطمہ صدیقہ صاحبہ) ''ایرانی دلہن'' (سید خورشید علی صاحب) ''بہوؤں کو ہدایتیں'' (ایڈیٹر شیخ محمد اکرم) ''میری پیاری محبت'' (ک۔ن۔صاحب) ''شادی میں بدتہذیبی'' (خلیل بیگم صاحبہ) ''رخصتی کی نصیحتیں'' (مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی) ''جنتی بیبیاں'' (بلقیس جہاں بیگم) ''لڑکیوں کی شادی'' (بیگم نواب یعقوب خاں مرحوم) ''گھر داماد، سسرال کی شکایتیں'' (تسنیم فردوس) ''شوہر کا استقبال'' (بلقیس جہاں) ''گھر کی بیگم کے فرائض'' (کنیز محمد بیگم منشی فاضل) ''رسم منگنی''، ''حور صحرائی''، ''منگیتر سے خط وکتابت'' (نذر سجاد حیدر) ''مشترک خاندان کی نعمتیں'' (و۔م) ''زیور'' (و۔ا صاحبہ) ''ترکی شادی'' (عظمت النساء صاحبہ) ''شوہر کا جنازہ'' (خورشید اشفاق صاحبہ) ''منگیتر سے خط وکتابت'' (رضویہ خاتون صاحبہ) ''منگنی'' (مسز یوسف الزماں صاحبہ) ''رشتہ کرتے وقت احتیاط'' (ظفر جہاں بیگم صاحبہ) ''ساس بہو کے تعلقات'' (احمدی بیگم صاحبہ) ''جاپانی جہیز'' (مسز برلاس صاحبہ) ''دولہا دلہن کے لیے ہدایات'' (مسز حمید صاحبہ) ''فیشن ایبل بیوی'' (شاہدہ سلطانہ بانو صاحبہ) ''نتھ کی رسم'' (از محترمہ شریفہ خانم) ''بچپن کی شادیاں'' (از محترمہ بیگم احمد عمر) ''اسلام میں بیوی کا درجہ'' (علامہ راشد الخیری) ''خلع'' (مولوی عبدالغفار صاحب الخیری) ''طلاق وخلع'' (مولانا عبدالماجد صاحب) ''رسوم شادی'' (فردوس) ''چند اصلاح طلب

رسمیں'' (بیگم ڈاکٹر غلام رسول صاحب) ''حضرت بیوی'' (افسر الشعرا حضرت آغا صاحب قزلباش) ''عورت کے حقوق کم نہیں'' (ظفر جہاں بیگم صاحبہ) ''بچپن کی شادی'' (پرفیسر ستار خیری ایم اے) ''عورت اور مرد کے تعلقات'' (مسز شمس الدین صاحب) ''کنواری بچیاں'' (ہمشیرہ نثار احمد صاحب) ''بعض شوہروں کا برتاؤ بیویوں کے ساتھ'' (مسز ڈپٹی لال صاحب) ''کمسنی کی شادی'' (س۔ب۔صاحبہ) ''ساس اور بہو'' (محمد طفیل صاحب) ''فضول رسمیں'' (اصغری بیگم صاحبہ) ''اگلی اور اب کی بیویاں'' (راشدہ الخیریہ) ''شادی و خانہ آبادی'' (عزیزی صفیہ) ''منحوس دلہن'' (ش) ''گڑیا کا بیاہ'' (ہمشیرہ محمد طیب صاحب) ''بے مرضی کی شادی'' (صفیہ خاتون صاحبہ) ''سوکن کا جلاپا'' (صالحہ خانم صاحبہ) ''کشت اردو''، ''عورت کی فطرت''، ''عورت کی معاشی زندگی پر شادی کا اثر'' (شہر بانو صاحبہ) ''سوکنوں کو روکو'' (نور جہاں خاتون صاحبہ) ''محبت کے تاثرات'' (سردار محمدی بیگم صاحبہ) ''میاں بیوی کی لڑائی کی وجہ'' (مولوی نصیر الدین ہاشمی) ''غیر مسلم عورت سے شادی'' (بیگم عبدالرحمٰن صاحب) ''شادی کی عمر'' (مسز عزیز احمد صاحبہ) وغیرہ

ملک کے بدلتے حالات اور سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ عصمت کے موضوعات اور رجحانات بھی کروٹیں بدلتے رہے۔ لیکن بنیادی مقاصد کو پھر بھی ہر قسم کے حالات میں سامنے رکھا گیا۔ سیاسی فضا بدلتے دیکھ کر خواتین بھی معاشرے کے ایک اہم فرد کی حیثیت سے ملک اور دنیا کے سیاسی منظر نامے پر لکھتی رہیں۔ عصمت کی طویل عرصے کی کاوشوں میں خواتین میں گھریلو، مذہبی امور کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ سیاسی حوالے سے عصمت کی زینت بننے والے مضامین درج ذیل ہیں: ''قومی ترقی عورتوں کے ہاتھ ہے'' (پروفیسر ستار خیری ایم اے) ''اصول اسلام اور قوانین انگریز'' (و۔ا صاحبہ) ''مسلمان اور قومیت'' (مولوی عبدالغفار صاحب الخیری) ''مسلم خواتین کا نصب العین'' (مولانا عبداللہ یوسف علی) ''سیاست میں عورتوں کا حصہ'' (فاطمہ جعفر صاحبہ منشی فاضل) ''انگلستان میں عورتوں کی جنگ آزادی سے قبل کی حالت'' (شہر بانو صاحبہ) ''سیاسی ماحول میں عورتوں کی ترقی'' (ایس کے صغریٰ سبزواریہ صاحبہ) ''۱۹۳۲ء کی نامور خواتین'' (قیصرہ بیگم صاحبہ) ''آل انڈیا مسلم لیڈیز لیگ'' (صغرا ہمایوں مرزا صاحب) ''مسلمان اور کانگرس'' (ر۔س صاحبہ) ''پارلیمانِ برطانیہ اور حکومتِ ہند'' (مسز اے اے اختر صاحبہ) ''انجمن ترقی

نسواں حیدرآباد‘‘ (اختر محمد احمد صاحبہ) ’’ناگپور میں انجمن خواتین کا قیام‘‘ (مسز برلاس صاحبہ) ’’تعلیم نسواں کا سیاسی رخ‘‘ (کپتان نصیرالدین ہاشمی) ’’ہندستان کی صنعتی ترقی میں عورت کی حیثیت‘‘ (شہر بانو صاحبہ) ’’دنیا کی اقتصادی حالت‘‘ (شہر بانو صاحبہ) ’’ترکی خواتین کی ترقی‘‘ (حضرت امام اکبر آبادی) ’’عورتیں اور اخبار نویسی‘‘ (مظفر حسین صاحب شمیم) ’’قوموں کی ترقی میں عورتوں کا حصہ‘‘ (امۃ الوحی صاحبہ) ’’ترقی نسواں کا طبی پہلو‘‘ (شہر بانو صاحبہ) ’’غدر کی ماری شہزادیاں‘‘ (علامہ راشد الخیری) ’’مسلم لیڈیز کانفرنس اور زنانہ صنعتی نمائش آگرہ‘‘ (کنیز فاطمہ بیگم) ’’موجودہ تمدن اور ہندستانی خواتین‘‘ (جمیلہ بیگم صاحبہ) ’’اوسط درجہ کے خاندانوں کی اقتصادی حالت‘‘ (شہر بانو صاحبہ) ’’افلاس کا سبب‘‘ (مریم یوسف علی صاحبہ بی اے) ’’مفلس ہندستان‘‘ (صفیہ بی صاحبہ) ’’ترکی خواتین کی معاشرت‘‘ (اسماء محمد سعید صاحب) ’’ایرانِ جدید‘‘ (سعیدہ صدیق حسن صاحبہ) ’’عورتوں کی جنگی خدمات‘‘ (جمیلہ بیگم) ’’سیاسیات عالم‘‘ (زبیدہ زرین صاحبہ) ’’جامعہ عثمانیہ کی غیر مسلم خواتین‘‘ (مولوی نصیرالدین صاحبہ ہاشمی) ’’انگلستان میں جنگ کے ابتدائی ہفتے‘‘ (محترمہ شائستہ اختر سہروردیہ) ’’صوبوں کی مجالس آئین ساز‘‘ (قاری عباس حسین صاحب) ’’انجمن خواتین دکن‘‘ (مسز جمیل الرحمٰن صاحب) ’’اسمبلی کی پہلی خاتون ممبر‘‘ (اسماء سعید صاحبہ) ’’بادشاہت اور جمہوریت‘‘ (زبیدہ زرین صاحبہ) ’’مشترک اختیارات قانون سازی‘‘ (قاری محمد عباس حسین صاحب) وغیرہ

ان تمام موضوعات کے علاوہ خواتین کی دینی و مذہبی تعلیم و تربیت کے لیے تمام امہات المومنین کی زندگی کے واقعات سلسلہ وار عصمت میں شائع کیے گئے۔ ملکی اور بین الاقوامی خبروں اور معلومات سے آگاہی دینے کے لیے ’’سیربین‘‘ اور ’’دوربین‘‘ جیسے مفید اور دلچسپ سلسلے عصمت میں شائع ہوتے رہے۔

اگر عصمت کے سارے ادوار کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ زمانے اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ عصمت کے موضوعات اور رجحانات میں تغیر و تبدل واقع ہوتا رہا جیسے ابتدا میں حقوق نسواں، تعلیمِ نسواں کے موضوعات غالب ہیں اور اسی رجحان کو سامنے رکھتے ہوئے لکھاریوں نے بھی اپنی تحریروں میں ان موضوعات کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے بعد جیسے جیسے ملک کی سیاسی فضا تبدیل ہو رہی تھی موضوعات بھی بدل رہے تھے۔ اور اسی رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ملکی اور بین

تبدیل ہورہی تھی موضوعات بھی بدل رہے تھے۔ اور اسی رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ملکی اور بین الاقوامی سیاسی تناظر میں مضامین لکھے گئے۔ عالمی جنگوں اور ہندُستان کی تقسیم کے مرحلے پر بھی عصمت ثابت قدمی کے ساتھ نکلتا رہا اور معاشرے کے جس مظلوم طبقے کی اصلاح و ترقی کا بیڑا اس نے روزِ اول سے اٹھایا تھا پوری تندہی سے ان مشکل حالات میں بھی ان کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتا رہا۔ معاشرے کا ہر وہ پہلو جس سے طبقۂ نسواں کا تعلق تھا عصمت کا موضوع بنا اور کہیں پر بھی اسلامی روایات و مشرقی اقدار سے انحراف نہیں کیا گیا اور حیرت اور فخر کی بات یہ ہے کہ اس دور میں جب کہ خواتین کی تعلیم عام نہیں ہوئی تھی ان کے لکھے مضامین بہت معیاری تھے۔ وہ موضوعات پر پوری گرفت رکھتے ہوئے ان کا احاطہ کرتی تھیں اور ان کے اسلوب بیان کی سادگی و سلاست اور روانی قارئین کے دلوں میں جگہ بنا لیتی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۔۴۔

۲۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۳۔ ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۴ء)، ص ۳۰۹۔

۴۔ ڈاکٹر نسیم آرا، اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص ۵۵۔

۵۔ محمد افتخار کھوکھر، تاریخ صحافت (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء)، ص ۸۳۔

۶۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص ۴۲۔

۷۔ محمد افتخار کھوکھر، ص ۶۷۔

۸۔ ڈاکٹر انور سدید، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، ص ۴۵۔

۹۔ گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۹ء)، ص ۴۵۔

۱۰۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۱۲۱۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔

۱۴۔ محمد افتخار کھوکھر، ص ۷۱۔

۱۵۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۱۸۴۔

۱۶۔ انیس دہلی، ''خواتین کے رسالے'' اردو ادب کو خواتین کی دین (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء): ص ۲۵۵۔

۱۷۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن، ز خ ش (حیات و شاعری کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ) (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷)، ص ۹۱۔

۱۸۔ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر فاطمہ حسن کی تحقیق کے مطابق یہ رسالہ ۱۹۰۷ء میں جاری ہوا جبکہ ڈاکٹر نسیم آرا نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ رسالہ ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا اور ناچیز کو بھی ان کے دلائل پُر اثر معلوم

ہوتے ہیں۔

۱۹۔ ڈاکٹر نسیم آرا،ص۲۲۱۔

۲۰۔ ڈاکٹر طاہر مسعود،اردو صحافت انیسویں صدی میں (کراچی:فضلی سنز لمیٹڈ،۲۰۰۲ء)، ص۱۰۷۳۔

۲۱۔ سیّد محمد اشرف نقوی،اختر شہنشاہی (لکھنو:اختر پریس،۱۸۸۸ء)،ص۱۰۔

۲۲۔ ڈاکٹر رضوانہ،۱۹۵۰ء کے بعد اردو کی خواتین افسانہ نگار(دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۰۷ء)،ص۱۰۔

۲۳۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص۱۴۵۔

۲۴۔ ایضاً،ص۱۴۴۔

۲۵۔ ایضاً،ص۱۵۵۔

۲۶۔ ایضاً،ص۱۶۳۔

۲۷۔ ایضاً،ص۲۰۵۔

۲۸۔ رازق الخیری،عصمت کی کہانی (دہلی:عصمت بک ڈپو،ستمبر ۱۹۴۶ء)،ص۴۔

۲۹۔ شیخ محمد اکرام،''مقاصدِ عصمت''عصمت(جولائی ۱۹۰۸ء):ص ا۔۵۔

۳۰۔ رازق الخیری،عصمت(راشد الخیری نمبر)(۱۹۳۶ء):ص۱۱۔

۳۱۔ ڈاکٹر نسیم آرا،ص۲۱۵۔

۳۲۔ رازق الخیری،سوانح عمری (علامہ راشد الخیری) (کراچی:عصمت بکڈپو،۱۹۶۴ء)،ص۴۴۔۴۸۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴۔ ایضاً۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ ایضاً۔

۳۷۔ ڈاکٹر فاطمہ حسن،ص۹۔۹۹۔

۳۸۔ ڈاکٹر نسیم آرا،ص۲۱۱۔۲۱۲۔

۳۹۔ ایضاً،ص۲۰۶۔

۴۰۔ علامہ راشد الخیری،''محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ''عصمت (فروری ۱۹۲۶ء):ص۱۲۱۔

۴۱۔ ڈاکٹر نسیم آرا،ص۵۹۴،۵۹۵۔

۴۲۔ ندرت شبنم لودھی، ''اردو شاعری میں خواتین کا حصہ'' سہ ماہی اردو ج ۷۸، ش ۱ تا ۴ (جنوری تا دسمبر ۲۰۰۲ء): ص ۱۷۲۔

۴۳۔ شائستہ سہروردی اکرام اللہ، شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی منتخب تحریریں (ماہنامہ عصمت ۱۹۳۴ء تا ۱۹۸۸ء) ترتیب وتعارف: احمد سلیم (کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۴۔

۴۴۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، پاکستانی اہلِ قلم خواتین ایک ادبی جائزہ (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۵۴۔

۴۵۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۵۸۶۔

۴۶۔ ڈاکٹر نسیم آرا، ص ۲۱۱ تا ۲۲۷۔

۴۷۔ مسز رابعہ اقبال، اردو ادب اور طبقۂ نسواں (حیدرآباد: ادارۂ اردو، ۱۹۹۰ء)، ص ۴۳۔۸۲۔

باب سوم

بیداری نسواں میں ماہنامہ عصمت
کی نثری تخلیقات کا کردار: تنقیدی مطالعہ

باب سوم

بیداری نسواں میں ماہنامہ عصمت کی نثری تخلیقات کا کردار: تنقیدی مطالعہ

خواتین میں شعور اجاگر کرنے کے لیے ماہنامہ عصمت نے ایک پلیٹ فارم کا کردار ادا کیا۔ اس پلیٹ فارم کی بدولت بہت سے ادیب تیار ہوئے، خواتین کی مخفی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ یہ ماہنامہ وہ واحد پلیٹ فارم تھا جس میں پہلی دفعہ خود خواتین نے خواتین کے لیے لکھا۔ بلاشبہ ایک خاتون ہی خواتین کے مسائل کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھ سکتی اور بیان کر سکتی ہے۔ تاہم خواتین کے ساتھ ساتھ مرد حضرات نے بھی خواتین کے مسائل کو موضوع بحث بنایا۔ اس ماہنامے نے مصنف اور قاری کے درمیان رابطے کا کردار ادا کیا۔ اس ماہنامے میں نہ صرف بیسویں صدی بلکہ عصر حاضر میں درپیش تمام معاشرتی مسائل پر بھی بہت خوبصورتی سے قلم اٹھایا گیا۔ اس ماہنامے میں سیاسی، سماجی، دینی، تمدنی غرض یہ کہ شعبہ ہائے زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو احاطۂ تحریر میں نہ لایا گیا ہو۔

ا۔ مضامین

کسی مقررہ موضوع پر اپنے خیالات اور جذبات و احساسات کا تحریری اظہار مضمون کہلاتا ہے۔ موضوع کی قید سے آزاد ہونے کے باعث دنیا کے ہر معاملے اور مسئلے پر مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ مضمون میں پہلے موضوع کا تعارف کرایا جاتا ہے پھر موضوع کی حمایت یا مخالفت میں دلائل دیے جاتے ہیں اور آخر میں نتیجہ پیش کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ عصمت میں شائع ہونے والی نثری تخلیقات میں سب سے اہم مضامین ہیں۔ ابتدا سے لے کر موجودہ دور تک ماہنامہ عصمت میں بکثرت مضامین لکھے گئے۔ ابتدائی دور میں خاص طور پر خواتین کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا گیا اور تاریخی، دینی، سیاسی ہر لحاظ سے خواتین کی

تعلیم کی اہمیت واضح کی گئی۔اس ماہنامے میں نہ صرف خواتین کی تعلیم بلکہ اخلاقی تربیت، بچوں کی تعلیم وتربیت میں ان کے مؤثر کردار، شادی بیاہ کے معاملات، فضول خرچی سے گریز، میانہ روی اور اعتدال کی روش اختیار کرنے، حفظانِ صحت کے اصول، پردہ، آزادی، حق مہر، طلاق، جہیز، کثرت ازواج غرض یہ کہ ان کی زندگی سے متعلقہ ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔

ماہنامہ عصمت کے مقاصد میں ایک بہت بڑا مقصد خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا تھا کیوں کہ اس زمانے مس خواتین مصنفین گنتی کی چند ہی تھیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے حضرت علامہ راشد الخیری نے اپنے مخصوص رنگ اور مؤثر انداز میں نہایت ہی عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، حفظانِ صحت وغیرہ پر چھوٹے چھوٹے مضامین خواتین کے فرضی ناموں سے لکھے۔علامہ نے کسی مضمون کو ''ج بیگم'' کسی کو ''ص۔بیگم'' اور کسی کو ''احمد النساء'' وغیرہ کے فرضی ناموں سے اس لیے شائع کیا تا کہ ایسے سیدھے سادے مضامین پڑھ کر خواتین میں خود بھی لکھنے کی تحریک پیدا ہو۔خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنے کے لیے عصمت اور معاونین عصمت نے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۲ء تک مختلف مواقع پر بہترین مضامین پر انعامات بھی دیے اور اس طریقہ سے بھی خواتین میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کیا۔علامہ راشد الخیری کے مضامین اور مستقل تصانیف کے مطالعے نے خواتین مصنفین کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کی مضمون نگاری آج طبقۂ نسواں کے لیے باعثِ فخر ہے۔ماہنامہ عصمت میں شریف ہندُستانی بیبیوں کے لیے شائع ہونے والے مضامین کا معیار حضرت علامہ راشد الخیری کے لکھے ہوئے ایک اشتہار سے واضح ہوتا ہے جو ۱۹۰۹ء سے کئی سال تک دوسرے رسائل میں شائع ہوتا رہا:

> خواتین کے واسطے عصمت میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی فلاح و بہبود ملحوظ ہے۔کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارپنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے؟ ماں باپ کا ادب، بہن بھائیوں کی خدمت، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے، ان کے لیے انھیں کیا تیاری کرنی ہے؟ جو جو دقتیں ان کو پیش آئیں گی ان کو کس طرح رفع کرنا ہے؟ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہییں۔

> بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری، گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش میں عصمت سے مدد ملے گی۔ عصمت انہیں بتائے گا کہ جس آمدنی کو وہ بے غل وغش خرچ کررہی ہیں وہ کس محنت ومشقت سے پیدا کی گئی ہے۔ جو بچے قدرت نے ان کے سپرد کیے ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں ان پر کیا کیا ہیں؟ عصمت بتائیگا کہ انہیں گھر کس طرح چلانا ہے؟ روپیہ کا مصرف کیا ہے؟ خاندان کے ساتھ کس طرح بسر کرنی ہے۔[1]

یہ اقتباس ایک کسوٹی ہے جس پر عصمت کے دوراوّل ہی کو نہیں بلکہ تمام ادوار کو بخوبی پرکھا جاسکتا ہے۔

ماہنامہ عصمت جولائی ۱۹۰۸ء کے شمارے میں جہاں عالم نسواں کی ترقی، تعلیم نسواں کی حمایت، معلومات عامہ وخاصہ کے حوالے سے شائع ہونے والی تحریروں کا معیار واضح کیا گیا وہاں مضامین کے حوالے سے بھی ماہنامہ عصمت نے اپنا مطمح نظر واضح کر کیا:

> عصمت میں مضامین علمی، ادبی، تاریخی، معاشرتی، سوشل غرض ہر قسم کے مضامین جو مستورات کے لیے مفید اور ضروری سمجھے جائیں گے درج ہونگے۔ پولیٹکل مضامین سے قطعی احتراز رہیگا۔[2]

ماہنامہ عصمت کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے مردوخواتین لکھاریوں نے اس میں مضامین لکھے اور عصمت نے کڑی جانچ کے بعد مطلوبہ معیار کے حامل مضامین کو شائع کیا۔

اندراجِ مضامین کے چند اصول

ماہنامہ عصمت میں بھی بحث مباحثہ اور کسی نہ کسی پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنے کے لیے میدان وسیع تھا۔ بڑی بڑی شخصیات تک بھی عصمت کامیابی کے ساتھ پہنچ رہا تھا، اور اکثر اس قسم کے مواقع بھی پیدا ہوتے رہتے تھے کہ تعلیم یافتہ خواتین کی ہر محفل اور ہر مجلس میں عصمت کے گرما گرم مضامین کا چرچا ہوتا رہتا لیکن ہنگامی مضامین اور فضول مباحث پر مشتمل مضامین سے اوراقِ عصمت ہمیشہ پاک رہے۔ نسوانی مسائل پر متانت، وقار، تہذیب، شائستگی اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصمت نے نہایت مفصل اور مدلّل بحثیں شائع کیں جو خواتین میں بہت مقبول ہوئیں۔

اندراجِ مضامین کے حوالے سے عصمت نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ کوئی ایسا موضوع زیر بحث نہ لایا جائے جو فریقین کو ناگوار گزرے، یا جس کا کسی جماعت کے عقائد پر اثر پڑے۔ عصمت کا کوئی مضمون ذاتیات سے بھی آلودہ نہ تھا۔ عصمت نے ہمیشہ ایسے مباحث چھیڑے جو ہندُستانی خواتین کے حق میں مفید ثابت ہوں۔[۳]

مضمون نگاری کے قواعد

مضمون نگارانِ عصمت کو مضامین بھیجنے سے پہلے کچھ قواعد کا خیال رکھنے کا کہا گیا تاکہ ان کا وقت اور محنت بیکار نہ جائے۔ یہ قواعد تقریباً ہر شمارے کے صفحۂ اوّل پر شائع کیے جاتے تھے۔

۱۔ مضامین کاغذ کے ایک رخ پر روشن سیاہی سے نظر ثانی، مناسب ترمیم و اصلاح و اضافہ کے لیے ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھنے چاہییں۔

۲۔ مدیر کے نام خط میں مضمون نگار کا صحیح نام اور پورا پتہ درج ہونا اشد ضروری ہے۔

۳۔ طویل مضمون کے لیے تین تین چار ماہ کے بعد بھی ممکن ہے کہ جگہ نہ نکل سکے لیکن چھوٹے چھوٹے مضامین درجِ رسالہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مضمون نگار جہاں تک ممکن ہو مضمون مختصر لکھیں اور کم سے کم الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

۴۔ مضمون کسی کتاب یا رسالہ سے نقل ہو یا ترجمہ یا اخذ ہو تو مصنف کا نام اور کتاب یا رسالہ کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

۵۔ عصمت کے لیے صرف وہ مضامین ارسال کیے جائیں جو عصمت کے لیے لکھے جائیں۔ وہ مضمون ہرگز نہ بھیجیے جو کسی اور پرچے کو بھیجا جا چکا ہو۔

۶۔ مضامین کے لیے پرانے پامال عنوانات جن پر بارہا عصمت میں مضامین شائع ہو چکے ہیں منتخب نہ کرنے چاہییں۔ نئے نئے موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضامین جو اسلوب بیان، ندرت خیال وغیرہ کے اعتبار سے دلچسپ سمجھے جا سکتے ہیں خوشی کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں۔

۷۔ مضامین میں تہذیب و سنجیدگی کا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ جو مضامین ذاتیات سے آلودہ

ہوتے ہیں یا جن سے کسی فرقہ یا کسی شخص کی دل آزاری ہوسکتی ہے، ردّی کر دیے جاتے ہیں۔ عصمت مذہبی جھگڑوں کا اکھاڑہ نہیں ہے۔ عصمت کے لیے ایسے مضامین بھیجنے چاہییں جو ہندو، مسلمان، عیسائی، سکھ غرض سب کے لیے مفید ہوں۔

۸۔ مضامین کی زبان سلیس اور عام فہم ہونی چاہیے۔ رنگین بے معنی عبارت ہمیں ناپسند ہے۔ فارسی، عربی، انگریزی الفاظ ٹھونسنے سے مضمون بھدّا ہو جاتا ہے۔

۹۔ جو مضامین عصمت میں شائع ہوتے ہیں ان کا دائمی حقِ اشاعت بحق عصمت محفوظ ہوتا ہے۔

۱۰۔ عصمت سال کے بہترین مضامین پر جولائی میں تین چار سو روپے کے انعامات مضمون نگار خواتین میں تقسیم کرتا ہے۔ کم استطاعت مضمون نگار عورتوں کو معاوضہ بھی دیتا ہے۔ غیر مسلم خواتین کے مضامین خوشی سے شائع کیے جاتے ہیں۔[۴]

عصمت کے مدیر کی جانب سے ان قواعد کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں مضامین نا قابلِ اشاعت قرار دیے جانے کا مژدہ بھی سنایا گیا۔

ماہنامہ عصمت میں شائع ہونے والے مضامین کو موضوعاتی اعتبار سے کئی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان مضامین کا تعارف و تجزیہ درج ذیل ہے:۔

۱.۱۔ طبقۂ نسواں کے لیے افادیت عصمت

ماہنامہ عصمت کے بالکل ابتدائی دور میں خواتین نے بڑی خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور عصمت کے مقاصد کو سراہا۔

سکندر جہاں بیگم نے ''اخبار و رسائل'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین کے دیگر رسائل کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے عصمت کے اجرا پر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو تو سب نے تسلیم کر لیا ہے۔ خواتین کی تعلیم سے صفائی و پاکیزگی بڑھے گی۔ اخلاقی حالت درست ہوگی۔ روشن خیالی پیدا ہوگی، لیکن ان تمام باتوں کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ اخبارات و رسائل ہیں:

ناشکرگزاری ہوگی اگر اس موقع پر تہذیب النسواں لاہور اور رسالہ خاتون علیگڑھ کا ذکر نہ کیا جائے کیونکہ انہوں نے تعلیم نسواں کے جسم میں روح پھونکنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور تھوڑے عرصہ میں چاروں طرف تعلیم کا شور مچا دیا اور لوگوں کو تعلیم نسواں کی طرف متوجہ کردیا۔ [5]

اخبار و رسائل کی مزید ضرورت پر زور دیتے ہوئے وہ کہتی ہیں:

تعلیم نسواں کو ترقی دینے کے لیے حقیقت میں بہت سے اخباروں اور رسالوں کی ضرورت ہے۔ اسی لیے رسالہ عصمت کا اشتہار پڑھ کر مجھے نہایت خوشی حاصل ہوئی کہ دلّی میں ایک رسالہ اس نام کا نکلنے والا ہے۔ دلّی میں ایسے پرچے کی ضرورت تھی۔ میں مسرّت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ [6]

سلطان بیگم نے ''عصمت کا خیر مقدم'' کے عنوان سے مضمون لکھا ہے۔ اور اس افسوسناک امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اخبار یا رسالے کے شائع ہونے کی خوشی تو بہت منائی جاتی ہے مگر اس کو مدد دینا بہت مشکل ہے۔ اگر واقعتاً ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کی ترقی ہو جائے تو خواتین کے یہ چار پانچ رسالے یا اخبار چلنے کچھ مشکل نہیں۔ رسالہ تہذیب گیارہ سال سے نکلنے کے باوجود بہت سے لوگ تہذیب کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ جن خواتین کے پاس رسائل جاتے ہیں ان کے پاس پورے سال وقت نہیں ہوتا کہ کوئی ایک تحریر بھی رسالے کے لیے لکھ سکیں۔ وقت کی کمی کا رونا رونا آجکل فیشن شمار ہوتا ہے۔ جو خواتین مصروفیت کا رونا روتی ہیں اس کی وجہ منٹوں کا کام گھنٹوں میں نمٹانا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں عام رواج یہ ہے کہ کام کم اور باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ایک کام کرنے بیٹھے وہ ابھی مکمل نہیں ہوا کیونکہ ساتھ زمانے بھر کی باتیں ہو رہی ہیں۔ نام کام کا ذکر دنیا بھر کا۔

سلطان بیگم نے خواتین پر زور دیا ہے کہ جہاں بھی نسواں کا نام آئے اس کی ترقی میں سب خواتین کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے:

خصوصاً دہلی کی بہنوں کو ضرور اس کی ترقیِ اشاعت میں کوشش کرنی چاہیے کیونکہ دہلی میں کوئی اخبار یا رسالہ خاص مستورات کے لیے نہیں نکلتا ہے۔ اور یہ اتنا بڑا شہر تعلیم نسواں میں بہت ہی پیچھے ہے۔ امید ہے کہ رسالہ عصمت کے

ایڈیٹر صاحب دہلی کی خاتونوں کی ترقی کے لیے اس کا معقول حصہ صرف فرما کر
ان کو شکر گزاری کا موقع دینگے۔ [۷]

۲.۱۔ حقوقِ نسواں

''نارضامندی کی شادی'' کے عنوان سے مضمون میں علامہ راشد الخیری نے معاشرے میں مروج فضول رسوم پر کڑی تنقید کی جو قریب قریب کار خیر مذہب سمجھ کرادا کی جارہی ہیں۔ شادی کرتے ہوئے لڑکے لڑکی کی نارضامندی جانتے ہوئے بھی دو زندگیاں تباہ کرنے والے انسان کو انھوں نے جانور کے مماثل قرار دیا۔ اس سلسلے میں سنت رسولؐ کی پیروی کرنے کو افضل ٹھہرایا اور حضرت فاطمۃ الزہرہؓ اور حضرت علیؓ کی شادی کی مثال پیش کی جس میں حضورؐ نے سیدہ فاطمۃ الزہرؓ کی خاموشی کو ان کی رضامندی سمجھ کر ان کی شادی کی کیونکہ حضرت فاطمہؓ حضرت علیؓ کے مزاج، عادات وخصائل سے پوری طرح واقف تھیں اور شادی کا سن کر خاموش رہنے کو ان کی رضامندی سے تعبیر کیا گیا۔ [۸]

اگر فریقین شادی طے ہونے کا علم ہونے کے بعد خاموش رہیں تو اسے ان کی رضامندی سمجھا جائے لیکن اگر ماں باپ کو علم ہو کہ فریقین راضی نہیں تو زبردستی نکاح اولاد سے دشمنی کے برابر ہے۔ علامہ کے نزدیک فریقین کو ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا موقع دینا چاہیے لیکن بعض گھروں میں پردہ اس سلسلے میں بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ علامہ نے کم سنی کی شادی پر بھی ناگواری کا اظہار کیا اور فریقین سے اعلانیہ ان کی رضامندی جاننے پر زور دیا تاکہ ان کی ازدواجی زندگی تلخیوں کا شکار نہ ہو اور پرسکون اور خوش گوار گزرے۔ [۹]

علامہ راشد الخیری نے ''عورتوں کے حقوق'' مضمون میں بیداریِ حقوقِ نسواں کے فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اس کی بدولت جہاں کچھ گھروں میں بیویوں کی قدر ہونے لگی ہے وہاں کچھ بیویاں حقوق کے نشے میں اپنے فرائض سے ہی غافل ہوگئی ہیں۔ علامہ نے مذہب اسلام کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ وہ واحد مذہب ہے جس نے سب سے پہلے خواتین کی حمایت کی بلکہ خواتین کو انسان کا درجہ دیا۔ علامہ نے لباس اور وضع بدلوا کر حقوق نسواں کے نعرے لگانے والوں کو تنقید کا نشانہ بنایا اور خواتین کو نصیحت کی کہ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں کسی کوتاہی سے کام نہ لیں۔ ان کے

حقوق خود بخود انھیں مل جائیں گے۔ [۱۰]

علامہ راشد الخیری نے ''آئینہ عبرت'' کے عنوان سے مضمون میں معاشرے کے اس دوہرے معیار کو طنز کا نشانہ بنایا ہے کہ مرد مصنفین کی تصنیفات پر تعریف کے ڈونگرے برسا دیے جاتے ہیں اور خواتین کو ان کی محنت کی داد دینے کی بجائے ان پر نکتہ چینی کی جاتی ہے اور خواتین مصنفین کو اعتراض کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علامہ نے خواتین کی کتابوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور معمولی اغلاط سے چشم پوشی کرنے کا کہا تا کہ دوسری خواتین کے اندر بھی لکھنے کا شوق پیدا ہو۔ علامہ نے اس غیر منصفانہ رویے کی وجہ حقوق نسواں سے آگہی کو قرار دیا۔ انہوں نے محترمہ بنت نذر الباقر کی کتب اختر النساء اور آہ مظلوماں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ کچھ مرد حضرات نے انہیں لغو کتب قرار دیا حالانکہ خود ان سے زیادہ لغو لکھنے والے شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اسی طرح سہروردیہ بیگم صاحبہ کی کتاب آئینہ عبرت کے شامل نصاب ہونے پر بھی کچھ مرد حضرات نے اعتراض اٹھایا ہے۔ جبکہ علامہ نے اراکین سنڈیکیٹ کے اس اقدام کو سراہا کہ اس کتاب کو نصاب میں شامل کر کے انھوں نے نہ صرف محترمہ سہروردیہ بیگم صاحبہ کی حوصلہ افزائی کی بلکہ دیگر ہندوستانی خواتین میں بھی تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کر کے طبقۂ نسواں پر احسان عظیم کیا۔ [۱۱]

ہمشیرہ ایس۔ ایم ''حقوق نسواں'' کے عنوان سے مضمون میں ان نام نہاد تعلیم یافتہ مردوں کی عقل پر ماتم کرتی ہیں جو عورت کو ناقص العقل اور ناقص دین قرار دیتے ہیں، اور عورت کو ریڑھ کی ہڈی اور پاؤں کی جوتی کہہ کر بیوفائی کو اس کی ذات سے منسوب کرتے ہیں۔ مصنفہ قرآن پاک کی آیات کے حوالے دے کر عورت کے رتبے کا تعین کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب انسان کو بشمول عورت کو ''احسن تقویم'' پیدا کرتا ہے تو مرد کس بنا پر خواتین کے دین اور عقل کو ناقص قرار دے سکتے ہیں۔ اللہ نے عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دے کر بھی دونوں کو برابر ٹھہرایا۔ غرض آیات قرآنی اس بات کی شاہد ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر ہیں یہ تقسیم مردوں کی پیدا کی ہوئی ہے جو سراسر ناانصافی اور ظلم پر مبنی ہے۔ [۱۲]

مسز ڈپٹی لال صاحبہ نے ''ہندستان میں لڑکیوں کی حالت'' کے عنوان سے مضمون میں بیٹی کی پیدائش کو منحوس سمجھے جانے پر نکتہ اعتراض اٹھایا ہے کہ دنیا کے تمام بہادر سور ماؤں کو جنم دینے والی ذات عورت ہی کی ہے، جن حضرات کے اخلاق اور تعلیم کا دنیا میں ڈنکا بجا انھوں نے بھی ابتدائی تعلیم ماؤں کی گود سے ہی حاصل کی، انھیں اخلاق اور شجاعت کا پیکر ماؤں نے بنایا۔ پھر بھی ہندستان میں اس صنف کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندستانی خواتین عمر کے ہر حصے میں قابل رحم ہوتی ہیں۔ بچپن میں ایک فضول چیز سمجھ کر ان کی صحت، خوارک اور صفائی کا خیال نہیں رکھا جاتا، لڑکپن میں انھیں تعلیم اور کھیل کود سے محروم رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ جوانی میں ہی تپ دق اور سل وغیرہ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ پھر نو دس سال کی عمر میں بیاہ کر گھر داری کا بوجھ ان کے سر پر لاد دیا جاتا ہے۔ جہاں سب کی لعن طعن عمر بھر کے لیے ان کا نصیب بن جاتی ہے۔ مصنف نے مردوں کو تنبیہ کی کہ اب خواتین بھی اپنے حقوق کے حصول کے لیے جاگ گئی ہیں اس لیے مردوں کو ان کی تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کرنا چاہیے ورنہ جیسا کروگے ویسا بھروگے کے مصداق انھیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی۔[۱۳]

علامہ راشد الخیری نے ''حقوق نسواں'' کے حوالے سے مضمون میں مذہب اسلام کی رُو سے طبقۂ نسواں کے حقوق پر روشنی ڈالی اور ایسے مسلمانوں پر تنقید کی جو خواتین کے لیے تعلیم کو گناہ اور ناجائز قرار دیتے تھے۔ اور غصب حقوق کی اس روش میں انھوں نے علمائے اسلام کو بھی شمار کیا جو کلام الٰہی اور احادیث نبویؐ کی آڑ میں تعلیم نسواں کو ناجائز قرار دیتے تھے۔ علامہ نے تاریخ اسلام سے نامور خواتین اسلام کے ایثار کی مثالیں دیتے ہوئے فرمایا کہ خواتین نے اپنے حقوق اپنی قربانیوں اور خدمات کی بدولت خود حاصل کیے۔ اسلام نے خواتین کو جانور سے انسان، پتھر سے ہیرا اور لونڈی سے گھر کی ملکہ بنا دیا۔ انھوں نے مغربی خواتین کی تقلید کو ناپسند کرتے ہوئے مسلمان خواتین کو اپنے فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی۔ [۱۴]

محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ ''اسبابِ دِق وسِل'' کے عنوان سے مضمون میں ان موذی امراض کے اسباب مردوں کی سختی، ظلم وستم، کردار کی خرابی، بیویوں پر توجہ نہ دینے، تعلیم یافتہ لڑکیوں کو خلافِ مزاج بیاہ دینے کو قرار دیتی ہیں۔ ہم خیال اور ہم مزاج شوہر نہ ملنے پر کڑھ کڑھ کر خواتین مبتلائے سل

ہو جاتی ہیں۔ رئیس نواب صاحبان کی بیگمات کو اپنے شوہروں کی خود پرستی، عیاشی اور گھر سے بے پروائی گھن کی طرح اندر ہی اندر کھاتی رہتی ہے۔ بظاہر زیورات سے لدی پھندی ان خواتین کو اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا۔ یہ طبقہ تبھی ان امراض سے بچ سکتا ہے جب مرد انھیں جاندار خیال کر کے اپنے کردار کی اصلاح کریں اور انھیں خوش رکھیں۔ مرضی کے خلاف شادی ہونے پر بھی خواتین گھٹ گھٹ کر نذر دق ہو جاتی ہیں۔ مصنفہ کے نزدیک والدین کو اپنی اولاد کے لیے ان کا ہم خیال ساتھی تلاش کرنا چاہیے۔ رشتہ داری، ذات برادری کی قید ختم کر دینی چاہیے۔ اور پورے خاندان کے ساتھ ایک ہی تنگ و تاریک گھر میں رہنے کے رواج بھی ختم کرتے ہوئے خواتین کو ان کے حقوق دینے چاہییں تاکہ وہ ایک خوشگوار صحت مند زندگی گزار سکیں۔ [۱۵]

علامہ راشد الخیری نے ''مظلوم کی فریاد'' مضمون میں طبقۂ نسواں سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور خواتین کی زندگی کو ایک ایسے بلبل سے تشبیہ دی ہے جو باغ میں (میکے میں) بہت خوش ہوتا ہے کہ ایک صیاد (شوہر) اسے پکڑ کر لے جاتا ہے۔ نکاح کے دو بول پڑھوا کر خواتین اپنے گھر والوں کو دم بھر میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اجنبی جگہ چلی جاتی ہیں اور وہاں بھی ان کا ہر پل سولی پر لٹکنے کے مترادف ہوتا ہے۔ تنقیدی نگاہیں ہر لمحہ پیچھا کر رہی ہوتی ہیں۔ سسرال کے ایک ایک فرد کا دھیان رکھنا پڑتا ہے اور شوہر حضرات تو گھر لے جا کر گویا انھیں انسان نہیں کولھو کا بیل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ بیوی کی خواہشات، اس کی ضروریات، اس کو خوش رکھنے، کسی بات سے انھیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ علامہ مظلوم خواتین کی فریاد اللہ کے پاس لے کر جاتے ہیں اور اللہ سے انصاف کے طلب گار ہوتے ہیں۔ [۱۶]

''ساون کی چڑیاں'' مضمون میں علامہ راشد الخیری ساون کے خوب صورت موسم کی تمہید باندھتے ہوئے لڑکیوں کو بھی ساون کی چڑیاں قرار دیتے ہیں جو ساون کی طرح کنوار پنے کے دن میکے میں بسر کرتی ہیں اور شادی کے بعد ساون کی چڑیوں کی مانند پھر سے اڑ جاتی ہیں۔ علامہ نے خاص طور پر ماؤں پر زور دیا کہ وہ اولاد کی تربیت کرتے ہوئے بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق روا نہ رکھیں۔ بچیوں پر سختی نہ کریں کیوں کہ یہ بچیاں چند روز کی مہمان ہوتی ہیں پھر کیا معلوم آگے ان کی تقدیر میں کیا لکھا ہو۔ ان کی بے فکری اور آزادی کا وقت یہی دن ہیں جو میکے میں گزرتے ہیں اور اگر یہ عرصہ بھی ان کا رنج

اور مصیبت میں گزرے تو ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بدنصیب نہیں۔ تہذیب اور علم کے دعوے دار بڑے بڑے خاندان بھی لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کو نہیں پوچھتے۔ جیسی خاطر مدارات بیٹوں کی کی جاتی ہے بیٹیوں کی نہیں ہوتی۔ کھانے پینے کی اچھی چیزیں مائیں بیٹوں کو دے کر بیٹیوں کو ویسے ہی سمجھا بجھا کر چپ کرا دیتی ہیں۔ جب کہ بیٹیاں زیادہ خدمت گزار اور اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ علامہ نے ماؤں کو خبردار کیا کہ روز حشر انھیں بیٹیوں کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ [۱۷]

''ہماری بیٹیاں'' کے عنوان سے مضمون میں علامہ اپنے درد بھرے انداز میں طبقۂ نسواں سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زمانہ جتنی بھی ترقی کر جائے ہمارے لوگوں کی سوچ نہیں بدل سکتی۔ پرانے زمانے میں بیٹیوں سے کتنا ہی بڑا قصور اور کیسا ہی زبردست نقصان ہو جاتا مگر ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ گھر کا کوئی مرد باپ یا بھائی بیٹی کو ہاتھ لگائے۔ بیٹیاں ایک خاص وقت تک کے لیے ماں باپ کے گھر مہمان ہوتی ہیں۔ اگر یہاں بھی باپ اور بھائیوں کی مار کھائیں اور سسرال جا کر بھی ساس نندوں کے طعنے اور شوہر کا غصہ اور مار سہیں تو ان کی زندگی تو سوہانِ روح ہوگی۔ میکے میں باپ اور بھائی ذرا ذرا سی بات پر بیٹیوں کو پیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ علامہ نے اس کی تمام تر ذمہ داری ماؤں پر ڈالی جو اپنے سامنے شوہروں اور بیٹوں سے بیٹیوں کو مار کھاتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ انھوں نے ماؤں کو تلقین کی کہ بیٹیوں کو سزا دیں، ڈانٹیں جو کچھ بھی کریں مائیں خود کریں، باپ اور بھائی سے ان کی شکایت نہ کریں۔ [۱۸]

مِس ایس۔ جے۔ عارف نے ''دلہن بننے والی لڑکیوں پر ظلم'' کے عنوان سے مضمون میں غیر شرعی رسومات پر تنقید کی۔ شادی طے ہوتے ہی دلہن کو ایک تنگ کوٹھری میں مایوں بٹھا دینا، اردگرد ہر وقت خواتین کا ایک ہجوم ہونا، نکاح کے وقت بارعب انداز میں ہاں کہلوانا، سر اور گردن جھکائے رکھنا اور اسی طرح کی بیسیوں فضول رسومات محض ہندوانہ تقلید ہیں، مذہب اسلام میں یہ مطلق جائز نہیں۔ اس طرح کی رسومات سے دلہن کو بہت تکلیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ اول تو کوٹھری میں گھٹے ہوئے ماحول میں میٹھا کھاتے کھاتے کمزوری بڑھ جاتی ہے، تازہ ہوا نہ ملنے سے چہرہ زرد ہو جاتا ہے اور دلہن

بننے کے بعد مہینوں کمر و گردن جھکائے کونے میں بیٹھے رہنے سے سر و کمر درد کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ مصنفہ نے ان رسومات کی سختی سے مخالفت کرتے ہوئے خواتین کو ان سے چھٹکارا پانے کا مشورہ دیا۔ [19]

علامہ راشد الخیری نے ''رواج'' کے عنوان سے مضمون میں طبقۂ نسواں سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے دیہاتوں کے اس رواج پر کڑی تنقید کی جس کی رُو سے خواتین کو ترکے سے محروم کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے مسلمان مردوں پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ مذہب کو انھوں نے اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ ایک سے زیادہ نکاح سنت نبویؐ کی آڑ میں اپنے لیے جائز قرار دیتے ہیں اور فرائض کی ادائیگی کے وقت اسلام کے اصولوں کے برخلاف خواتین کو ترکے سے محروم کر دیتے ہیں۔ علامہ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ اسلام میں خواتین کی وقعت ہر مذہب سے زیادہ ہے لیکن مسلمان مرد ہی خواتین کے حقوق غصب کر کے ان کو حقیر سمجھنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ [20]

علامہ راشد الخیری نے ''عورت کی تحقیر'' کے حوالے سے مضمون میں مسلمان مردوں کی نفس پرستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بقائے نسل انسانی کی دنیا میں موجودگی اللہ کی منشا پر منحصر ہے لیکن مسلمان مردوں نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھ لیا ہے اور جہاں نکاح کی تھوڑی مدت گزرنے کے بعد بچہ نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں بیوی سے نیت بھر جاتی ہے تو اولاد نہ ہونے کو جواز بنا کر دوسرا نکاح کر لیتے ہیں۔ علامہ نے اولاد نہ ہونے میں صرف عورت نہیں مرد کو بھی ذمے دار ٹھہرایا اور بلا جواز دوسری شادی کو عورت کی تحقیر اور سخت ظلم قرار دیا۔ [21]

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ نے ''تقریر حقوق نسواں'' میں کسی قوم کی ترقی کو اس قوم کی خواتین کی ترقی سے مشروط کرتے ہوئے کہا کہ مسز سروجنی نائڈو بھی مردوں کے لیے لڑ رہی ہیں۔ خواتین کے لیے صرف علامہ راشد الخیری اور مولوی ممتاز علی صاحب کام کر رہے ہیں۔ مصنفہ نے مولانا شوکت علی کے رسائل کامریڈ، ہمدرد کے اجرا، انجمن خدام کعبہ اور مسلم لیگ کے قیام کو بھی مردوں کے لیے فائدہ مند قرار دیا۔ انہوں نے تمام بڑے سیاست دانوں حکیم اجمل خاں صاحب، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، مدن موہن مالوی اور لالجپت رائے وغیرہ سے سیاست کی بجائے

طبقۂ نسواں کی ترقی، تعلیم و آزادی کے لیے کام کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے ہندستانی لڑکیوں کی کم سنی کی شادی ختم کرانے، شادی سے قبل ان کی رائے لینے، بیوہ خواتین کی دوسری شادی کرنے اور مسلمان خواتین کو پردہ میں رہ کر کام کرنے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا۔ [۲۲]

۱.۳۔ جوازِ تعلیم نسواں بحوالۂ تاریخ

''مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم'' کے عنوان سے سہروردیہ بیگم صاحبہ نے قسط وار مضامین کا سلسلہ شروع کیا جس میں جوازِ تعلیم نسواں پیش کرنے کے لیے تاریخی پہلو سے خواتین کی تعلیم پر بحث کی گئی۔ تاریخی معلومات کے ذریعے انھوں نے بتایا کہ مسلمان خواتین کی تعلیم کے لیے پرانے زمانے میں اسلامی ممالک میں کیا کیا اہتمام تھا اور ملکی رسم و رواج کی پابندی کو نہ پڑھنے کا جواز نہیں بنایا جاسکتا۔ اگر دلی شوق ہو تو خواتین رسم و رواج کی پابندی کرتے ہوئے بھی علم حاصل کرسکتی ہیں۔ سہروردیہ بیگم صاحبہ نے اپنی تحقیق کی روشنی میں یہ بتایا کہ اشاعتِ اسلام کے بعد ترویجِ دین کے خیال سے تعلیم نسواں اتنی اہمیت کی حامل ہوگئی تھی کہ خود بانیِ اسلام حضرت محمدؐ نے اس کا ذمہ لیتے ہوئے صحابہ کرامؓ میں سے کچھ لوگ ایسے مقرر کیے جو مسلمانوں کے گھروں میں جا جا کر خواتین کو قرآن اور علمِ حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس طرح مذہبی تعلیم کے نام سے اسلام میں تعلیمِ نسواں کا رواج پہلے پہل شروع ہوا۔ مصنفہ کے مطابق دائرہ اسلام پھیلنے کے ساتھ علوم و فنون کی مختلف شاخیں نکلیں تو اس زمانے کے فضلا ''باب العلم'' حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ وغیرہ اپنے علم سے دوسروں کو مستفیض کرنے کی غرض سے مساجد میں علومِ الٰہیات، فلسفہ و طبیعیات وغیرہ پر بحث و مباحثہ کرنے لگے اور سامعین میں زن و مرد دونوں شامل تھے۔ مساجد میں علمی مجالس کا انعقاد اور خواتین کی شرکت کا دستور تابعین اور تبع تابعین کے زمانے تک جاری رہا۔ بنوامیہ کے خلیفہ دوم ولید اور ہشام کے دور میں خواتین نہ صرف دینیات اور علم حدیث میں کمال رکھتی تھیں بلکہ ادب، عروض، بلاغت، فلسفہ اور خطاطی میں بھی ماہر تھیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں مستورات کے لیے زنانہ مدارس بکثرت قائم کیے گئے چنانچہ صلاح الدین کی بہن خدیجہ یا زمرّد خاتون نے ایک اعلیٰ زنانہ مدرسہ ''المدرسہ الست الشام'' دمشق میں قائم کیا۔ اس کے علاوہ دمشق میں دو اور زنانہ مدارس والدۂ خلیفہ ناصرالدین اور صلاح الدین

کی بھتیجی عذرا نے قائم کیے۔ ان کے علاوہ زینیہ، علیہ، رواحیہ، نوریہ، عزیہ کئی دارالعلوم اس وقت ایسے بھی تھے جن میں تعلیم نسواں کے لیے الگ الگ شعبے قائم تھے۔ عبدالرحمٰن سوم اور ان کے بیٹے الحاکم کے عہد سلطنت میں تعلیم نسواں اپنے پورے عروج پر تھی اور غرناطہ، قرطبہ، اندلس اور اشبیلیہ میں بہت سی مشہور تعلیم یافتہ خواتین نے اپنے علم و فضل سے خواتین کو مستفید کیا۔ قسطنطنیہ میں بھی سلطان سلیمان کی ملکہ اور سلطان سلیم کی والدہ اور دیگر علم دوست خواتین کے قائم کیے ہوئے مدارس اور تعلیم گاہیں تھیں۔ مصنفہ کے مطابق ہندُستان میں ہندوؤں سے اختلاط کی بدولت مسلمانوں میں بھی خواتین کو جاہل رکھنے کا رواج تھا۔ تاہم شمس الدین التمش بادشاہ دہلی نے اپنی بیٹی بلقیس جہاں (رضیہ سلطانہ) کو مردوں کی مانند اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ مصنفہ نے بمبئی کی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان خواتین مسز علی اکبر صاحبہ، مس فیضی صاحبان، ممتاز جہاں بیگم اور آبرو بیگم کو بمبئی کی وجہِ شہرت قرار دیا۔ اور امید ظاہر کی کہ آنے والے وقتوں میں تعلیم نسواں کا مستقبل روشن ہوگا۔ [۲۳]

دختر صاحبزادہ عبدالمجید خاں نے تعلیم نسواں کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ''بدرالنساء بیگم'' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ بدرالنسا بیگم شہنشاہ عالمگیر کی پانچویں بیٹی تھیں جو ۱۰۵۷ء میں پیدا ہوئیں۔ بادشاہ عالمگیر مذہب کا بہت پابند اور قرآن پاک کا عاشق تھا۔ شہزادی کی تعلیم کے لیے مذہبی علوم سے واقف ایک معلّمہ کو ان کے لیے مقرر کیا۔ دو سال کی عمر میں بدرالنّسا بیگم نے قرآن حفظ کر لیا۔ عربی زبان پر دسترس حاصل کرنے کے بعد تمام رسمی علوم و فنون ترک کر کے وہ اپنا تمام وقت قرآن پاک، حدیث اور فقہ کی کتابوں میں صرف کرنے لگیں۔ بادشاہ عالمگیر ان کے اس زہد، عبادت، ریاضت اور عالمانہ تقاریر سے بہت خوش تھا۔ ۲۳ برس کی عمر میں ۱۰۸۰ء میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔ تاریخ سے خواتینِ اسلام کی تعلیم کے ایسے واقعات بلاشبہ تعلیمِ نسواں کے سلسلے میں ایک اہم پیش رفت ثابت ہو رہے تھے۔ [۲۴]

مسز ایچ فیضی صاحبہ (والدۂ ماجدہ مس زہرہ فیضی صاحبہ اور مس عطیہ فیضی صاحبہ) نے خواتین میں حصولِ تعلیم کے شوق کو مزید جلا بخشنے کے لیے فلارنس نائٹنگل جیسی ممتاز خاتون کے مختصر حالات ترجمہ کر کے عصمت کے لیے بھیجے تا کہ ان کے حالات سے سبق حاصل کر کے خواتین اپنی مخفی

صلاحیتوں کو سامنے لاسکیں۔ بنی نوع انسان کی ہمدردی میں اپنی عمر وقف کرنے والوں میں انگلستان کی مشہور مخیرّ مس فلارنس نائٹنگل کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہیں دنیا کی سب سے پہلی نرس ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ محترمہ فلارنس نائٹنگل نہ صرف اپنی زبان بلکہ غیر ملکی زبانوں فرانسیسی، جرمن، اطالین، لاطینی اور یونانی زبانوں میں بھی کامل مہارت رکھتی تھیں۔ دیہات کے مکاتب میں خود جا کر بچوں کو تعلیم دیتی تھیں اور شفاخانوں میں مریضوں کی نگرانی اور تیمارداری میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں۔ ۲۰۔۲۰ گھنٹے مسلسل کام میں مصروف رہتی تھیں۔ صبر و تحمل، بردباری، خوش مزاجی، ظرافت سب خاصیتوں سے مالامال تھیں۔ انھوں نے تمام تر آسائشیں مہیا ہونے کے باوجود انسانیت کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ یقیناً ہندُستانی خواتین کے لیے ایسی خواتین کے حالاتِ زندگی مشعل راہ کا کام دے رہے تھے جس کی روشنی میں وہ اپنی زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دے سکتی تھیں۔ [۲۵]

محترمہ ذکیہ صاحبہ نے ''مذہب اور عورتوں کی تعلیم'' کے عنوان سے مضمون میں مذہب کے انسانی زندگی میں نمایاں کردار کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اسلام کی رو سے تعلیم نسواں ضروری ہونے کے باوجود مسلمانوں کے سیکڑوں خاندان تعلیم کے موضوع پر بات کرنا بھی ناگوار سمجھتے ہیں، اور خواتین کے جاہل رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جب کہ بانیِ اسلام حضرت محمدؐ نے جس طرح مردوں کی تعلیم پر زور دیا، اسی طرح خواتین کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا۔ مصنفہ نے قرآن پاک کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کلام مجید میں جس قدر تعلیم کے متعلق احکامات آئے ہیں خواتین سے بھی اسی طرح خطاب کیا گیا ہے جس طرح مردوں سے۔ انھوں نے قرآن پاک کی اس آیت کا حوالہ دیا:

> ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اچھی بات کا حکم کرتے ہیں اور بری بات سے منع کرتے ہیں۔ [۲۶]

اس آیت کی رو سے خواتین پر بھی لازم ہے کہ وہ دوسروں کو اچھی باتیں سکھائیں اور بری باتوں سے روکیں لیکن یہ اس وقت ممکن ہوگا جب خواتین خود مذہب کی عالم ہوں۔

مصنفہ نے حضرت عائشہؓ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ صحابہ کرامؓ کو جب بھی کسی مسئلے میں شبہ

ہوتا تھا تو وہ ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ مصنفہ نے علم وحکمت کو دل کی غذا قرار دیا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ جب تک طبقۂ نسواں تعلیم یافتہ نہیں ہوگا جاہلانہ رسومات کا خاتمہ بھی ممکن نہیں ہوگا۔

اے۔ ایف صاحبہ نے ''بہنوں کو نصیحت'' مضمون میں ماہنامہ عصمت کو خراج تحسین پیش کیا کہ اس کی بدولت طبقۂ نسواں میں حصول علم کا شوق دو چند ہوگیا۔ مصنفہ نے خواتین کو فضول خرچی سے بچنے، وقت کو رائیگاں نہ کرنے، کسی کو دھوکا اور فریب نہ دینے، انصاف سے کام لینے اور انتہا پسندی کی بجائے اعتدال سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے ہر بات میں صفائی کا خیال رکھنے، شک کو دل میں جگہ نہ دینے، بلاوجہ خفا نہ ہونے اور حلم اور انکساری اپنے اندر پیدا کرنے پر زور دیا۔ مصنفہ نے بادشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں بیگم کی مثال پیش کرتے ہوئے خواتین کو یہ باور کرایا کہ عمدہ تعلیم اور تربیت کی بدولت خواتین اپنی قابلیت اور لیاقت کا لوہا منوا سکتی ہیں۔ ملکہ نور جہاں نے بھی اپنی لیاقت اور تدبیر سے کام لیتے ہوئے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے جو بڑے بڑے عاقل اور مدبر مرد سرانجام نہ دے سکے۔ مصنفہ نے خواتین پر زور دیا کہ انھیں اپنے حالات کے موافق تعلیم حاصل کر کے اپنے مردوں کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ [۲۷]

ہمشیرہ مرزا عبداللہ بیگ نے ''مسلمان خواتین'' کے عنوان سے مضمون میں تعلیم نسواں کی راہ ہموار کرنے کے لیے تاریخ سے مضبوط دلائل دیے ہیں۔ مصنفہ کے مطابق نہ صرف زمانۂ جاہلیت میں بلکہ ظہور اسلام کے بعد بھی طبقۂ نسواں علمی میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ رہا۔ مصنفہ نے تاریخ سے ایسی خواتین کی مثالیں دیں جن کے علمی کارناموں پر ایک دنیا رشک کرتی تھی۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو زمانہ جاہلیت میں ان کے ظاہری اور باطنی کمالات کی وجہ سے ''طاہرہ'' اور قبول اسلام کے بعد حضورؐ کی طرف سے ''کبریٰ'' کا معزز خطاب ملا۔

حضرت فاطمۃ الزہرۃؓ کی ذہانت اور قابلیت پر عرب کے بڑے بڑے علما رشک کرتے تھے۔ آپؓ کے وعظ سے صرف عورتیں ہی فائدہ نہیں اٹھاتی تھیں بلکہ مردوں کا بھی کثیر ہجوم آپؓ کے وعظ سنا کرتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فن شاعری میں کمال رکھنے کے علاوہ معانیِ قرآن سمجھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ سیکڑوں احادیث آپؓ سے مروی ہیں۔ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ آپؓ ہی سے حدیث

کے نکات دریافت کرتے تھے۔شہدہ نامی خاتون (۴۸۳ھ) فن خوشنویسی اور دیگر علوم وفنون میں ماہر ہونے کی وجہ سے ''فخر النساء'' کے لقب سے سرفراز ہوئیں۔ رجب نامی خاتون (۸۱۶ھ) سے علامہ جلال الدین سیوطی نے درس حدیث حاصل کیا اور انھیں اپنے استادوں میں شمار کیا۔گلبدن بیگم جو بابر بادشاہ کی صاحبزادی تھیں انھوں نے ہمایوں نامہ تصنیف کیا۔ گنا بیگم عالمگیر ثانی کے وزیر عماد الملک کی بیوی تھیں، جو باکمال شاعرہ تھیں۔لطیف النساء اردو اور فارسی کی اعلیٰ پائے کی شاعرہ تھیں۔ مصنفہ نے طبقہ نسواں کے تعلیم یافتہ نہ ہونے کا قصور وار خواتین ہی کو ٹھہرایا جو نہ مذہبی فرائض ادا کرتی ہیں، نہ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتی ہیں۔ مصنفہ نے خواتین کو اپنے اندر خوش خلقی، کریم النفسی، منکسر المزاجی پیدا کرنے کی نصیحت کی ہے اور کام کو وقت پر انجام دینے، نماز پنجگانہ ادا کرنے، کلام الٰہی کو سمجھ کر پڑھنے اور فرصت کے اوقات میں مذہبی کتب کا مطالعہ کرنے کو اصل لیاقت اور قابلیت گردانا جس سے نہ صرف خاوند بلکہ تمام جہاں ان کا گرویدہ ہوسکتا ہے۔ [۲۸]

ہدایت اللہ شیدا صاحب نے ''خواتین مغلیہ کی علمی فیاضیاں'' مضمون میں علم کے فروغ میں خاندان مغلیہ کے کردار اور خدمات کو سراہا۔ مسلمان فرمانرواؤں نے نادر ونایاب کتابیں لکھوائیں، بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے، قدیم کتب کے فارسی تراجم کرائے اور ان سے اپنے کتب خانوں کی زینت بڑھائی۔ سلاطین مغلیہ کے علاوہ خواتین مغلیہ میں بھی علمی قدر دانی کا بے انتہا شوق تھا۔ سلیمہ سلطانہ بیگم ہمایوں کی بہن تھیں۔ نہایت شیریں کلام اور حاضر جواب تھیں۔ مطالعہ کی بے حد شوقین تھیں اور اہل سخن کی قدر دانی میں مشہور تھیں۔

گلبدن بیگم بھی ہمایوں کی بہن تھیں ان کی تصنیف ہمایوں نامہ میں بابر اور ہمایوں بادشاہ کے عہد کے تاریخی واقعات درج ہیں۔ نور جہاں بیگم اور ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کی علمی فیاضیاں مشہور تھیں۔ جہاں آرا بیگم شاہجہاں اور ممتاز محل کی بڑی صاحبزدی مونس الارواح کی مصنف تھیں۔ جس میں انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی الاجمیریؒ کا ذکر خیر کیا ہے۔ آگرہ کی جامع مسجد میں انھوں نے مدرسہ بھی قائم کیا۔ شہنشاہ عالمگیر کی بیٹی زینب النسا بیگم خاندان مغلیہ کی خواتین میں سب سے زیادہ علم دوست تھیں۔ علما، فضلا اور شعرا کی قدر دانی میں اپنی کل آمدنی صرف کر دیتی تھیں۔

اس شہزادی نے ہندستان کے مختلف مقامات اور ایران وتوران سے نادرونایاب کتابوں کی نقول صرف کثیر خرچ کر کے منگوا کر ایک بے نظیر کتب خانہ قائم کیا۔ کشمیر کا کاغذ بہت اچھا تھا لہٰذا وہاں سے کتابت ہو کر کتابیں دہلی آتی تھیں۔ زیب النسا بیگم کے حکم سے ملا محمد شفیع الدین اور ملا عنایت احمد نے قرآن مجید کی ایک تفسیر لکھ کر اس کو زیب التفاسیر کے نام سے موسوم کیا۔ خاندان مغلیہ کی خواتین کی علمی قدر دانی جیسے مضامین طبقۂ نسواں کے لیے تعلیم کی اہمیت کو اور ضروری قرار دے رہے تھے۔ [۲۹]

سیدہ اصغری بیگم نے ''تعلیم نسواں'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین کی تعلیم کو صرف، حدیث اور فقہ کے مسائل تک محدود کرنے کی مخالفت کی اور تاریخ سے ایسی خواتین کی مثالیں پیش کیں جو مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتی تھیں۔ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ بہت بڑی شاعرہ تھیں، شہنشاہ ہند اورنگ زیب کی دختر زیب النساء بہت لائق فائق خاتون تھیں، سلطان مصطفیٰ کی سیکرٹری ایک خاتون پرلیشک خانم تھیں۔ مصنفہ نے امید ظاہر کی کہ مشنری خواتین مسلمان خواتین سے اسی طرح فیض پا سکتی ہیں جس طرح مسلمان علما سے غیر مذہب اور ملت کے لوگوں نے فیض پایا۔ انھوں نے خواتین کو ترغیب دی کہ جس طرح ۶۸۴ھ میں سلطان ملک طاہر کی دختر نے دارالسلطنت مصر القاہرہ میں ایک کالج نسواں قائم کیا تھا اسی طرح خواتین بھی تعلیم نسواں کے لیے چندہ جمع کر کے کالج قائم کر سکتی ہیں۔ [۳۰]

ہر ہائنس سلطانہ جہاں بیگم صاحبہ تاج الہند کی ''تقریر'' کو عصمت میں شائع کیا گیا تاکہ تعلیم نسواں سے متعلق ان کے خیالات سے عصمت کے قارئین بھی آگاہ ہو سکیں۔ فرماں روائے بھوپال نے اپنے سفر انگلستان کے دوران وہاں کے باشندوں کے اخلاق ومتانت، آزادیِ وطن کی محبت، تہذیب وبلند حوصلگی اور مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردی کو تعلیم یافتہ ماؤں کی گود میں پرورش پانے کا ثمر قرار دیا۔ آغوش مادر کی یہ تربیت گاہیں مزدوروں کے گھروں سے لے کر امرا اور بادشاہوں کے محلوں تک موجود ہیں۔ تعلیم یافتہ مائیں حفظ صحت کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر بچوں کی نشوونما کرتی ہیں، ابتدا سے ان کو جھوٹ سے نفرت، انسانوں کے ساتھ بھلائی کرنے، ملک اور قوم سے محبت، چھوٹوں سے شفقت، بڑوں کے ادب، عالی حوصلگی اور بلند ہمتی کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہ تعلیم جو مہد سے شروع ہوتی ہے لحد تک اس کا اثر قائم رہتا ہے۔ مصنفہ نے خواتین کو تعلیم کی طرف مائل ہونے،

غریبوں کی مدد کرنے، خواتین کی تعلیمی مدد کرنے، فضول تقریبات اور اخراجات کی بجائے زنانہ اسکول، کلب اور طبقۂ نسواں کے رسائل و اخبارات کی مدد کرنے کو کہا اور تمام کامیابیوں اور ترقیوں کا سنگِ بنیاد تعلیم نسواں کو قرار دیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے خواتین کو پابند طریق اسلام رہنے کا کہا اور یورپ کی سی آزادی کو خطرناک قرار دیا۔ [۳۱]

حامد اللہ افسر نے ''امۃ العزیز زبیدہ'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین کے لیے جواز تعلیم نسواں پیش کرتے ہوئے خلیفہ جعفر بن منصور کی بیٹی اور خلیفہ ہارون رشید کی چہیتی بیوی زبیدہ کی مثال دی جنھوں نے اپنا بھاری سرمایہ تقریباً ۷ لاکھ دینار رفاہِ عامہ کے کاموں میں کشادہ دلی سے صرف کیے۔ نہریں، کنویں، مسجدیں، سرائیں، حج اور زکوٰۃ کے کارنامے ہمیشہ تاریخ کے اوراق پر روزِ روشن کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔ نہر زبیدہ اور قناطرہ زبیدہ آج بھی ان کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کی خدمت میں سو حافظ قرآن لونڈیاں رہتی تھیں اور ہر لونڈی روزانہ کلام پاک کی ایک منزل سناتی تھی۔ جدت پسند طبیعت کی بدولت آرام پالکی، جڑاؤ جوتے اور جڑاؤ کمر بند انھوں نے ہی ایجاد کیے۔ زبیدہ جدت پسند شاعرہ تھیں اور اکثر منظوم خطوط ہارون رشید کو بھیجا کرتی تھیں۔ تاریخ کی ایسی مثالیں خواتین ہند میں حصول تعلیم کی ترغیب پیدا کرتی تھیں۔ [۳۲]

محترمہ ذکیہ صاحبہ نے ''تعلیم نسواں'' مضمون میں معاشرے کی اس سوچ کو غلط قرار دیا کہ حصول تعلیم سے خواتین خراب ہو جائیں گی۔ انھوں نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر علم انسان کی اصلاح کرتا ہے تو عورتوں پر وہ الٹا اثر کیوں ڈالے گا؟ اگر کچھ مخرب اخلاق کتابیں ہیں تو وہ خواتین کے ہاتھوں میں نہ دی جائیں۔ علم سیکھنا مرد عورت دونوں پر فرض ہے اور جو قوتیں اور صلاحیتیں حصول علم کے لیے ضروری ہیں وہ مرد عورت سب میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ بھی صرف شیطانی وسوسوں کی بنیاد پر خواتین کو تعلیم دینے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے پڑھ لکھ کر وہ غیر مردوں سے خط و کتابت کریں گی جس سے ان کی پاکدامنی اور پردہ داری پر حرف آئے گا۔ جبکہ ایک معمولی عقل والا انسان بھی علم کو انسان کی اصلاح، عقل کی جلا، رب اور رسول کی پہچان اور ایمان کے استحکام کا باعث بتائے گا۔ مصنفہ نے اس خیال کو بھی غلط قرار دیا کہ خواتین کے لیے صرف قرآن پاک کی تعلیم کافی

ہے۔انھوں نے تاریخ سے حضرت عائشہؓ اور حضرت عقیفہؓ کی مثال پیش کی کہ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے حضرت عقیفہؓ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو بھی لکھنا سکھاؤ۔ مصنفہ نے تعلیم نسواں کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم یافتہ خواتین نہ صرف خود دین و دنیا کے معاملات کی اصلاح کرتی ہیں بلکہ اپنے مردوں کو بھی نیک صلاح اور مشورہ دیتی ہیں۔ اور اپنے خاوند کے ادب، قاعدہ، نشست و برخاست اور اطاعت کا خیال رکھتی ہیں۔ اس طرح اللہ کے ساتھ ساتھ ان کا خاوند بھی ان سے خوش اور راضی ہوتا ہے۔ اس لیے اگر خواتین کو نیک اور قابل بنانا ہے تو حصول علم سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔ ۳۳

مسز تقی نے ''کیا عورتوں کی تعلیم ضروری نہیں'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین کو علم سے محروم رکھنے کو مردوں کی خود غرضی قرار دیا اور جواز تعلیم نسواں پیش کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم نسواں خواتین کے امور خانہ داری میں مخل نہیں ہوسکتی اور معمولی علم طب سے واقفیت خواتین کے لیے نہایت ضروری ہے۔ تعلیم نسواں ہی کی بدولت خواتین اپنے شوہروں کی بہترین رفیق اور اپنے بچوں کی بہترین تربیت کی ضامن بن سکتی ہیں۔ مصنفہ نے تاریخ کے حوالے دے کر خواتین کے لیے حصول تعلیم کو ناگزیر قرار دیا۔ زیب النساء بیگم حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے مروجہ علوم سے واقف تھیں، خط نستعلیق، نسخ، شکستہ، گلزار وغیرہ سبھی میں مہارت رکھتی تھیں۔ شاعری میں ملکہ حاصل تھا۔ نور جہاں نے حقیقت میں بادشاہ جہانگیر کی سیاست اپنے ہاتھوں میں لی، رضیہ سلطانہ نے ساڑھے تین برس کی حکومت میں وہ رعب و دبدبہ قائم کیا کہ مردوں کے بھی چھکے چھوٹ گئے۔ ممتاز جہاں کی موت نے شاہجہاں کی تمام خوشیاں پامال کر ڈالیں۔ یہ سب وہ خواتین تھیں جنھوں نے اپنی قابلیت و لیاقت سے دنیا پر راج کیا۔ لہٰذا آج بھی مسلمانوں کی ترقی کا راز تعلیم نسواں کے فروغ میں پوشیدہ ہے۔ ۳۴

بنتِ محمود الحسن نے ''مستورات کو تعلیم کی ضرورت'' کے عنوان سے مضمون میں عورت کو گھر کی ملکہ قرار دیتے ہوئے امور خانہ داری خوش اسلوبی سے چلانے کے لیے حصول تعلیم کو اس کے لیے ضروری ٹھہرایا۔ انھوں نے تعلیم کو تمام زیورات سے قیمتی زیور قرار دیا اور بغیر تعلیم کے انسان کو مثل حیوان قرار دیا۔ خواتین کو ناقص العقل کہنے والے مرد حضرات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب خود مرد بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کر کے خواتین کو علم سے محروم رکھیں گے تو

جاہل خواتین کی عقل کہاں تک ان تعلیم یافتہ مردوں کی عقل کا ساتھ دے گی۔ اگر عقل کا موازنہ کرنا ہے تو مردوں اور عورتوں کو یکساں تعلیم دے کر یہ موازنہ کیا جائے کہ کس کی عقل کم ہے۔ خواتین کو تعلیم دے کر ناقص العقلی کا مہلک مرض ان سے دور کیا جا سکتا ہے۔ [۳۵]

وا۔ح۔د۔س۔ محمد نظام الدین خاں ''لڑکیوں کی تعلیم'' کے عنوان سے مضمون میں تعلیم نسواں کا جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تعلیم کی بدولت خواتین اپنے خالق کی معرفت حاصل کریں گی، گناہ سے بچیں گی، برائی سے پرہیز کریں گی، ایمان کو ایمان، عزت کو عزت، بڑوں کو بڑا اور چھوٹوں کو چھوٹا سمجھیں گی۔ ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہے۔ ماں سے بچے جو سنیں گے اسی کو سچ جانیں گے، جو دیکھیں گے وہ سیکھیں گے اور اگر ماں کی یہ حالت ہو کہ نہ اللہ رسولؐ کا پتہ، تہذیب سے کوسوں دور، جہالت میں چکنا چور، عقل نہ شعور ہو تو ایسی ماں سے بچے کیا اثر قبول کریں گے۔ ماں کی گود کی تربیت ہی ان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مصنفہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ خواتین کا نصاب تعلیم بھی مردوں کی طرح ہی ہونا چاہیے۔ [۳۶]

شہر بانو صاحبہ ''عہد مغلیہ میں عورتوں کی حالت'' کے عنوان سے مضمون میں بابر بادشاہ کی بیٹی گلبدن بیگم کی کتاب ہمایوں نامہ کے حوالے سے لکھتی ہیں کہ اس کتاب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں خواتین کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ بابر بادشاہ اپنی بیگم ماہم کے کابل سے ہندستان آنے پر خود ان کے استقبال کے لیے گیا۔ خواتین سے خاندانی اور سیاسی امور پر بھی رائے لی جاتی تھی اور موسیقی میں بھی خواتین گہرا شغف رکھتی تھیں۔ شہسواری اور فنون سپاہ گری سے بھی واقف ہوتی تھیں اور شادی بیاہ کے معاملے میں بھی انھیں اظہار رائے کی آزادی تھی۔ ہمایوں کی بیوی حمیدہ بیگم نے پہلے ان سے عقد کرنا منظور نہیں کیا بعد میں کافی غور و فکر کے بعد شادی کی ہامی بھری۔ خواتین علم و فضل میں بھی اپنا لوہا منواتی تھیں۔ زیب النساء اور گلبدن بیگم نہ صرف خود عالمہ تھیں بلکہ اشاعت علم کی طرف بھی بھرپور توجہ دیتی تھیں اور علما کی سرپرستی کرتی تھیں۔ گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ چھوٹے فقروں، بے تکلف الفاظ، روزمرہ عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی اور واقعات کی اہمیت کے پیش نظر ان کے اختصار اور تفصیل کے باعث کسی بھی معروف مؤرخ کی کتاب سے کم نہیں۔ مغلیہ عہد کی خواتین کی یہ

تصویر یقیناً اس دور کے مسلمانوں کے لیے تعلیم نسواں کا مضبوط جواز پیش کر رہی تھی۔[۳۷]

۴.۱۔ نصابِ تعلیمِ نسواں

محترمہ سیّدہ صاحبہ نے ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے عنوان سے مضمون میں نصابِ تعلیم نسواں کے حوالے سے یہ تجویز پیش کی کہ خواتین کے لیے جو بھی نصاب طے کیا جائے گا مذہبی اور ادبی تعلیم اس کا جزو اعظم ہوگا۔ عصمت خواتین کے لیے مذہبی ادبی کتابیں شائع کرے گا ہی تو کیوں نہ اس بڑے کام کی ابتدا کسی ایسی کتاب کی اشاعت سے کی جائے جو مذہبی لحاظ سے مستند ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی حیثیت سے بھی سند ہو یعنی ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے مصداق ہو۔ مصنفہ کے مطابق مذہبی اعتبار سے کلام پاک سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں اور ادبی حیثیت سے اسی کلام پاک کا ڈپٹی نذیر احمد کا بے مثال ترجمہ، ٹکسالی اردو، شستہ زباں اور قرآن پاک کے دقیق مضامین کو اپنے روزمرہ میں ادا کرنے کے باعث بے نظیر ہے۔ محترمہ نے یہ تجویز پیش کی کہ مولوی نذیر احمد صاحب سے اجازت لے کر قرآن پاک کا صرف ترجمہ ہی بلا متن کے بے کم و کاست اسی ترتیب سے مع پاروں، سوروں کے نام اور رکوع ربع وغیرہ کے نشان کے بے تغیر و تبدل، تقدّم و تاخّر کے ادارۂ عصمت چھاپنا شروع کر دے۔ البتہ اتنی ترمیم ضرور کر دے کہ اس ترجمے کے جو جملے خالصتاً محاوروں سے متعلق ہیں ان کا مطلب حواشی میں کھول کر بیان کر دیا جائے تاکہ جو خواتین ان محاورات کے مطالب اور موقع محل سے ناواقف ہیں وہ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس طرح یہ ترجمہ اردو ادب میں خالص ادبی حیثیت کا حامل ہو جائیگا اور مسلمان اور دوسرے مذاہب کی خواتین بھی اس کا مطالعہ کر سکیں گی۔ ادارہ عصمت نے مصنفہ کی اس تجویز کو سراہا لیکن علما کی اجازت کے بغیر یہ ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔[۳۸]

عصمت کے ستمبر ۱۹۰۸ کے شمارے میں دختر ان سید محمد شاہ صاحب نے محترمہ سیدہ صاحبہ کی تجویز قرآن مجید کا اردو ترجمہ چھاپنے کا خیر مقدم کیا۔ اور خواتین کے لیے اسے بہت مفید قرار دیا کیوں کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اکثر خواتین مذہب سے لاعلم ہی ہوتی ہیں اور مذہبی بحث مباحثہ میں شریک ہونا تو در کنار وہ مذہب کے اصولوں اور بنیادی تعلیمات سے ہی آگاہ نہیں ہوتیں۔ دختر ان سید محمد شاہ صاحب نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مسلمان خواتین کی ایک خاص انجمن قائم ہونی چاہیے جس

میں موجود خواتین جمعے کو یا مہینے کے پہلے یا آخری جمعے کو مل کر نماز ادا کریں اور اس کے بعد باری باری مذہبی تعلیمات پر درس دیا کریں۔ اس طرح خواتین میں دینی کتابوں کے مطالعے کا رجحان پیدا ہوگا اوران کی مذہبی تعلیم وتربیت کا بھی خاطر خواہ انتظام ہو جائے گا۔ [۳۹]

''نہ خرمانہ ثواب'' کے عنوان سے مضمون میں بیگم فیروز الدین نے محترمہ سیدہ صاحبہ کی تجویز کی سختی سے مخالفت کی اور اس سلسلے میں پرزور دلائل دیے۔ مصنفہ کے مطابق قرآن پاک کا بغیر عربی متن کے صرف اردو ترجمہ چھاپنے سے وہ اردو کا قرآن مشہور ہو جائے گا۔ کوئی مرزا حیرت صاحب کے ترجمہ قرآن ایسی کتاب مرتب کر لے گا، کوئی مولوی معشوق الٰہی صاحب اور کوئی فیروز الدین ڈسکوی صاحب کے ترجمہ قرآن سے ایسی کتاب مرتب کر لے گا، یہ سب اپنی اپنی جگہ اردو کا قرآن کہلائیں گی لیکن مختلف تراجم کی وجہ سے پڑھنے والے کو ترجمہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فرق معلوم نہیں ہو سکے گا۔ اس طرح اختلاف بہت بڑھ جائے گا۔ اس کے علاوہ عربی الفاظ پڑھنے پر جو نیکیاں ملتی ہیں ترجمے کی صورت میں اس سے محروم ہو جائیں گے۔ اردو قرآن سے مانوس ہونے کے بعد عربی قرآن سے تعلق گھٹتا جائے گا۔ یہ وجوہات مصنفہ کی دینی بصیرت کی آئینہ دار تھیں۔ [۴۰]

''اسلامی خواتین'' کے عنوان سے مضمون میں جناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب دہلوی نے قوم کے بزرگوں اور تعلیم کے رہنماؤں کو تعلیم نسواں سے متعلق نہایت بیش قیمت مشوروں سے نوازا۔ انھوں نے خواتین کو مشورہ دیا کہ پہلے وہ اپنے اسلامی خیالات کو مضبوط کریں، اسلامی شعار کو محفوظ کریں اس کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کریں تاکہ اپنے قومی اور دینی شعار سے دور نہ ہو جائیں۔ مصنف نے خواتین کو نصیحت کی کہ انہیں عادات و خصائل، تمدن اور معاشرت سے ہندُستان کی مسلمان خواتین ہی نظر آنا چاہیے لیکن ساتھ ساتھ یورپ کی مفید اور کارآمد باتیں سیکھنے میں بھی قدامت پرستی یا تعصب کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اپنے لیے مفید علوم اور صنعتوں کو سیکھ کر نہ صرف ترقی کی راہوں پر گامزن ہوں گی بلکہ ان ذمائم سے بھی دور رہیں گی جن میں یورپ کی تعلیم یافتہ خواتین مبتلا ہیں۔ [۴۱]

محترمہ سروری صاحبہ نے مضمون ''علمِ اخلاق'' میں استقلال، صبر اور خوش مزاجی جیسی

خصوصیات اپنے اندر پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ ان تینوں خصوصیات کو انھوں نے حصول علم کے لیے زادِ راہ قرار دیا ہے۔ مصنفہ نے مرد حضرات سے درخواست کی ہے کہ وہ طبقۂ نسواں کی اصلاح اور بہبود کے لیے تدابیر سوچیں اور تعلیم نسواں کے لیے انجمنیں قائم کریں، مدارس کی بنیاد ڈالیں اور خواتین کی ترقی کی راہ میں مانع رکاوٹوں کو دور کریں تاکہ خواتین تیزی کے ساتھ علمی، اخلاقی، تہذیبی اور صنعتی لحاظ سے ترقی کر سکیں۔ انھوں نے دلی جیسے عظیم الشان شہر میں ایک بھی مدرسۂ نسواں نہ ہونے پر افسوس اور دکھ کا اظہار کیا اور مردوں کو یہ باور کرایا کہ طبقہ نسواں کی ترقی کے بغیر تن تنہا وہ کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تاوقتیکہ وہ تعلیم نسواں کا خاطر خواہ سامان نہ کر لیں۔ [۴۲]

نواب بیگم آف سچین نے ''اخلاق'' کے عنوان سے مضمون میں علم اخلاق کو تعلیم سے بالکل علیحدہ علم قرار دیا اور اخلاق کو تربیت کا مرہون منت قرار دیا۔ مصنفہ نے علم اخلاق کے لیے محمدی بیگم صاحبہ کی تصنیف آداب ملاقات کو مفید قرار دیا اور میل ملاقات کو علم اخلاق کے لیے ضروری قرار دیا تاکہ مجالس اور محافل میں ملنے جلنے سے اخلاق سے ملنا جلنا آئے۔ صرف خاموشی سے بت بن کر بیٹھ جانے کو انھوں نے اخلاقیات کے منافی قرار دیا۔ [۴۳]

مسز احمد سعید نے ''پردہ اور میل جول'' مضمون میں اس بات کو موضوع بنایا کہ نئی تعلیم اور تہذیب کی تقلید کی راہ میں پردہ کو رکاوٹ قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن کسی بھی چیز کو اچانک سے ختم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بنیادی مسئلہ طبقۂ نسواں کی تعلیم ہے دیگر مسائل یا مباحث پر وقت ضائع کرنے کی بجائے خواتین کی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے۔ خواتین کو باہم اتفاق و اتحاد سے کام لے کر مجالس و محافل کا انعقاد کرنا چاہیے اور اہم علمی مباحث پر گفتگو کرنی چاہیے نہ کہ کپڑوں اور زیورات وغیرہ کو موضوع بحث بنائے رکھیں۔ [۴۴]

سید علی حیدر زیدی ''طریقۂ تعلیم نسواں'' میں نئے تعلیم یافتہ، مغربی تمدن کے دلدادہ لوگوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ معیارِ تعلیم نسواں بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری نہیں۔ بلکہ تعلیم نسواں کا مقصدِ اعلیٰ کاروبار خانہ داری کو سنجیدگی اور کفایت شعاری سے اعلیٰ طریق پر انجام دینا اور اولاد کی بہترین پرورش و تربیت ہے۔ انھوں نے طریقۂ تعلیم نسواں بتاتے ہوئے کہا کہ عمر کو دو حصوں

میں تقسیم کیا جائے تو خواتین کی عمر کا وہ حصہ جو ماں باپ کے گھر گزرتا ہے یعنی ۱۶ یا ۱۸ سال تک کی عمر تک انہیں صرف تعلیم وتربیت حاصل کرنی چاہیے۔اس دوران ماں باپ خواتین کو تہذیب واخلاق کی تعلیم دیں، نیکی کی طرف مائل کریں، نماز کا عادی بنائیں، مذہبی کتب کے ساتھ ساتھ حساب، تاریخ، جغرافیہ پڑھایا جائے، پڑھنے کے ساتھ ساتھ سینا پرونا سکھایا جائے۔ اردو اور فارسی میں اچھی طرح مہارت حاصل کرنے کے بعد قرآن مجید پڑھایا جائے تاکہ کلام پاک کو بامعنی پڑھ اور سمجھ سکیں۔طب یونانی اور ڈاکٹری بھی پڑھائی جائے تاکہ ماؤں کی جن غفلتوں کے نتیجے میں بچے بیمار پڑتے ہیں ان سے بچ سکیں۔ مذہبی واخلاقی تعلیم کی تکمیل کے بعد خواتین جس علم کو جس قدر حاصل کرنا چاہیں، کریں تاکہ اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنا سکیں۔ [۴۵]

سیدہ وحید النساء بیگم رضوی نے ''تعلیم نسواں پر ایک مختصر نوٹ'' کے عنوان سے مضمون میں اس بات پر کلمۂ شکر ادا کیا ہے کہ مسلمان قوم بھی خواب غفلت سے جاگ کر تعلیم کی طرف متوجہ ہوئی ہے۔خواتین اور مردوں کے نصاب تعلیم میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مسلمان قوم کے زمانۂ عروج میں صرف مرد ہی صاحب کمال اور یکتائے علوم وفنون نہیں تھے بلکہ خواتین بھی مردوں کے قدم بقدم رہتی تھیں۔ تاریخ میں مشاہیرِ نسواں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جو علم وکمال میں نظیر نہیں رکھتی تھی۔ مصنف نے روم، مصر اور ایران کی خواتین کو ہندُستانی خواتین سے بدرجہا بہتر قرار دیا کیوں کہ وہ مدیرہ اور نائب مدیرہ کے عہدوں پر فائز ہیں۔مصنفہ نے خواتین کو احساس دلایا کہ خود جاہل رہ کر انگریزی لیڈی ڈاکٹر یا غیر محرم ڈاکٹر سے علاج کروانے کی بجائے ہمیں خود تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر بننا چاہیے اور بحیثیت انسان یہ ہمارا بھی پورا حق ہے کہ ہم بھی علم جغرافیہ، نجوم، ہندسہ، ادب، کیمیا، تاریخ وغیرہ جانیں اور فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کا علم حاصل کریں تاکہ ان غلط عقائد کی تصحیح ہو سکے جو ہمارے نیم ملاؤں اور واعظوں نے کم علم سیکھ کر معاشرے میں پھیلا دیے ہیں۔علم سیکھنے میں سراسر نفع ہی ہے۔ یہ نقصان کا سودا نہیں۔ البتہ ہمارے ان مولوی صاحبان کا نقصان ضرور ہوگا جو ناخواندہ لوگوں کو جھوٹے فتوے دے کر اپنا فرمانبردار بناتے ہیں۔ مصنفہ نے اس جواز کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا کہ تعلیم حاصل کر کے خواتین مخرب اخلاق ناول وغیرہ پڑھیں گی جو بن بیاہی لڑکیوں کے پڑھنے کے لائق نہیں۔ اس کا

قصوروار بھی انھوں نے ان کتابوں کے مصنف ومترجم حضرت کو ٹھہرایا کیوں کہ ایسی کتابیں مرد حضرات کی لکھی ہوئی ہی ہیں۔ [۴۶]

سید علی امیر صاحب نے ''انسان کی ضروریات'' کے عنوان سے مضمون میں حصول تعلیم کو انسان کی اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے خواتین کو حصول علم کی ترغیب دی اور خواتین کے لیے کم از کم اردو اور عربی عبارت پڑھنے کی استعداد ہونا ضروری قرار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے خواتین کو دودھ، دھوبن وغیرہ کا حساب کتاب کرنے اور روپے پیسے کا اچھی طرح حساب رکھنے کے قابل ہونے کو ضروری قرار دیا۔ انھوں نے شہنشاہ ایڈورڈ مرحوم کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ انھیں لڑکپن میں ہر قسم کی تعلیم دی گئی یہاں تک کہ اینٹ بنانا بھی سکھائی گئی۔ اس لیے مصنف نے امور خانہ داری اور دستکاری کی تعلیم سیکھنے پر زور دیا تا کہ برے وقت میں کوئی ہنر پاس ہونے کی صورت میں دوسروں کے آگے دست نگر نہ ہونا پڑے۔ [۴۷]

محی الدین بی۔اے نے ''عالمِ خواب'' کے عنوان سے مضمون میں تعلیم نسواں میں ہمت افزائی اور جوش پیدا کرنے کے لیے بنگال کی خاتون مصنفہ مسز آر۔ ایس حسین صاحبہ کی انگریزی کتاب "Sultana Dream" کو نصاب تعلیم نسواں میں شامل کرنے کا کہا۔ مصنف نے اس کتاب کو مضامین کے لحاظ سے نہایت بامعنی اور موزوں قرار دیا۔ کتاب کی مصنفہ چونکہ تعلیم نسواں کی بہت بڑی حامی ہیں اس لیے انھوں نے اپنی کتاب میں کمال خوبی سے خیالات کی بلند پروازی دکھاتے ہوئے عالم خواب میں عورتوں کی علمی ترقی کا بہترین منظر پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نئے نئے اصول سیاست اور تمدن کو بیان کر کے دنیا کی توجہ ان ایجادات واختراع کی جانب دلائی جو خلاف عقل نہیں ہیں۔ مثلاً شمسی توانائی کو انسانیت کے نفع کے لیے استعمال کر کے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ [۴۸]

پروفیسر زاہدی بی۔اے دہلوی نے ''تحفۃ العروس'' کے عنوان سے مضمون میں اس ہندستانی سوچ کی نفی کی جس کے مطابق صرف پڑھنا لکھنا آ جانا ہی تعلیم کے زمرے میں شمار ہوتا ہے اور حساب، جغرافیے، تاریخ سے خواتین کا کوئی لینا دینا نہیں۔ مصنف کے مطابق تعلیم سے دماغ

کو روشن کرنے اور طبیعت کو جلا دینے کے لیے تمام مضامین کا علم ضروری ہے۔ اور خواتین ذہنی طور پر بھی ترقی کریں گی جب مدرسے کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم حاصل کریں گی اور گھر پر بھی علمی مشاغل جاری رکھیں گی۔ ۴۹

تراب النساء بیگم نے ''تعلیم نسواں''، مضمون میں تعلیم نسواں پر بحث کرنے کی بجائے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم نسواں کے لیے معیاری نصاب مرتب کیا جائے۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ خواتین اور مردوں کا نصاب جداگانہ ہو۔ اور ایسا نصاب ہو جس پر مسلمانوں کو بھی اعتماد ہو اور جس میں مذہب کا پاس ولحاظ، رکھا جائے۔ کیوں کہ لے دے کے مسلمانوں کے پاس اب صرف مذہب ہی بچا ہے اگر وہ بھی چھن گیا تو وہ دنیا میں ذلیل ورسوا ہو کر رہ جائیں گے۔ ۵۰

ز۔ خاتون صاحبہ نے ''لڑکیوں کو اسکول میں تعلیم دینے پر ایک نظر'' مضمون میں نصاب تعلیم نسواں کے حوالے سے کہا کہ خواتین کے تعلیمی نصاب میں پابندی صوم وصلوٰۃ شرعی طریقے سے ہو، خواتین کو عصمت، عفت، شرم وحیا سے آراستہ کیا جائے۔ پردہ کا خاص خیال رکھا جائے۔ اور خلاف قرآن/ خلاف اسلام تعلیم دے کر خواتین کو بے دین نہ بنانے کی کوشش کی جائے۔ ۵۱

علامہ راشد الخیری کی تقریر ''تقریر حقوق نسواں'' کے عنوان سے عصمت میں شائع کی گئی۔ حقوق نسواں کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نصف صدی پہلے حقوق نسواں کے سلسلے میں میرے جو آنسو صالحات اور سائرہ کے اوراق پر گرے تھے وہ آج بھی بہہ رہے ہیں کیوں کہ یہ مسئلہ جوں کا توں ہے۔ کوئی ایسا مسلمان سامنے نہیں آیا جو طبقۂ نسواں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتا۔ علامہ نے پنجاب کے مسلمانوں پر کڑی تنقید کی جو لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش میں امتیاز کر کے ترکے سے دختران اسلام کو محروم کر رہے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ متفقہ قوت سے کام لے کر گورنمنٹ کا قانون تبدیل کروائیں کیوں کہ یہ قانون اور رواج خود انھی کے ہاتھوں بنا تھا۔ ۵۲

مریم عبداللہ بیگم ''لڑکیوں کو خانہ داری کی تعلیم'' کے عنوان سے مضمون میں نصاب تعلیم میں

مذہب اور امور خانہ داری کی تعلیم شامل نہ ہونے پر کڑی تنقید کرتی ہیں۔ اس طرز کے طریقۂ تعلیم کو ناقص اور قابل اصلاح قرار دیتی ہیں۔ انھوں نے مختلف اسکولوں اور کالجوں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہاں کی فارغ التحصیل طالبات انگریزی گفتگو غلط کرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی خط تک لکھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ تاہم جدید دور کے تمام اندازِ آرائش سے خوب واقف ہوتی ہیں۔ مصنفہ نے مسلم گرلز کالج علی گڑھ، تربیت گاہِ بنات دہلی اور انجمن حمایت اسلام لاہور وغیرہ کو امداد دینے کی ہدایت کی تا کہ ان کے توسط سے خواتین اعلیٰ دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی واقف ہوں۔ انھوں نے مذہبی تعلیم اور امور خانہ داری کو بھی شامل نصاب کرنے کی تجویز پیش کی اور دستکاری، مصوری، نرسنگ اور خوشنویسی بچیوں کو گھر پر سکھانے کی ہدایت دی تا کہ بچیاں مستقبل کی بہترین مائیں بن کر سامنے آئیں۔[۵۳]

مسز یوسف الزماں نے ''ہماری تعلیم کس زبان میں ہونی چاہیے'' کے عنوان سے مضمون میں انگریزی زبان سیکھنے پر وقت صرف کرنے کو تضیع اوقات قرار دیا اور مسلمان لڑکیوں کے خوش انتظام بیوی اور ہوشیار مائیں بننے کے لیے مادری زبان میں تعلیم ہی کو صحیح قرار دیا۔ انگریزی زبان سیکھنے کے چکر میں خواتین اردو زبان پر بھی عبور حاصل نہیں کر پاتیں اور محض زبان سیکھنے کے چکر میں نہ تو کتاب کے مواد پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے اور نہ کچھ سیکھنے کا موقع مل پاتا ہے۔ اس لیے مصنف نے نصاب تعلیم میں اچھی بیوی اور اچھی ماں بننے کے لیے امور خانہ داری، اصول حفظان صحت اور دیگر ضروری امور کے شامل کرنے پر زور دیا۔[۵۴]

محترمہ الف بیگم نے ''مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین کے لیے مروجہ طرز تعلیم کو غیر مفید قرار دیتے ہوئے حامیانِ تعلیم نسواں اور بہی خواہانِ طبقہ نسواں کو ایسا طریقۂ تعلیم جاری کرنے کی ہدایت کی جس سے نہ صرف خواتین اردو زبان میں مہارت حاصل کر لیں بلکہ مذہبی و اخلاقی تعلیم، اصول معاشرت، حقوق والدین، اطاعت شوہر، تربیت اطفال، امور خانہ داری سے بھی واقف ہوئیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ اساتذہ کے تقرر میں بھی تعلیمی قابلیت کے ساتھ ساتھ مذہبی و اخلاقی حالت کو بھی معیار بنایا جائے اور طالبات کے چناؤ میں بھی ہر طبقے و فرقے

کی لڑکیاں نہ داخل کی جائیں کیوں کہ بری صحبت شریف لڑکیوں کو بھی خراب کر دیتی ہے۔ [۵۵]

کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد صاحب نے ''نسوانی نصاب تعلیم'' کے عنوان سے مضمون میں معاشرتی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی تعلیم کو بھی شامل نصاب کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ مصنف نے خواتین کے لیے ہندُستانی طرز حکومت، ووٹ کی اہمیت، نمائندوں کے انتخاب اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے مقرر کردہ قوانین کا علم ہونا ضروری قرار دیا۔ [۵٦]

۵.۱۔ رہنمائی نسواں

مسز راشد الخیری نے ''بیوقوف بیوی'' کے عنون سے مضمون میں ان ماؤں کو سرزنش کی ہے جو بیٹیوں کو شوہر قابو میں لانے کے الٹے مشوروں سے نوازتی ہیں مثلاً شوہر سے گھنٹوں خوشامد کروانا، شوہر پر شروع ہی سے رعب جمانا، رعب جمانے کے لیے اوّل تو شوہر کی باتوں کا جواب ہی نہ دینا اگر دینا تو ایسے جیسے کوئی کاٹ کھانے کو دوڑے۔ مسز راشد نے لکھا ہے کہ اکڑ اور دباؤ سے میاں کو غلام بنانا نہایت ہی احمقانہ خیال ہے۔ بے جا دباؤ سے تو غلام بھی بھاگ جاتے ہیں۔ انھوں نے خواتین کو نصیحت کی کہ شادی کے بعد لڑکیوں کا سب سے پہلا کام میاں کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنا ہونا چاہیے۔ ہر طرح سے ہر کام میں اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خلاف مزاج بات بھی برداشت کرلیں مگر شوہر کو خوش رکھیں۔ ایک دفعہ جب بیوی شوہر کے دل میں گھر کرلے تو شوہر بیوی کے آرام کے لیے ہر قسم کی مصیبت اٹھانے پر بخوشی تیار ہو جائے گا۔ [۵۷]

امینہ خاتون صاحبہ نے مضمون ''کثرت ازدواج'' میں سوکن کے دکھ کو خواتین کے لیے سب سے بڑا دکھ قرار دیتے ہوئے مردوں کو بھی اپنی خواتین کی طرف سے لاپروائی برتنے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ انھوں نے نام نہاد روشن خیال مردوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جو یورپی ممالک سے آکر وہاں کی خواتین کی شائستگی، عقل و متانت کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔ مصنفہ نے تعلیم یافتہ مردوں پر زور دیا ہے کہ وہ تھوڑی سی دقت اٹھا کر اپنی بیویوں کو اپنی پسند میں کیوں نہیں ڈھال لیتے۔ اگر صرف آدھا گھنٹہ بھی وہ اپنی خواتین کو اخبارات سے باخبر کرنے میں لگائیں تو تھوڑے ہی عرصے میں ان کی وہی بیویاں ترقی یافتہ اور بامذاق بن جائیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خواتین کو دوسری خواتین سے ملنے جلنے

کے مواقع فراہم کریں تا کہ گھر کی چار دیواری کے علاوہ بھی ان کے خیالات میں کچھ وسعت آئے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے خواتین کو بھی سوکن جیسے دکھ سے بچنے کے لیے اولاد کی تربیت کرتے ہوئے لڑکوں کے دلوں میں خواتین کی عزت پیدا کرنے کا کہا۔لڑکوں کی تربیت کرتے ہوئے ان کے دل ودماغ میں خواتین کی عزت پیدا کرنا بلاشبہ ماؤں ہی کی ذمہ داری ہے جس سے کثرت ازدواج کا یہ رواج خود بہ خود نابود ہو جائے گا۔[۵۸]

مسز محمد اکرام نے ''اچھی بیوی'' مضمون میں خواتین کی رہنمائی کرتے ہوئے انھیں مشورہ دیا کہ بیوی بنتے ہی ایک لڑکی کا سب سے پہلا کام اپنے شوہر کی طبیعت کا رجحان معلوم کرنا ہونا چاہیے۔ وہ اسباب جاننے چاہییں جن سے شوہر کی طبیعت مکدّر ہوسکتی ہیں اور وہ اسباب جاننے چاہییں جو اس کے مزاج کو خوشگوار بنادیں۔اطاعت وفرمانبرداری کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔خاوند کا مزاج معلوم ہونے کے بعد باقی زندگی خود بہ خود خوشگوار گزرے گی۔مصنفہ نے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ سب خواتین کو یہ باور کرایا کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خاوند کی رضامندی حاصل کرنا ہونا چاہیے۔اس سے بہتر تدبیر زندگی کو بہتر بنانے کی اور کوئی نہیں ہوسکتی۔[۵۹]

بیاہی بہنوں کی ایک خیر خواہ بہن نے ''شوہر کیونکر بگڑتے ہیں'' کے عنوان سے مضمون میں میاں بیوی کے تعلقات کو زیر بحث لایا ہے۔شوہر کی زیادہ سے زیادہ خاطر کرنا، اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنا، اس کی مرضی پر چلنا، اپنی خواہشات کو اس کی خواہشات کے تابع کردینا مرد کو بیوی کا مطیع بنادیتا ہے۔اس کے برعکس اگر بڑبڑایا جائے، منہ پھلایا جائے، ہر وقت اس کے کاموں میں نقص نکالا جائے اور اپنی ناراضگی ظاہر کی جائے تو ایسی بیوی سے مرد دور ہی بھاگے گا۔مصنفہ کے نزدیک مرد کی فطرت ہے نقص نکالنا لہٰذا خواتین کو چاہیے کہ اسے کم سے کم شکایت کا موقع دیں۔ مردوں کے سامنے بچوں کو پیار نہ کریں بلکہ مرد کی خبر گیری کریں۔سرد مہری اور نکتہ چینی کرنے کی بجائے نرمی اور شیرینی سے کام لیں۔ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے یہ سنہری اصول ہیں۔[۶۰]

علمدار حسین واسطی نے ''ساس اور بہو'' کے عنوان سے مضمون میں اس نازک رشتے کے

کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بہو کے آتے ہی ماؤں کو اپنے بیٹے کے پرائے ہو جانے اور چھن جانے کا ڈر رہتا ہے اور اس ڈر کے حقیقت میں بدلنے سے بچنے کے لیے وہ پہلے ہی بہو کے خلاف محاذ کھول کر بیٹے کو بھڑکاتی رہتی ہیں۔ مصنف نے اس نازک رشتے میں موجود حسد اور جلن کے جذبے کو جہالت، بے علمی اور خراب تربیت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ لڑکیاں اپنے میکوں میں ساس نندوں کے برے قصے سن کر جوان ہوتی ہیں اور ان کا برا خاکہ ہی اپنے ذہنوں میں بنایا ہوتا ہے۔ مصنف کے نزدیک ساس کو چاہیے کہ وہ بہو کو عزیز رکھے اور محبت اور پیار سے اپنا مطیع وفرمانبردار بنائے اور بہو ساس کو اپنی ماں کی جگہ دے اور اس کا ادب ملحوظ خاطر رکھے۔ مصنف نے تعلیم یافتہ مرد و خواتین سے درخواست کی کہ وہ ان واقعات و حالات کی اصلاح کے لیے کوشش کریں تاکہ ہمارے ملک کی خواتین کی اصلاح ہو سکے۔[۶۱]

اہلیہ مولوی عبدالجبار نے ''حریتِ نسواں'' کے عنوان سے مضمون میں طبقۂ نسواں کو ہی ان کے حقوق سے محرومی کا ذمے دار ٹھہرایا ہے۔ مصنفہ کے بقول خواتین میں اپنی حق تلفی کا احساس ہی باقی نہیں رہا وہ موجودہ طرز معاشرت کی اس قدر عادی ہو گئی ہیں کہ اگر اسلام انہیں ضرورت کے تحت باہر نکلنے، سودا سلف خریدنے اور مردوں سے بات چیت کی اجازت بھی دیتا ہے تو بھی بہت سی خواتین اس بات کو ناپسند کریں گی۔ مصنفہ نے خیال ظاہر کیا کہ بجائے خواتین کو حقوق نسواں کے لیے بھڑکانے اور اکسانے کے ان کے شوہروں سے درخواست کی جائے، انھیں خواتین کی قربانیوں کا احساس دلایا جائے تو یہ تجویز زیادہ فائدہ مند ثابت ہو گی۔ جہاں تک ممکن ہو ازدواجی تعلقات میں تلخی پیدا نہ ہونے دینا چاہیے۔ اسلام نے بھی ہر مذہب سے زیادہ عورت کی حمایت کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کتاب الٰہی میں مردوں کو قوام بنایا گیا اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی۔ مصنفہ نے ماہنامہ عصمت کے حوالے سے امید ظاہر کی کہ حقوق نسواں کی اس جنگ میں یہ ماہنامہ دیا سلائی کا کام کرنے کی بجائے خواتین کے دین اور دنیا دونوں بہتر بنانے کی طرف توجہ دے گا اور ان کے جائز حقوق کی ہمیشہ حفاظت اور حمایت کرے گا۔[۶۲]

مولوی عطا محمد صاحب نے ''ایک متوسط درجہ کی مسلمان عورت کے لیے دستور العمل'' کے

عنوان سے مضمون میں خواتین کی رہنمائی کرتے ہوئے انھیں مشورہ دیا کہ شوہر اور بیوی کے درمیان پیدا ہوجانے والی خفیف غلط فہمیاں لوگوں میں مشہور کرنے کی بجائے آپس میں ہی دور کر لینی چاہییں۔ شوہر کی کمائی کفایت شعاری سے خرچ کریں، اسراف سے کام نہ لیں۔ گداگروں کو پیسے خیرات کے نام پر دے کر ان کی تعداد میں اضافہ نہ کریں۔ البتہ اپاہج اور معذور لوگوں کو صدقہ و خیرات دینا باعثِ ثواب ہے۔ شوہر کی بیماری کے ساتھ ساتھ اپنی بیماری پر خرچ کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ گھر بھر کی ذمہ داری بیوی ہی کے سر ہوتی ہے۔ صفائی کا خاص خیال رکھیں کیونکہ ظاہری صفائی ہی باطنی صفائی کی ضامن ہوتی ہے۔[۶۳]

سید محمد فاروق نے ''ساس بہو کے جھگڑے'' کے عنوان سے مضمون میں ساس اور بہو کے مقام کا تعین کرنا مردوں کا فرض قرار دیا ہے۔ ایک طرف ماں ہے جس نے نو مہینے تک اپنے خون سے سینچ کر اور ہزاروں مصیبتیں سہہ کر اسے بڑا کیا اور دوسری طرف زندگی بھر کی ساتھی ہے جس کے بغیر سچی اور ابدی خوشی کا حصول ناممکن ہے۔ ساس اور بہو اگر ایک دوسرے کے حقوق اور مقام کو پہچاننا شروع کر دیں اور تمام باتوں پر تحمل اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی عادت اپنا لیں تو ساس بہو کا یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کا تعلیم یافتہ ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ حقوق و فرائض کا تعین کرسکیں اور گھر کا ماحول خوشگوار بنانے میں مرد کی رفیق کار ثابت ہوں۔[۶۴]

ہمشیرہ احمد عبداللہ نے ''پردہ'' کے عنوان سے مضمون میں پردہ کو خواتین کے لیے عصمت اور پاکدامنی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے اس کے اوصاف بیان کیے اور مذہب اسلام میں احکامِ پردہ کے حوالے سے معلومات فراہم کیں۔ مصنفہ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ خواتین مغربی تقلید میں ایسا لباس زیب تن کرتی ہیں جس سے پردے کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اور ان کا لباس مردوں کے لیے کشش کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا شرع کو مدنظر رکھتے ہوئے خواتین کو لباس زیب تن کرنا چاہیے۔[۶۵]

عالیہ خاتون نقویہ نے ''ساس اور بہو کے تعلقات'' کو موضوع بحث بناتے ہوئے خواتین کی

اس سوچ کی مذمت کی کہ شادی کے بعد میاں بیوی سب کو چھوڑ کر محبت بڑھانے کی غرض سے الگ رہیں۔ انھوں نے ساس بہو کے تعلقات خوشگوار نہ ہونے کا ذمہ دار جہالت کو ٹھہرایا اور خاص کر مردوں کی مذہبی تعلیم سے ناواقفیت کو اس کا سبب قرار دیا۔ اگر مرد اپنے فرائض تندہی سے انجام دیتے ہوئے تمام رشتوں میں احکام الٰہی کے مطابق توازن رکھیں تو گھر میں فساد برپا ہو ہی نہیں سکتا۔ مصنفہ نے خواتین کو اپنے مزاجوں کی اصلاح اور طبیعتوں کی کثافتیں دور کرنے کے لیے علم حاصل کرنے کی ترغیب دی تا کہ وہ اپنی ساس کی اطاعت کر کے خود کو اور اپنے شوہروں کو دین اور دنیا دونوں جہانوں میں سرخرو کریں۔ [۶۶]

زیڈ۔ بی ''خاوند کا مرتبہ اور اس کی محبت'' کے عنوان سے مضمون میں خاوند کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرار دیتی ہیں اور خاوند کی رضامندی اور خوشنودی کو جنت کے حصول کا ذریعہ قرار دیتی ہیں۔ مصنفہ نے ایسی خواتین پر سخت تنقید کی جو غرور اور بڑائی کے نشے میں سرشار ہو کر اپنے شوہروں کو خود سے رنجیدہ اور متنفر کر دیتی ہیں۔ انھوں نے خواتین کو مشورہ دیا کہ شوہر کی مطیع و فرمانبردار رہیں اور ان کی پسند کو سامنے رکھ کر ہر کام کریں تا کہ شوہر کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضامندی بھی انھیں حاصل ہو۔ [۶۷]

سردار محمدی بیگم نے ''ساس بہو کے جھگڑے اور اس کا علاج'' کے عنوان سے مضمون میں قومی و انفرادی نقائص کی اصلاح کے ساتھ ساتھ خانہ جنگی کے اس نقص کی اصلاح پر بھی زور دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کی معاشی اور مالی حالت کمزور ہونے کے سبب بیوی اور ماں کو الگ رکھنے کی تجویز کو ناقابلِ قبول قرار دیا۔ نئی شادی شدہ دلہن کا تجربات زمانہ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اپنے سرپرستوں سے الگ رہنا تباہ کن ثابت ہو رہا تھا۔ خاص طور پر مغربی ناروا تقلید اور بے پردگی کو انھوں نے نقصان دہ قرار دیا۔ لڑکی میں پختگی پیدا ہونے اور لڑکے کے برسرِ روزگار ہونے کی شرائط پر شادی کو بھی ہندُستانی آب و ہوا کے لحاظ سے افزائش نسل میں مسائل کا مظہر سمجھا گیا۔ مذکورہ تمام تجاویز کو رد کرتے ہوئے مصنفہ نے فریقین کی طبائع میں کشادہ دلی اور رواداری کے اوصاف پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کے نزدیک طبائع کی اصلاح، ہر فرد کا دوسرے سے اپنے درجہ و عمر

کے حسب حال سلوک و برتاؤ ہی ساس بہو کے جھگڑے کا بہترین حل ہے۔ انھوں نے شوہر حضرات پر بھی زور دیا کہ دونوں رشتوں میں توازن قائم رکھتے ہوئے بیویوں کے دلوں میں والدین کے احترام کا سکہ بٹھائیں۔ محمدی بیگم نے والدین پر زور دیا کہ وہ اپنی بچیوں کو انتظام خانہ داری، خوش سلیقگی، خوش اخلاقی، ہمدردی، انکساری، ہر ایک کے حسب درجہ و مراتب سلوک اور مذہبی علوم کی تعلیم و تربیت دیں کیوں کہ ایک عورت ہی گھر سے خاندان، خاندان سے قوم اور قوم سے ملک بنانے اور بگاڑنے کا موجب بنتی ہے۔ [٦٨]

مولانا عبدالحلیم شرر ''رخصتی کی نصیحتیں'' کے عنوان سے مضمون میں بیٹی کی رخصتی کو ایک دردناک و جگر خراش واقعہ قرار دیتے ہیں اور والدین کو رخصتی پر آنسو بہانے کی بجائے بیٹی کو نصیحتیں کرنے کی ہدایت کرتے ہیں تا کہ اس کی آئندہ زندگی خوشگوار اور پرسکون گزرے۔ مولانا حضورؐ سے ڈیڑھ صدی قبل کے ایک شخص عوف بن محلم شیبانی کی مثال دیتے ہیں اور اس کی بیوی کی اپنی بیٹی کو رخصتی کے موقع پر کی جانے والی نصیحتوں کو آج کی خواتین کے لیے بھی اتنا ہی مفید اور کارگر قرار دیتے ہیں۔ اس خاتون نے بیٹی کو لونڈی بن کر شوہر کی خدمت کرنے، ہر حال میں قناعت کرنے، شوہر کے ہر حکم کی تعمیل کرنے، اس کی غذا کی ہمیشہ فکر کرنے، اس کی نیند کا خیال رکھنے، اس کے مال و زر کی حفاظت کرنے، اس کا راز راز رکھنے اور اس کے گھر والوں اور ملازمین سے اچھا برتاؤ کرنے کی نصیحتیں کیں جو کہ ہر زمانے میں ہر لڑکی کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ [٦٩]

ظفر جہاں بیگم نے ''رشتہ کرتے وقت احتیاط'' کے عنوان سے مضمون میں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے اصول کو نقصان دہ قرار دیتے ہوئے محض ظاہری اور سطحی خوبیوں کی بنا پر رشتہ کرنے کو ناپسند کیا اور فریقین کے خاندانوں کی اچھی طرح چھان بین کو ضروری قرار دیا۔ [٧٠] مسز یوسف الزماں نے اپنے مضمون ''منگنی'' میں منگنی کے سلسلہ میں لڑکا اور لڑکی کی ایک دوسرے کو دیکھنے کی مخالفت کی ہے۔ انھوں نے یہ جواز پیش کیا ہے کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر کی لڑکی اتنی سمجھ دار نہیں ہوتی کہ وہ لڑکے کو ایک نظر میں جان جائے، دوسرا جواز یہ کہ اگر کسی بھی ایک فریق نے دیکھنے کے بعد اظہار ناپسندیدگی کر دیا تو دوسرے فریق کے لیے یہ صورتحال مسائل کا باعث بنے گی۔ مصنفہ نے ایک دوسرے کو دیکھنے سے بھی

زیادہ خیالات، مزاج اور عادات واطوار معلوم کرنے کی غرض سے خط وکتابت کو نازیبا ٹھہرایا۔ تاہم مصنفہ کے نزدیک فریقین ایک دوسرے کو لاعلم رکھ کر دیکھیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔[۱] محترمہ رضویہ خاتون نے ''منگیتر سے خط وکتابت'' کے عنوان سے مضمون میں فریقین کے ایک دوسرے کو جاننے کے لیے خط وکتابت کرنے کو لاحاصل قرار دیا کیوں کہ اصل حالت تو شادی کے بعد ساتھ رہنے پر سامنے آتی ہے۔ تاہم فریقین کے خاندانوں کی اخلاقی حالت، صحت، دوسرے سمدھیوں سے برتاؤ، عزیزوں اور ہمسایوں سے سلوک بھی بہت کچھ جاننے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔[۲]

محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ نے ''منگیتر سے خط وکتابت'' کے عنوان سے مضمون میں اس قسم کی مراسلت وخط وکتابت کی مخالفت کی اور خدانخواستہ نسبت ٹوٹ جانے پر لڑکی کے لیے ساری زندگی کا نقصان قرار دیا۔ مصنف کے بقول لڑکے کی علمی قابلیت، ذریعہ معاش، ذرائع آمدنی، اخلاق و عادات، صحتِ دماغی وجسمانی کی تحقیقات کوئی تجربہ کار مرد یعنی لڑکی کا باپ ہی کرسکتا ہے۔ معمولی عقل کا انسان بھی اپنے عیوب اپنے قلم اور زبان سے بذریعہ خط ظاہر نہیں کرے گا بلکہ کسی اور کے توسط سے پتہ چل جانے پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ ایسے معاملات میں فریقین حقیقی حالات کو ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھنے کے لیے تصنع وریاکاری اور منافقانہ طرزِ عمل سے کام لیتے ہیں اور دونوں مغالطے میں پڑے رہتے ہیں اور شادی ہونے کے بعد تصنع کا خوش نما رنگ اڑ جاتا ہے اور اصلیت کھلتی ہے تو کشیدگی کی صورت میں نوبت طلاق تک جا پہنچتی ہے۔ اس لیے اس قسم کی رسم کو شروع ہی نہیں کرنا چاہیے جو بعد میں نقصان کا باعث بنے۔[۳]

مولانا شوکت علی صاحب نے ''مسلمان بیٹیوں کے لیے میرا پیام'' کے عنوان سے مضمون میں مسلمان خواتین کی یورپین تقلید کو ناپسند کرتے ہوئے سرخی پاؤڈر جیسی آرائش حسن و مال کی چیزوں کو جلد کے لیے مضر قرار دیا اور باریک ساڑھیوں، بغیر آستینیوں، گہرے گلوں اور سر کو نہ ڈھانپنے کے فیشن کو خلافِ شرع قرار دیتے ہوئے مسلمان خواتین کو اس کی تقلید سے روکا۔ مولانا نے تاریخ اسلام سے حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ اور سیکڑوں اہل بیت صحابیات کی مثال دیتے ہوئے طبقۂ نسواں کو ان کی تقلید کا مشورہ دیا۔ مولانا نے اپنی والدہ ماجدہ ''بی اماں'' کی مثال دی اور حیا، شرافت اور

خدا کی محبت کو بہترین زیور قرار دیا۔[۴۷]

۱.۶۔ تربیتِ نسواں

ماہنامہ عصمت نے خواتین کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے بہت کام کیا۔ ''شہرت کی خواہش'' مضمون میں مسز عبداللہ نے خواتین کی اخلاقی تربیت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ قدرتی طور پر شہرت کی خواہش ہر مرد اور عورت میں ہوتی ہے۔ کچھ لوگ تو اچھے کام کر کے مشہور ہوتے ہیں اور کچھ جھوٹی شیخی اور فضول خرچی سے نامور ہونا چاہتے ہیں۔ جو خود کسی گنتی میں نہیں ہوتا اپنے آباؤ اجداد کی تعریف میں رطب اللسان رہتا ہے۔ مسز عبداللہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اچھا کام کر کے مشہور ہونے کے خواہشمند لوگوں کی شہرت دوسروں تک پھیلانی چاہیے تاکہ اس کی اور دوسرے لوگوں کی بھی ہمت بندھے۔ اور لوگ اس کی مثال کو سامنے رکھ کر اچھے کام کریں۔

خواتین کی ایک بہت بڑی خامی کی طرف مسز عبداللہ نے توجہ دلائی ہے کہ کسی شخص کے اچھا کام کرنے کو صرف شہرت اور ناموری کا حصول گردانتی ہیں حالانکہ کوئی شخص کسی کے دل کی باتیں نہیں جان سکتا:

> بیبیوں میں یہ بہت بڑا مرض ہے کہ جب کسی کو کوئی اچھا کام کرتے دیکھتی ہیں تو ناک بھوں چڑھا کر کہنے لگتی ہیں کہ یہ تو اپنے نام کے لیے کر رہا ہے۔ اس کے دل میں سچی ہمدردی نہیں ہے اور نہ اسکی نیت بخیر ہے۔ [۴۸]

مسز عبداللہ نے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کسی کے اچھا کام کرنے پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع نہیں کر دینی چاہیے۔ کوئی نیک کام کر کے شہرت حاصل کرنا بھی چاہتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ ہمیں صرف کام سے غرض ہونی چاہیے۔ البتہ وہ لوگ جو بذاتِ خود کچھ نہیں صرف اپنی امارت اور آباؤ اجداد اور حسب و نسب پر اتراتے ہیں۔ ان کی تعریف کر کے ان کو شہ دینے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جو لوگ خالص نیت سے بغیر کسی غرض کے دوسروں کے کام آتے ہیں ان کا نام ہمیشہ رہتا ہے اور جو محض دکھاوے کے لیے اچھے کام کرتے ہیں۔ ان کی شہرت کا چند روز میں خاتمہ ہو جاتا ہے۔

علامہ راشد الخیری نے ''سچا زیور'' مضمون میں خواتین کی ظاہری زینت کے ساتھ ساتھ باطنی زینت پر بھی زور دیا۔ عموماً خواتین ایک دوسرے سے بڑھ کر خوب صورت نظر آنے کے لیے زیورات سے مزین ہوتی ہیں لیکن عورت کا اصل حسن اس کا باطنی حسن ہے۔ مصنفہ نے دوسروں کی مدد کرنے، بڑوں کی خدمت کرنے اور تمام دنیاوی کام کرتے ہوئے بھی اللہ کی عبادت سے غافل نہ ہونے کو سراہا اور نماز کو اصل زیور قرار دیا جس پر ہزاروں لاکھوں روپے کے ہیرے جواہر قربان کیے جا سکتے ہیں۔ ۷۶

ر۔ب صاحبہ نے ''اصول زندگی'' کے عنوان سے مضمون میں تہذیب اور وقت کی پابندی کی طرف خواتین کی توجہ مبذول کروائی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خواتین تہذیب و شائستگی سے کام نہیں لیتیں بلا اجازت اچانک دوسروں کے گھر چلی جاتی ہیں اور گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ صاحب خانہ کے کچھ اپنے ضروری کام بھی ہو سکتے ہیں جو ان کے وہاں جانے سے التوا کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دعوت کا جو وقت دیا جاتا ہے اس سے کافی دیر سے پہنچا جاتا ہے۔ گھروں میں سب کام ملازماؤں پر چھوڑ کر خود فراغت کے مزے لیے جاتے ہیں۔ مصنفہ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ یہی بتائی کہ وہ بااصول زندگی گزارتا ہے۔ بے اصول زندگی تو چرند پرند بھی گزار لیتے ہیں۔ ۷۷

علامہ راشد الخیری نے ''عشا کی نماز'' مضمون میں خواتین کو اس ذات باری تعالیٰ کی نعمتوں کی طرف متوجہ کیا ہے جو اپنے بندوں پر بے پناہ مہربان ہے۔ انھوں نے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ دنیاوی کاموں میں تو خواتین سب سے آگے آگے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہوتی ہیں لیکن نماز جو ایمان کی حفاظت کا ذریعہ اور عورت کا سب سے بڑا زیور ہے خواتین اس سے بالکل لاتعلق ہیں۔ انھوں نے خواتین کو خبردار کیا کہ جن دنیاوی نعمتوں پر پھول کر وہ اس ذات باری سے غافل ہو گئی ہیں وہ چاہے تو پل بھر میں ان سے سب چھین سکتا ہے۔ لہٰذا خواتین کو نماز پنجگانہ کے سلسلے میں کسی کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ۷۸

''پکا رشتہ'' کے عنوان سے مضمون میں علامہ خون کے رشتوں اور دنیاوی رشتوں کے برقرار

اور قائم رہنے کی مدت موت تک قرار دیتے ہیں۔ موت کے ساتھ ہی یہ سب رشتے بھی ختم ہو جاتے ہیں لیکن عبد و معبود کا رشتہ موت کے بعد بھی قائم رہتا ہے اور یہی پکا رشتہ ہے۔ علامہ خواتین کو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ دنیا میں ہم اگر کسی سے اچھا سلوک کریں اور وہ ہماری مرضی کے مطابق کام نہ کرے تو ہمیں بہت دکھ اور رنج ہوتا ہے۔ لیکن ہم اپنے خالق اور مالک کے سیکڑوں احسانات کے باوجود دنیا کے گورکھ دھندوں میں کھو کر بھول کر بھی اسے یاد نہیں کرتے۔ علامہ نے خواتین پر زور دیا کہ تمام حقوق العباد ادا کرنا بھی عبادت ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن اگر یہی فرائض نماز کی ادائیگی کے ساتھ ادا کر لیے جائیں تو خالق کی رضامندی بھی حاصل ہو جائے اور آخرت میں کام آنے والی چیز بلاشبہ خالق کائنات کی رضامندی ہی ہے۔ [۹۷]

عصمت میں جہاں ہر طرف پردے کی بحث اور حقوق نسواں پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ حضرت زمزم بی۔ اے دہلوی صاحبہ نے ''فریبِ جلوہ'' کے عنوان سے مضمون میں مغربی خواتین کی ظاہری نمود و نمائش اور بباطن عبرتناک حالت کو سامنے لایا ہے۔ مصنفہ نے ہندستانی خواتین کو سرزنش کی ہے جو مغرب کی اندھا دھند تقلید کو اپنا مقصد حیات بنا کر نام نہاد حقوق نسواں کی آواز بلند کر رہی ہیں۔ مصنفہ نے ٹھوس کے دلائل کے ساتھ مغربی اور مشرقی خواتین کی زندگی کا موازنہ کیا ہے اور مغرب کی بظاہر چمکتی دمکتی تہذیب اور اندر سے کھوکھلی تہذیب کی اصل تصویر سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ امریکہ میں کوئی قانون رائے عامہ کے بغیر منظور نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ صرف مردوں سے لی جاتی ہے خواتین سے رائے نہیں لی جاتی، بیوی کے حقوق نہایت سختی سے غصب کیے جاتے ہیں۔ عورت کے مال کا خاوند حق دار ہے۔ عورت کی جائیداد کا بھی شوہر مالک ہوتا ہے۔ جب کہ عورت خاوند کی جائیداد میں حصہ دار نہیں ہوتی۔ میکے کی طرف سے ملنے والا بیوی کا ورثہ بھی قانوناً خاوند ہی کا ہو جاتا ہے۔ شوہر چاہے تو مرتے وقت بذریعہ وصیت جس شخص کو چاہے بچوں کا ولی مقرر کر کے بیوی سے بچے لے سکتا ہے۔ باپ کسی بھی شخص سے معاہدہ کر کے بیٹی کو اس کی رضامندی کے بغیر کارخانوں میں کام پر بھیج سکتا ہے۔ سرکاری ملازمت اور دیگر پیشوں میں چھوٹی موٹی ملازمتیں تو خواتین کو مل جاتی ہیں مگر بڑے عہدے صرف مردوں کے لیے مختص ہیں۔ بعض جج عورتوں کی شہادت قابل سماعت نہیں سمجھتے۔ ۳/۴ خواتین کو ان کے

شوہر قتل کر دیتے ہیں اور بہت معمولی سزا پاتے ہیں۔خواتین کو کوئی قومی عزت حاصل نہیں۔امریکہ کے صدر کی بیوی کو کوئی خطابی اعزاز نہیں دیا جاتا نہ کوئی قومی یادگار کسی خاتون کے نام سے مشہور ہے۔اس کے برعکس ہندوستانی خواتین کو گھر کی چاردیواری میں مردوں سے بھی زیادہ حقوق حاصل ہیں۔۸۰

نور احمد وکیل صاحب نے ''خانہ داری اور تربیت'' کے عنوان سے مضمون میں انتظامِ خانہ داری میں مہارت کو خواتین کی خوشگوار زندگی کا راز قرار دیا ہے۔ خانہ داری سے ناواقف خواتین کو سسرال میں پھوہڑ کہا جاتا ہے۔شوہر کی نظروں سے بھی گر جاتی ہیں۔لعن طعن انکا مقدر بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس وہ خواتین جو ماں باپ کی کڑی تربیت سے گزری ہوتی ہیں۔اپنے سسرال کے دلوں پر بھی راج کرتی ہیں کیوں کہ انھوں نے ماں باپ کے گھر میں امور خانہ داری کی سخت تربیت لی ہوتی ہے۔خوش اخلاق اور نیک طینت لڑکیاں اپنے طرزِ عمل سے ماں باپ کا نام بھی روشن کرتی ہیں۔جبکہ زبان دراز، بدمزاج اور خودسر وخود پسند لڑکیوں سے سب نالاں ہوتے ہیں۔اس لیے شروع سے ہی بچوں کی تربیت کا خیال کرتے ہوئے انھیں عمدہ عادات کا مالک بنانا چاہیے۔تبھی تعلیم بھی انھیں سنوار سکتی ہے ورنہ بگڑے ہوئے بچے کتنے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو جائیں، تعلیم ان میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتی۔۸۱

''مذہب'' کے عنوان سے مضمون میں علامہ راشد الخیری نے مغربی تقلید پرستی کے مضر اثرات پر بحث کرتے ہوئے اس کا ایک بڑا نقصان مذہب سے دوری قرار دیا۔مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیاں جدید تعلیم کے حصول کے بعد اخبارات، رسائل اور ناولوں کی تو رسیا ہو گئیں لیکن قرآن پاک کی تلاوت، نماز روزہ بھول گئیں۔علامہ کے نزدیک مذہب سے الگ ہو کر دنیا میں ترقی کرنا ممکن نہیں۔خواتین مذہبی احکامات پر عمل پیرا ہو کر ہی اپنی زندگی بہتر بنا سکتی ہیں نہ کہ مغرب کی نقالی کر کے اچھے اور برے کی تمیز سے ہی نابلد ہو جائیں۔۸۲

ہر ہائینس نواب بیگم آف سچین جنھوں نے سیر یورپ کے عنوان سے عصمت میں سفر نامہ بھی لکھا اپنے سیاحت کے تجربے کی روشنی میں ''سینا پرونا'' کے عنوان سے سلائی کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتی ہیں۔سلائی کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ صرف گزارے لائق کام نہیں سیکھنا

چاہیے بلکہ کام ایسا ہو کہ دیکھنے والا تعریف کیے بنا رہ نہ سکے۔ نواب بیگم نے بلا تفریق امیر و غریب تمام خواتین کے لیے سوزن کاری سیکھنے پر زور دیا ہے:

> کم بضاعت بیبیوں کے علاوہ خوشحال اور فارغ البال خاتونوں کو بھی سینا سیکھنا چاہیے اور نہ صرف سادی سلائی بلکہ سوزن کاری کی تمام قسموں کی مشق بہم پہنچانی چاہیے اور اگر ممکن ہو تو ٹکائی، کشیدہ، موزے اور گلوبند کا بننا گوکھڑ کا موڑنا اور سوت، اون اور کامدانی کا کاڑھنا بھی سیکھنا چاہیے کیونکہ امیر غریب سب کو کسی نہ کسی وقت ان سے کام پڑتا ہے اور اگر یہ کام مستورات کے ہاتھ میں ہوں تو وہ کسی کی محتاج نہیں رہتیں اور اپنا سارا ہلکا بھاری کام اپنے ہاتھ سے اپنی مرضی کے موافق کر سکتی ہیں۔ ۸۳

انھوں نے اس بات پر کڑی تنقید کی ہے کہ ہندستان میں اعلیٰ طبقے کی خواتین سینا پرونا سیکھتی ہی نہیں اور اگر سیکھ لیں تب بھی اپنے بچوں اور شوہر کے کپڑے سینا اپنی شان کے خلاف سمجھتی ہیں۔ اس کے کئی نقصانات ہیں نہ صرف روپے کا زیاں ہوتا ہے بلکہ درزی سے خواتین کا کپڑے سلائی کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر خواتین سے بھی سلائی کروائی جائے تو وہ جلدی کام ختم کرنے کے چکر میں پائیدار کام نہیں کرتیں۔

ہندُستان کی خواتین کا مورال بلند کرنے کے لیے اور ہاتھ سے کام کرنے اور سلائی کو عار سمجھنے کی جھجک ختم کرنے کے لیے انھوں نے فرنگستان کی تمام امیر زادیوں اور شہزادیوں کی مثالیں دی ہیں کہ وہ ہر قسم کی سوزن کاری جانتی ہیں اور اپنے بچوں کے کپڑے خود سیتی یا اپنی نگرانی میں سلواتی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ملکہ رومانیا کی ایک تصویر کا حوالہ دیا ہے جس میں وہ سلائی مشین چلا رہی ہیں اور بتایا ہے کہ قیصرہ الگزینڈرا اتنے اعلیٰ درجہ کی سلائی جانتی اور سیتی ہیں کہ سب دنگ رہ جاتے ہیں۔

مسز محمد عبداللہ نے بھی ''سینا پرونا'' کے عنوان سے مضمون میں سلائی کو ایک بہت بڑا ہنر قرار دیتے ہوئے اس ہنر سے ناواقف خواتین کو پھوہڑ اور بے سلیقہ قرار دیا۔ انھوں نے انگریزی طرز

معاشرت کی تقلید کرنے والی خواتین کو طنز کا نشانہ بنایا کہ فیشن کی اندھا دھند تقلید میں نامحرم مردوں سے لباس بنوانا بھی انھیں گراں نہیں گزرتا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بلوچستان، پشاور اور ملتان کی خواتین کی سلائی کڑھائی اور ان کے ہاتھ سے بنے ہوئے دستکاری کے نمونوں کو بے مثال قرار دیا۔ مصنفہ نے ہر سال ہندستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والی سوزن کاری کی نمائشوں کو خواتین کے لیے مفید قرار دیا۔[۸۴]

مولوی سید احمد دہلویؒ نے ''عورتوں کے من گھڑت مسئلے'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین میں توہم پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو موضوع بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض باتیں احتیاطاً، بعض وہماً اور بعض رسماً اس قدر دلنشیں ہو جاتی ہیں کہ وہ طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ ہندوؤں میں برہمنوں نے اور مسلمانوں میں نیم ملاؤں نے ان پڑھ خواتین کو طرح طرح کے توہمات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ نہ ان توہمات کا نصِ قرآنی میں ذکر ہے اور نہ تفاسیر سے ان کی سند ملتی ہے۔ مثلاً قینچی بجانے سے لڑائی ہونا، ہانڈی چاٹنے سے شادی پر بارش ہونا، جوتی پر جوتی چڑھنے سے سفر درپیش ہونا، دانت ٹوٹنے پر زبان لگانے سے نئے دانت ٹیڑھے نکلنا اور بے شمار ایسے توہمات بے سروپا اور من گھڑت ہیں جن کی کوئی عقلی بنیاد نہیں۔[۸۵]

بنت حفیظ اللہ نے ''میٹھی زبان'' مضمون میں انسانی جسم میں سب سے بہتر اور سب سے بدتر چیز زبان کو قرار دیا ہے۔ زبان کو انسان اکسیر بھی بنا سکتا ہے اور زہر ہلاہل سے بدتر بھی یہ ثابت ہو سکتی ہے۔ مصنفہ نے خواتین کو میٹھی زبان کے فوائد بتاتے ہوئے کہا کہ میٹھی زبان سے غیر اپنے ہو جاتے ہیں، پردیس میں دیس کا مزہ مل سکتا ہے اور جو کام تلوار سے نہیں ہو سکتا وہ چند میٹھے بول انجام دے سکتے ہیں۔ ہر ایک کے دل میں محبت کا بیج بونے کے لیے میٹھی زبان سے بڑھ کر تیز بہدف نسخہ کوئی نہیں۔[۸۶]

علامہ راشد الخیری نے ''بڑوں کا ادب'' کے عنوان سے مضمون میں جہاں ترقیِ نسواں کو سراہا وہاں اس بات پر تنقید بھی کی کہ خواتین نے مغربی تقلید میں اچھی بری اقدار میں امتیاز کیے بغیر سب کچھ اندھا دھند اپنا لیا۔

نئی تہذیب کے ساتھ جہاں جہالت کا خاتمہ ہوا، تعویز گنڈوں اور تعصبات سے خواتین دور ہوئیں وہاں ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ نوجوان نسل نے بڑوں کا ادب کرنا چھوڑ دیا۔ علامہ نے تاریخ اسلام سے بڑوں کے ادب کی مثالیں پیش کرتے ہوئے نوجوان نسل کو غصہ ضبط کرنے کا درس دیا اور بولنے سے پہلے تولنے کا مشورہ دیا اور اس بات کی تلقین کی کہ آج اگر وہ خود بڑوں کا ادب نہیں کریں گے تو اپنے چھوٹوں سے بھی تعظیم کی توقع نہ رکھیں۔ ۸۷

''عید کی خوشی''، مضمون میں علامہ راشد الخیری نے فرض پورا کرنے کی خوشی کو سب سے بڑی خوشی قرار دیا ہے۔ عید الفطر کو بھی انھوں نے ایک ایسی ہی خوشی قرار دیا ہے جو تمام مسلمان مرد و خواتین کو اپنے فرائض (روزے رکھنے کی صورت میں) کی ادائیگی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ عید کی جو اصل وجہ تھی وہ مسلمان فراموش کر چکے ہیں۔ عید کی تیاریوں میں بے تحاشا پیسہ بہایا جاتا ہے چاہے روزہ ایک بھی نہ رکھا ہو لیکن کپڑے ایک سے بڑھ کر ایک بنائے جاتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ ماہ رمضان کی اصل غرض و غایت روزے رکھ کر غریب اور نادار طبقے کی تکلیف کو محسوس کرنا ہے، یتیم بچوں کے سر پر دستِ شفقت رکھنا ہے۔ انھوں نے عصمتی خواتین کی توجہ ان فرائض کی ادائیگی کی طرف مبذول کرائی جن سے سچی خوشی حاصل ہوتی ہے اور توقع کی کہ وہ ان کی باتوں پر ضرور عمل پیرا ہوں گی۔ ۸۸

''گھر کی صفائی'' کے عنوان سے مسز خواجہ محمود حسین (فخرِ جہاں) نے نہایت ہی ضروری بحث شروع کی ہے۔ عموماً تعلیم یافتہ خواتین کا خیال ہوتا ہے کہ انگریزی وضع کے مکانات اور کوٹھیوں میں ہی صفائی اور خوشنمائی نظر آتی ہے اور دیسی طرز کے مکانات میں صفائی اور خوشنمائی پیدا ہونا ناممکن ہے۔ مسز خواجہ محمود حسین نے کچھ تجاویز پیش کی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ناممکن کام کو ممکن بنایا جا سکتا ہے مثلاً ان کا کہنا ہے کہ گھر کے دالان کو ذرا سی تبدیلی سے ڈرائنگ روم بنایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسی دالان سے اکٹھے اتنے کام نہ لیے جائیں کہ کھانے، سونے، اٹھنے، بیٹھنے اور ملاقاتیوں سے ملنے کے کام میں لایا جائے۔ گھر کا ایک حصہ ملاقاتیوں اور عزیزوں سے ملنے اور ایک کھانا کھانے کے لیے مخصوص کیا جائے اور بدبو دور کرنے والے انگریزی سفوف اور پوڈر ہوا صاف کرنے کے لیے استعمال میں لائے

جائیں۔اس کے علاوہ خواتین اپنی سستی وکاہلی کی وجہ سے گھر کا سامان ظروف و پارچہ جات وغیرہ اپنے بیٹھنے کے کمرے میں رکھتی ہیں جو خوشنمائی پیدا ہونے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ چیزوں کی حفاظت اوران کی صفائی کے لیے ہر چیز کی مخصوص جگہ ہو:

> چیزوں کی حفاظت اوران کی صفائی کا بڑا گر یہ ہے کہ ہرایک چیز کے واسطے ایک مخصوص جگہ ہواور ہر چیز اپنی جگہ پر رہے۔یعنی ایسی کوئی چیز خریدنی نہ چاہیے جس کے رکھنے کے واسطے ہمارے ہاں گنجائش یا کافی جگہ نہ ہو۔اور جس جگہ سے جو چیز لی جائے بعد استعمال کے وہیں رکھدی جائے۔ ۸۹؎

امۃ الوحید بیگم نے ''چند مفید باتیں'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین کو کچھ سنہری اصول بتاتے ہوئے کہا کہ سب سے بہتر کام وہ ہے جو اللہ کا نام لے کر شروع کیا جائے اور جس چیز میں خیانت نہ ہو اس میں برکت ہوتی ہے۔فضول خرچی نہ کرنے ، اچھی کتابوں کا مطالعہ کرنے ، اچھی صحبت اختیار کرنے اور قلم کی زبان اپنے قابو میں رکھنے، دنیا کی محبت ترک کرنے ،اوسط درجے کا لباس پہننے ،خرچ آمدنی کے مطابق کرنے ، استاد اور باپ کو برابر سمجھنے،نصیحت پر پہلے خود عمل کرنے ، پھر دوسروں کو کرنے ، بڑوں سے مشورہ کرنے ،موت کو ہر وقت یاد رکھنے، بزرگوں کی خدمت کرنے اور دل صاف رکھنے سے انسان دنیا وآخرت دونوں میں سرخرو ہوتا ہے۔خودی،غروراور تکبر کا شمار عادات بد میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ خواتین ان باتوں پر عمل کر کے اپنی دینی و دنیوی زندگی کو جنت بنا سکتی ہیں۔ ۹۰؎

علامہ راشد الخیری کے مضمون '' کیا ہماری خواتین نے کچھ ترقی کی'' میں پہلے اور بعد کی خواتین کا موازنہ کیا گیا۔ترقی نسواں سے پہلے بیویاں اپنی زندگی کا مقصد صرف بال بچوں کی دیکھ بھال اور شوہر کی خدمت کرنا سمجھتی تھیں ۔ان کا علم صرف ناظرہ قرآن پاک تک محدود تھا۔ جب کہ تعلیم نسواں کی ترقی کے ساتھ خواتین میں اپنے فرائض کی بجا آوری کا احساس پہلے سے بڑھ گیا۔اور گھریلو فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ وہ معاشرے اور ملک کو بھی اپنی ذات سے فائدہ پہنچارہی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ وہ مذہب سے دور ہو گئیں جب کہ مذہب ہی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے مضبوط ہتھیار کا کام دیتا ہے۔علامہ کے نزدیک دین بیچ کر دنیا کمانے کا سودا نفع

نہیں بلکہ نقصان کا سودا ہے اور اسے ترقی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ [۹۱]

مسز عزیز نے ''غصہ'' کے عنوان سے مضمون میں غصے کو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ قرار دیا ہے۔ غصہ عقل کا دشمن ہے، کمزور طبیعت کے لوگ اس کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ مصنفہ نے خواتین کو غصہ ضبط کرنے کی ہدایت کی۔ اور غصہ کی جگہ سے ہٹ جانے اور دوسرے کاموں میں مشغول ہونے کا مشورہ دیا۔ اسلام میں بھی غصہ پر قابو پانے کے لیے پانی پینے، کھڑے ہو تو بیٹھنے، اور شیطان سے پناہ مانگنے کی دعا پڑھنے کا کہا گیا ہے۔ کیونکہ غصہ بڑھ کر جنوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو انسان کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ [۹۲]

۷.۱۔ تربیتِ اطفال میں کردارِ نسواں

سراج الدین صاحب فورمن کالج لاہور کے مشہور پروفیسر تھے۔ انھیں ملک کی تعلیمی ترقی کا بہت خیال تھا۔ ان کی اہلیہ فیروزہ سراج الدین بھی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اس طرح کوشاں تھیں جس طرح وہ لڑکوں کی تعلیم کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ ''ننھوں کی نگہداشت'' کے عنوان سے مضمون میں محترمہ فیروزہ صاحبہ نے ماؤں کو بچوں کی تربیت کے سنہری اصولوں سے مختلف مثالوں کے ذریعے آگاہ کیا۔ دوسروں کے سامنے بچے کو ڈانٹنے، شیطان کہہ کر پکارنے، ان کی کمزوریوں اور نقائص کا ان کے سامنے ذکر کرنے، ہر وقت دھتکارنے اور جھڑکنے سے بچہ ڈھیٹ اور ضدی ہو جاتا ہے اور اچھا بننے کی کوشش ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح کسی نئے بچے کی پیدائش پر اس کے بڑے بہن بھائی سے یہ کہنا کہ یہ سب چیزوں میں تمہارا حصہ بٹائے گا، تمہارے والدین اب پہلے کی طرح تمہیں پیار نہیں کریں گے، جان بوجھ کر حسد اور دشمنی کا بیج بونے کے مترادف ہے۔ مصنفہ کے مطابق بچوں کا دل دکھنا ان کا دل جیتنا اور تسلی بخش جوابات سے ان کا دل بڑھانا بہت ہی فائدہ مند کام ہے۔ [۹۳]

بلاشبہ بچوں کی تربیت میں ماؤں کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ ابتدائی چار پانچ سال جو بچہ گھر میں گزارتا ہے وہ اس کی عادتیں بگاڑنے یا سنوارنے میں بہت اہم ثابت ہوتے ہیں۔ بنت نذر الباقر نے ''مہذب گھر'' کے عنوان سے مکالماتی مضمون میں جدید تعلیم کو موضوعِ بحث بنایا۔ اس مضمون میں مصنفہ نے ایک ایسے مہذب گھر کا حال بیان کیا جہاں گھر کی تعلیم یافتہ خواتین ابتدائی ۸ سال تک گھر

کے بچوں کو خود پڑھاتیں اور ان کی تربیت کرتیں اور اس کے بعد انھیں اسکول بھیجا جاتا۔ یہ خواتین نہ صرف بچوں کو مذہبی تعلیم سے آشنا کرتیں بلکہ عہد جدید کے رجحان کے مطابق انگریزی زبان بھی بہت ہی سادہ اور عام فہم انداز میں سکھاتیں، مار پٹائی کی بجائے بچوں کا چائے پینا، کیک کھانا وغیرہ بند کر کے انھیں سبق یاد کروایا جاتا اور انگریزی سکھانے کے لیے عام بول میں انگریزی زبان کا استعمال کیا جاتا اور اردو اشعار کا انگریزی ترجمہ کروایا جاتا۔ ایسے مفید مضامین تربیتِ اطفال میں ماؤں کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہو رہے تھے۔ [۹۴]

''مہذب گھر'' کے عنوان سے شائع ہونے والے پہلے مضمون میں بنت نذر الباقر صاحبہ نے ایک ایسے گھر کی روزمرہ زندگی کا نقشہ کھینچا تھا جس میں نئی تعلیم نے عورتوں مردوں دونوں کو مغربی تہذیب کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ نہ صرف ان کی عادات و اطوار مغربی رنگ میں ڈھلے ہوئے تھے بلکہ بول چال تک انگریزوں کی تقلید میں رنگی ہوئی تھی۔ اس مضمون کے دوسرے نمبر میں انھوں نے نئی اور پرانی تہذیب کے دونوں نمونوں کو جمع کر کے ان کے ملاپ کی مشکلات پر روشنی ڈالی۔ اس مضمون میں انھوں نے لکھنؤ کے ایک ہندُستانی گھر کا نقشہ کھینچا جہاں مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں کی تقلید میں تیج منانے، جھولا جھولنے اور پکوان بنانے کا رواج تھا۔ وقت کا زیاں کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ آداب مہمان نوازی سے ناواقفیت تھی۔ مرغن غذائیں اور پرتعیش کھانے کھاتے ہوئے صحت کا خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ مصنفہ نے مغربی تہذیب کو پرانی ہندُستانی تہذیب سے بدرجہا بہتر قرار دیا۔ [۹۵]

ن۔ ا بیگم نے ''بچوں کے اخلاق کی درستگی'' مضمون میں ماؤں کو لڑکوں کے بگڑے اخلاق کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں گھروں میں ہی تربیت کے اصول اتنے خراب ہیں جن سے بچوں کی بُری اٹھان ہوتی ہے۔ محض اپنے آرام کے لیے اور بچوں کی ضد سے بچنے کے لیے مائیں خود جھوٹ بول کر بچوں کو بھی جھوٹ کی تربیت دیتی ہیں۔ لڑکے اطاعت اور فرماں برداری کا سبق اس لیے نہیں سیکھ پاتے کہ ان پر یا تو اس قدر سختی کی جاتی ہے کہ وہ تنگ آ کر نافرمانی کے عادی ہو جاتے ہیں ہیں یا ان کو اس قدر آزادی دی جاتی ہے کہ انھیں یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ بڑوں کا حکم بھی کوئی چیز ہے۔

بچوں کے اختیار سے باہر کام کا انھیں کہنا ہی نہیں چاہیے۔اگر کہیں بھی تو بہت شفقت سے اور کام کرنے پر اسے شاباش دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔مصنفہ کے خیال میں ماں باپ کو اپنے بچوں کے ساتھ ایسا رویہ رکھنا چاہیے کہ بچے بلا جھجک ہر بات ان کے سامنے کرسکیں۔اس سے بچوں کے خیالات معلوم ہونے سے ان کی اصلاح ممکن ہو سکے گی۔[۹۶]

کنیز محمد بیگم منشی فاضل ''تعلیم جدید اور ہندستانی لڑکیاں'' کے عنوان سے مضمون میں جہاں تعلیم جدید کی وجہ سے خواتین کے توہمات ختم ہو جانے اور حفظان صحت کے اصولوں سے واقفیت حاصل ہونے کو سراہتی ہیں وہاں کچھ نقائص سے بھی آگاہ کرتی ہیں جن میں سرفہرست خواتین کا امورِ خانہ داری سے نابلد ہونا اور اپنے گھریلو فرائض کی بجا آوری سے پہلو تہی کرنا شامل ہے۔انھوں نے اس کا ذمہ دار ماؤں کو ٹھہرایا اور انھیں بچیوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی امور، خانہ داری، دستکاری اور عمدہ اخلاق سکھانے کی ہدایت کی تا کہ وہ عملی زندگی میں ناکام نہ ہوں۔[۹۷]

عائشہ بیگم ''بچوں کی بری عادتیں'' کے عنوان سے مضمون میں ماؤں کی بچوں کی بری عادات کی پروا نہ کرنے پر تنقید کرتی ہیں۔ان کے بقول بچوں کی یہ عادات مثلاً چوری، جھوٹ، دوسروں کو مارنا، باہر سے چیز گھر اٹھا لانا، چیزیں توڑ پھوڑ دینا، ماں کی اجازت کے بغیر کھالینا اور ماں کے رکھے ہوئے پیسے خرچ کر دینا وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہو جاتی ہیں اور ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں، ان عادات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ماؤں کو چاہیے کہ وہ بچوں کو جسمانی سزا دینے کی بجائے ان کا جیب خرچ، چائے وغیرہ بند کر دیں، دوسرے بچوں کے ساتھ بات چیت، اپنے ساتھ سلانا چھوڑ دیں تا کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔ [۹۸]

محترمہ شائستہ اختر بانو سہروردی نے ''تعلیم یافتہ لڑکیاں اور ان کی ماؤں کی بے جا ناز برداری'' کے عنوان سے مضمون میں ان ماؤں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو اپنی تعلیم یافتہ بیٹیوں کے مغربی رنگ ڈھنگ سے مرعوب ہو کر انھیں منع کرنے کی بجائے ان کے ناز نخرے اٹھا کر انھیں اور شہ دیتی ہیں۔مائیں لڑکیوں کو نیم عریاں لباس پہننے، سرخی پاؤڈر لگانے، مردوں کے ساتھ بے باکانہ ہنسی مذاق کرنے سے نہیں روکتیں، نہ گھر کے کام نہ کرنے پر سرزنش کرتی ہیں جس کی وجہ سے ایسی اولاد ماؤں کو

جھڑکتی، بات کاٹ دیتی، بلا اجازت کہیں چلی جاتی اور ٹکا سا جواب دے دیتی ہے۔ مصنفہ نے ماؤں کو تاکید کی کہ وہ اپنا طرزِ عمل ایسا رکھیں جوان کی بیٹیوں کے لے چراغ راہ کا کام دے۔ [۹۹]

دختر صاحبزادہ عبدالمجید خاں از رامپور نے اپنے مضمون ''تعلیم و تربیت'' میں تعلیم نسواں کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے اور اس نازک مسئلے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ''تعلیم نسواں'' کے نعرے تو بہت بلند کیے جاتے ہیں مگر باقاعدہ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ لڑکیوں کو مولوی صاحب سے ۱۲ سال کی عمر تک پڑھایا جاتا ہے۔ اس دوران وہ ناظرہ، فارسی اور اردو معمولی حد تک لکھ پڑھ جاتی ہیں۔ کچھ لوگ عورتوں کی تعلیم کو ضروری سمجھتے بھی ہیں اور چاہتے بھی ہیں کہ ان کی خواتین تعلیم یافتہ ہوں مگر وہ بھی اس ضمن میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے۔ بس عورتوں کو ناقص العقل گردانتے ہیں۔

> کیا شرع کی رُو سے تعلیم نسواں ممنوع ہے؟ ہمارے اسلاف کے وقت میں تعلیم نسواں کا رواج تھا یا نہیں؟ اور یہ کب سے اور کیوں موقوف ہو گیا؟ امرِ اوّل کے نسبت سب یہ ہی کہیں گے کہ تعلیم نسواں ممنوع نہیں شرع کی رُو سے عورتوں کو پڑھانا جائز ہے۔ اور اگر ناجائز ہوتا تو اہل اسلام کی عورتیں جو مقدسہ سمجھی جاتی ہیں جو واقعی میں اس لائق تھیں کہ ہم انکے نقش قدم پر چلتے اور ان کی چال کو اپنا دستور العمل بناتے وہ علم اور فضل سے ضرور محروم رہتیں۔ ظاہر ہے کہ علم کے بغیر شرع کو مرد ہو یا عورت کوئی بخوبی نہیں جان سکتا۔ [۱۰۰]

دختر صاحبزادہ عبدالمجید خاں نے دین میں ترقی اور کاملیت کے لیے بھی حصول تعلیم کو مسلّم قرار دیا ہے۔ صرف نماز روزے کی پابندی تک خواتین نے خود کو محدود کر رکھا ہے اس سے زیادہ وہ اور اپنے مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانتیں۔ بھوت پریت، دیو و پری اور چڑیل کی قائل ہیں۔ جادو ٹونے کو بھی مذہبی عقائد میں شمار کرتی ہیں۔ چاروں طرف تعلیمِ نسواں کا چرچا ہونے کے باوجود مناسب مذہبی تعلیم کی طرف کسی کا دھیان نہیں جس سے خواتین کے عقائد درست ہوں۔ اولاد کی پرورش ماں کی گود میں ہوتی ہے۔ آٹھ نو برس بچے کی سیکھنے کی عمر ہوتی ہے اور ماں کی تعلیم اور تربیت کا اس پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اس لیے خواتین کے لیے حصول علم بہت ضروری ہے کیونکہ جس قدر عمدہ تربیت بچہ ماں سے

حاصل کرسکتا ہے وہ کسی اور ذریعے سے ہرگز ممکن نہیں۔

رسالہ عصمت سے بیس برس پہلے دہلی میں خواتین کے لیے اخبار النساء نامی اخبار نکالا گیا اور مولوی سید احمد صاحب دہلوی فرہنگ آصفیہ کے مشہور مؤلف اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس اخبار میں مولوی صاحب نے مفید مضامین کا ایک سلسلہ ''بچوں کا رکھ رکھاؤ'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ رسالہ عصمت کے لیے بھی اسی سلسلے کی تازہ قسط مولوی صاحب نے جون ۱۹۰۸ء کے رسالہ عصمت کے لیے بھجوائی اور عصمت میں ''بچوں کا رکھ رکھاؤ'' سلسلہ کسی قدر ترمیم کے ساتھ شائع کرنے کے لیے عنایت کیا۔

''ناسمجھ مائیں'' کے عنوان سے مضمون لکھ کر انہوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مامتا سے بڑھ کر کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ اور ماں سے زیادہ بہتر کوئی بچے کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا۔ اپنے بچے کی ذراسی تکلیف پر وہ تڑپ اٹھتی ہے اور ہر ممکن طریقے سے اس کی تکلیف اور پریشانی دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ کہ مامتا کا جذبہ تو ہوتا ہے لیکن تعلیم نہ ہونے کے سبب سمجھ نہیں ہوتی کہ اس دکھ یا تکلیف کے اصل سبب پر غور کرے اس کے برعکس سیّدوں کے تھان پر پیغمبر کے مزاروں پر جا جا کر ناک رگڑتی ہے۔ جس سیّانے ملّانے کا پتا چلتا ہے وہاں لے جاتی ہے اور بچہ اس دوران گھل کر رہ جاتا ہے۔ بچے کی اس حالت کی ذمہ دار بھی یہ ناسمجھ مائیں ہی ہوتی ہیں کیونکہ وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتیں جن سے بچہ بالکل تندرست رہے اور وہ خود اپنے بچوں کا علاج وقت گزر جانے سے پہلے کرلیا کریں۔ مائیں چونکہ ان پڑھ ہیں وہ اپنی سمجھ کے مطابق حکیم، ملا، سیانے کے پاس لے جاتی ہیں جو نیم حکیم خطرہ جان کے موافق اپنی دکان سجائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اب وہ علمِ طب سے بخوبی واقف ہیں یا نہیں ان پڑھ مائیں کیسے جان سکتی ہیں۔[۱۰۱]

''بچوں کا رکھ رکھاؤ'' اس سلسلے میں سید احمد دہلوی صاحب نے بچوں کے امراض کی شناخت، ان کا آسان علاج (جو ہر ماں خود کرلے) بیان کیا جو انھوں نے اس فن کے نامی حکما، یورپ کے رسالوں، اقوالوں اور اپنے ہندستانیوں کے ذاتی تجربوں سے لکھا ہے۔ تاکہ وہ خواتین جو ناگری یا

بچوں کی گورنس کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ وہ ہر وقت کام آنے والی دوائیں اپنے پاس رکھیں اور گنڈے تعویز کی بجائے آسانی سے میسر آنے والی ادویات کے نام کاغذ پر اپنے پاس لکھ کر رکھ لیں۔

''بچوں کا رکھ رکھاؤ'' کے قسط وار سلسلے میں ''نیند کا بیان'' کے حوالے سے مولوی صاحب نے بچوں کی زیادہ سے زیادہ نیند کو ان کی صحت اور تندرستی کی علامت قرار دیا۔ ہندُستانی خواتین کی بچوں کو افیون کھلانے کی عادتِ بد کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انھوں نے افیم کو چیچک، مرگی، قبض، صرع، خارش، پسلی کے خلل، توانائی کی کمی اور کاہلی کے بڑھنے کا سبب قرار دیا۔ افیون پٹھوں، دماغ، اعضا اور اندرونی قوئ کو مضمحل اور کمزور کر دیتی ہے جس کی وجہ سے بڑے ہو کر بھی طبیعتیں آرام طلب، دل سست اور حیلہ جو ہو جاتے ہیں۔[۱۰۲]

۱.۸۔ سیاسی بیداریٔ نسواں

سلطان صاحب نے ''مسلمانانِ ہندُستان اور ٹرکی'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ٹرکی اور بلگریا (بلغاریہ) میں دستوری حکومت کا اعلان ہوتے ہی بعض ہمسایہ ریاستوں نے خودسری شروع کر دی تاکہ ترکوں کو بیرونی جھگڑوں میں پھنسائے رکھیں اور اندرونی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہونے دیں۔ آسٹریا نے نہ صرف دو ریاستوں کا اپنے ساتھ الحاق کر لیا بلکہ بلگریا کو بھی خودمختاری کے لیے ابھارا۔ ترکی رعایا نے آسٹریا کی مصنوعات خریدنا چھوڑ دیں تاکہ انھیں مالی نقصان اٹھانا پڑے۔ ترکوں نے آسٹریا کی بنی ہوئی سرخ ٹوپیاں اتار کر اپنے ملک کی بنی سفید ٹوپیاں اوڑھ لیں۔ مصنف نے سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین کا خیال کرتے ہوئے ہندُستانی مسلمانوں کو بھی آسٹریا کی مصنوعات خریدنے سے منع کیا۔ مصنف نے قومی اور مذہبی ہمدردی کا پاس کرتے ہوئے خاص طور پر خواتین پر زور دیا کہ وہ تاجر حضرات سے روزمرہ استعمال کی اشیا خریدتے ہوئے مراکش کی بنی ہوئی مصنوعات کا تقاضا کریں اور آسٹریا ساخت کی بنی اشیا واپس کر دیں اور کوشش کریں کہ اپنے ملک کی بنی مصنوعات خریدیں تاکہ اپنے ملک کو فائدہ ہو۔[۱۰۳]

والدہ سید معین الامام نے ''بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائی نہیں جاتی'' کے عنوان سے مضمون میں خواتین کو گہری نیند سے جاگنے کا کہا قبل اس کے کہ ان کا جاگنا بے فائدہ ثابت ہو۔ مصنفہ نے

خواتین کو احساس دلایا کہ اسلام کتنے بڑے خطرے سے دوچار ہے۔ طرابلس (جو مسلمانوں کے بزرگوں نے اپنے قوت بازو سے فتح کیا تھا، جس کو حضرت ابن زبیرؓ نے گریگوری جیسے بادشاہ کو شکست فاش دے کر فتح کیا تھا) پر آج صلیبی جھنڈا الہرا رہا ہے۔ مراکش اسلامی قبضہ سے نکل رہا ہے۔ ایران بھی نکلنے والا ہے، بلقان میں بھی جنگ ہو رہی ہے لیکن وائے افسوس کہ مسلمان ابھی تک خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوئے۔ مصنفہ نے خواتین کو روزمرہ ضروریات سے بچت کر کے مالی امداد کے ذریعے میدان جنگ میں نبرد آزما مسلمان بھائیوں کے کام آنے کا کہا اور اپنے شوہروں اور بیٹوں کو جوش دلا کر تقاریر کر کے چندہ جمع کر کے فراہم کرنے اور عیش و آرام حرام سمجھ کر اس خطرناک وقت میں مقام خلافت کی مدد کرنے کا مشورہ دیا۔ ۱۰۴

بلقیس بیگم نے ''اتفاق'' مضمون میں خواتین کو اتفاق کے فوائد گنواتے ہوئے کہا کہ اتفاق کی بدولت ہی شہر آباد رہتے ہیں۔ دلی میں نااتفاقی کے سبب انگریزوں نے اس پر فتح حاصل کر لی۔ رعایا مسلمان حکمرانوں کی ستائی ہوئی تھی انگریزوں سے پناہ مانگ کر ان کی تابعدار ہو گئی۔ مصنف نے خواتین کو یہ احساس دلایا کہ مسلمانوں میں اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے ترکی تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ مسلمان ہندستانی خواتین کو چاہیے تھا کہ وہ خود جا کر غریب مصیبت زدہ ترکی بیوہ بہنوں کی دلجوئی کرتیں۔ مصنفہ نے مسلمانوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا جو نام کے تو مسلمان ہیں مگر چندہ تک دینے سے انکاری ہیں۔ مصنفہ نے خواتین میں آپس میں اتفاق پیدا کرنے پر زور دیا تا کہ وہ اتفاق سے کام لے کر چندہ جمع کر کے لاوارث ترکی بہنوں کی روپیہ سے مدد کر سکیں۔ ۱۰۵

بنت عطا محمد خان ''آیا اسلام ترقی کر رہا ہے یا تنزل؟'' کے عنوان سے مضمون میں اسلام کے تنزل کا سبب مسلمانوں میں اتفاق و اخلاق کی کمی کو قرار دیتی ہیں جبکہ مسیحی دنیا اجتماعی قوت سے کام لے کر اسلام کو شکست فاش دینے پر کمر بستہ ہے۔ مصنفہ نے خواتین کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے کہا کہ وہ ٹوٹکوں اور من گھڑت مسئلوں پر اعتقاد رکھ کر ناپاک جرائم کی مرتکب ہو رہی ہیں۔ مصنفہ نے خواتین کو دین اسلام کے صحیح اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ اٹلی کی بنی تمام مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کا کہا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہندستانی مسلمانوں کے بائیکاٹ سے اٹلی کو ناقابل تلافی

نقصان پہنچ رہا ہے۔ مصنفہ نے خواتین کو اس بات کی بھی ترغیب دی کہ ترکی کے مسلمانوں کی مالی امداد دل کھول کر کریں تاکہ کفر کی طاقت اسلام پر غلبہ نہ پا سکے۔[۱۰۶]

محترمہ کشور حمیدی صاحبہ "موجودہ جنگ میں عورتوں کا حصہ" کے عنوان سے مضمون میں رفاہی کاموں میں خواتین کی شمولیت کو سراہتے ہوئے کہتی ہیں کہ جنگ میں خواتین کا نرسنگ کے شعبے میں خدمات سرانجام دینا، محکمہ فوج میں بھرتی ہونا، بطور ٹائپسٹ اور کلرک کام کرنا ترقیِ نسواں کے باب میں بہت اہم پیش رفت ہے۔ مصنفہ نے ہندستان کے ساتھ ساتھ چین، نیپال، امریکہ اور برطانیہ کی خواتین کی ہمت اور حوصلے کو بھی داد دی جنھوں نے نہ صرف عملی طور پر جنگ میں حصہ لیا بلکہ سب سے بڑی قربانی ان کی اپنے بیٹوں، بھائیوں، شوہروں اور عزیزوں کو شوق سے ملک کے لیے قربان کرنے کی ہے۔ اس سے بڑی خدمت یقیناً ایک عورت کی طرف سے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔[۱۰۷]

عبدالحیٔ عباسی صاحب نے خواتین میں سیاسی شعور اجاگر کرنے کے لیے "تحریک نسواں کی ابتدا اور ترقی ملک اسلامیہ میں" کے عنوان سے مضمون میں ہندستان میں طبقۂ نسواں کی آزادی اور تعلیم جدید کی ترویج کی تحریک کو سراہا اور اس تحریک کے تحت آل انڈیا خواتین ہند کانفرنس کے ملک کے مختلف مقامات پر منعقدہ جلسوں سے خواتین کو آگاہ کیا۔ مصنف نے جنگ عظیم کے اختتام پر مشرق وسطیٰ کے ممالک میں خواتین کی آزادی، اخلاقی، معاشرتی و سیاسی زندگی میں مساوی حقوق کے حصول کو سراہا اور ترکی میں تحریک نسواں کے وجود کو ۱۹۰۵ کے آئینی انقلاب کا شاخسانہ قرار دیا۔ انھوں نے ترکی کی مشہور خواتین ادیبوں آمین سمیع خانم، خالدہ خانم، نقی خانم، مصطفیٰ کمال پاشا کی اہلیہ لطیفہ خانم کی طبقۂ نسواں کے لیے کی جانے والی کوششوں کی بھی داد دی اور مصر، شام، ایران اور عراق کی خواتین کی ترقی اور بیداری کا ذکر کرتے ہوئے مسلمان خواتین سے اپنے حقوق کی جنگ لڑنے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے تمام دشواریوں کا مقابلہ کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ بھی اپنے لیے ایک باعزت مقام حاصل کر سکیں۔[۱۰۸]

محترمہ شائستہ اختر سہروردی صاحبہ نے "روس نے کیوں کر تیاری کی" کے عنوان سے مضمون میں روسی خواتین کے اپنے مردوں کے شانہ بشانہ ہر میدان میں کام کرنے کو روس کی کامیابی

کا ذمے دار ٹھہرایا۔ روس نے ہوائی جہاز کے پرزے بنانے کا کام خواتین کے سپرد کیا۔ ہوابازی کی تربیت مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی دی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ اساتذہ اور کارخانوں میں کام کرنے والی خواتین بھی ہوائی جہاز اڑانے لگیں۔ روسی حکومت نے پچیس سال پہلے سے اس جنگ کی تیاری کر لی تھی اور عملی طور پر تمام اقدامات کر لیے تھے۔ روس نہ صرف سائنسی انقلاب لایا بلکہ خوراک وغیرہ کی پیداوار اور ذرائع آمد و رفت کو بھی اتنا جدید کر لیا کہ اسے کبھی ان معاملات میں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔[۱۰۹]

''سیاسی ماحول میں عورتوں کی ترقی کے وسائل'' کے عنوان سے مضمون میں محترمہ ایس۔ کے صغرا سبزواری صاحبہ نے طبقۂ نسواں کی تعلیمی ترقی کو ان کی سیاسی بیداری کا پیش خیمہ قرار دیا۔ ہندُستان کے ہر صوبے میں نہ صرف خواتین کو حق نیابت حاصل ہوا بلکہ ان کے جائز معاشرتی اور سیاسی حقوق بھی مکمل طور پر تسلیم کر لیے گئے۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی کارپوریشن میں خواتین کو نہ صرف ووٹ ڈالنے کا اختیار دیا گیا بلکہ ایک خاتون پہلی بار صوبہ جاتی کونسل کی ممبر بھی منتخب ہوئی۔ گول میز کانفرنس لندن میں بیگم شاہنواز کی شرکت نے ہندُستانی خواتین کے سیاسی حقوق کا سکہ جما دیا۔ روایتی خانہ داری کی تعلیم کے علاوہ خواتین نے اعلیٰ تعلیم لے کر ثابت کر دیا کہ وہ بھی کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض منصبی انجام دینے کی اہل ہیں۔[۱۱۰]

مسز سید احمد مچھلی شہری نے ''حق رائے دہندگی اور عورتیں'' کے عنوان سے مضمون میں روسی خواتین کی ہمت اور کامیابی کو سراہا جس کی بدولت وہاں کی حکومت نے انھیں مردوں کے مقابلے میں ہر معاملے میں مساوی حقوق دے دیے ہیں۔ لیکن کچھ مغربی ممالک جیسے فرانس، اٹلی اور اسپین میں ابھی خواتین کو حق رائے دہی نہیں دیا گیا۔ انگلینڈ میں بھی خواتین نے سخت مصائب اور سزائیں کاٹنے کے بعد حق رائے دہندگی حاصل کیا اور ۱۹۱۸ء میں پہلی خاتون جس پارکھرسٹ پارلیمنٹ کی ممبر بنائی گئیں۔ انگلینڈ میں بھی ۱۹۳۸ء میں گورنمنٹ نے مجبور ہو کر خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق دیے ہندُستان میں بھی کانگریس نے خواتین کو سیاسی زندگی میں شامل ہونے کا موقع دیا تاہم مصنفہ کے نزدیک ہندُستان کو اپنے نصب العین کے حصول کے لیے نسائی تحریک کو کامیاب کر کے انھیں تعلیم یافتہ

شہری بنانا ہوگا۔[۱۱]

نصیرالدین ہاشمی صاحب نے ''خواتین یورپ اور ہندستان کی مسلمان عورتیں'' کے عنوان سے مضمون میں دونوں طرف کی خواتین کی سابقہ حالت پر تبصرہ کیا اور نشاۃ ثانیہ کو خواتین کی ترقی کا آغاز ٹھہرایا۔ انھوں نے موسیو لیبان اور پروفیسر اسکاٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان دونوں حضرات نے خواتین کی عزت اور ترقی کی بنیاد اسلام کو قرار دیا ہے۔ ۱۸۴۷ء میں لوئیس آٹو (Luise Otto) نے مسئلہ نسواں کے ایک مفصل پروگرام کے ذریعے معاملات حکومت میں خواتین کا حصہ لینا ان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا اور حکومت سے طبقۂ نسواں کی تعلیم، سیاسی حقوق اور معاشرتی آزادی کا مطالبہ کیا۔ مصنف کے مطابق ۱۸۶۵ء میں جان اسٹورٹ مل (Mohnstuant Mill) خواتین کے ووٹ کی بدولت ہی ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔ اس کے برعکس ہندستان میں مسلمان خواتین کو وہ حقوق حاصل نہیں ہوئے جو زمانہ قدیم کی مسلمان خواتین کو حاصل تھے اور جن کا اعتراف غیر مسلم مؤرخین نے بھی کیا ہے۔ مصنف نے عطیہ بیگم فیضی کے نام مولانا شبلی نعمانی کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ:

> یہ امر اور بھی باعثِ افسوس ہوتا ہے جبکہ خود ہمارے علما یورپین تمدن عورتوں کے لیے پسند کرتے ہیں مگر اس کا اعلانیہ اظہار نہیں کر سکتے۔[۱۲]

نصیرالدین ہاشمی نے مولانا شبلی نعمانی کے حوالے سے کہا کہ مولانا خواتین کے لیے یورپین معاشرت پسند کرتے تھے اور خواتین کی بات چیت، گفتار، رفتار، نشست و برخاست مردوں سے الگ رکھنے کے مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ عورت ہر حیثیت سے مرد ہو جائے اور نہ صرف معاشرے میں مردوں کا مقابلہ کرے بلکہ مردوں کی طرح خود کمائے۔ مصنف نے بھی ہندستانی خواتین کے لیے یورپین خواتین کی طرح ہر میدان میں ترقی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

ر۔س صاحبہ نے ''مسلمان اور کانگرس'' کے عنوان سے مضمون میں علامہ اقبال کی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے حصولِ آزادی کے ساتھ ساتھ قومی حقوق اور قومی تہذیب کا تحفظ ضروری قرار دیا۔ مصنفہ نے مسلمانوں کے قومی انتشار، جمعیتی پراگندگی، تمدنی بے راہ روی، مذہبی انحراف، جہالت،

افلاس اور اخلاقی انحطاط کو میدانِ سیاست میں ان کی شکست کے اسباب قرار دیا۔ مصنفہ نے انگریزوں کے اقتدار سے زیادہ ہندو اقتدار کو مسلمانوں کے لیے خطرناک قرار دیا کہ اس سے مسلمان ہندو تہذیب میں رنگ کر اپنی قومیت، اسلامی تہذیب اور امتیازی نشانات سب فنا کر بیٹھیں گے۔ مصنفہ نے مسلمانوں کے اتحاد اور غیر مسلم تہذیب و اقتدار کی روک تھام کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔[۱۱۳]

محترمہ شبیہ فاطمہ ''سیاسی تحریکات اور مسلم خواتین'' کے عنوان سے مضمون میں مسلمان خواتین کی سیاسی لاعلمی کو ان کی خاطر خواہ تعلیم نہ ہونے کا اثر قرار دیتی ہیں۔ انھوں نے دنیا کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی جدوجہد اور کشمکش میں خواتین کی مردوں کے شانہ بشانہ بھرپور شمولیت پر زور دیا۔ مصنفہ نے ہندستانی سوشلزم کو روسی کمیونزم کا متبادل قرار دیا۔ انھوں نے اسلام کی رو سے سرمایہ داری کی مکمل تشریح کی اور جائز سرمایہ داری کو اسلام میں پسندیدہ قرار دیا۔ مصنفہ نے خواتین کو آنے والے انقلاب کے لیے تیار رہنے اور اس کے سدباب کی کوشش کرنے کا درس دیا۔[۱۱۴]

۱.۹۔ تعزیتی مضامین

مسز ممتاز علی (محمدی بیگم) کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود کے لیے انھوں نے اپنے شوہر مولوی ممتاز علی کے ساتھ مل کر رسالہ تہذیب نسواں جاری کیا اور اس رسالے کی مدیرہ کے فرائض سرانجام دیتی رہیں۔ ان کی بے وقت موت نے طبقۂ نسواں کو ایک عظیم سانحے سے دوچار کر دیا۔ محترمہ برج کماری صاحب نے ''ہائے موت'' کے عنوان سے مضمون میں موت کو ایک ایسا پردہ قرار دیا جو اسٹیج پر گرتے ہی منظر تبدیل کر دیتا ہے۔ محترمہ محمدی بیگم کو مصنفہ نے ایک غیر فانی کردار کا نام دیا جو اپنی زندگی میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دے گئیں جو ہندستان کی بہت کم خواتین انجام دے سکتی تھیں۔ ان کے رسالے تہذیب النسواں نے نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور عیسائی خاندانوں کے دلوں میں بھی گھر کر لیا تھا۔ لاہور میں انھوں نے ایک محتاج خانہ قائم کیا۔ جس کا افتتاح لیڈی گارڈن واکر صاحبہ نے کیا۔ لاہور میں ایک زنانہ لائبریری بھی قائم کی۔ طبقۂ نسواں کی فلاح کے لیے انمول موتی، سچے موتی اور صفیہ بیگم جیسی یادگار کتابیں

تصنیف کیں۔ مصنفہ نے جنت میں ان کے قیام کی دعا کرتے ہوئے ان کے پسماندگان کے لیے بھی صبر کی دعا کی۔ ۱۱۵

مدیر عصمت شیخ محمد اکرام نے بھی محمدی بیگم کے انتقال کو ایک عظیم سانحہ قرار دیا۔ خواتین جو پہلے اخبارات و رسائل میں اپنے مضامین دینے سے گھبراتی تھیں، محمدی بیگم کی کاوشوں کی بدولت خوشی خوشی اپنے مضامین شائع کرانے لگیں۔ ہندستان کے مختلف حصوں کی خواتین بذریعہ تہذیب النسواں تبادلۂ خیال کرنے لگیں جس سے نہ صرف انھیں ایک دوسرے سے غائبانہ شناسائی کا موقع ملا بلکہ اور بھی کئی مفید نتائج حاصل ہوئے۔ شیخ محمد اکرام نے محمدی بیگم کی تقلید کو خواتین کے لیے فائدہ مند قرار دیا اور امید ظاہر کی کہ ان کا کام انھیں تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ۱۱۶

مولانا رازق الخیری نے ''کمال اتاترک کا انتقال'' کے عنوان سے مضمون میں کمال اتاترک کو وہ غازی اعظم قرار دیا جنھوں نے متحدہ یورپ کی کوششوں کے پرخچے اڑا کر سلطنت ترکی کو ملیامیٹ ہونے سے بچایا اور حقوق نسواں کا سب سے بڑا علمبردار بن کر دنیا کی مسلمان خواتین کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔

مصطفیٰ کمال اتاترک تعلیم اسلام پر صحیح معنوں میں عمل کرنے والے حکمران تھے جنھوں نے اللہ اور رسولؐ کے حکم کے مطابق خواتین کو مردوں کے برابر حقوق دیے۔ مصنف نے کمال اتاترک کی وفات کو مسلمانوں کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیا اور ہٹلر اور مسولینی جیسے حکمرانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دنیا میں ایک اور کمال اتاترک کی موجودگی کو وقت کی اشد ضرورت قرار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ٹرکی کے نئے جانشین جنرل عصمت پاشا کی قیادت میں ترکی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ۱۱۷

ر۔س صاحبہ نے ''مصطفیٰ کمال اتاترک'' کے عنوان سے مضمون میں مصطفیٰ کمال اتاترک کی موت کو دنیائے اسلام کے لیے ایک عظیم سانحہ قرار دیا اور ان کی اولوالعزمی، صبر و استقلال کو سراہا جس کی بدولت انھوں نے ''بیمار ٹرکی'' کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔ مصنفین نے اس مرد مجاہد کے لیے نپولین اور سکندر اعظم کے نام تجویز کیے لیکن انھوں نے خود کو ''غازی مصطفیٰ کمال پاشا آف

ٹرکی'' کہلوانا پسند کیا۔[۱۱۸]

علامہ راشد الخیری کی وفات بلاشبہ طبقۂ نسواں کے لیے ایک محسن و مربی کی وفات سے کم نہ تھی۔محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ نے ''مصور غم کا کوہ الم'' کے عنوان سے دلی رنج وغم کا اظہار کیا۔اور مصور غم کی جدائی کو طبقۂ نسواں کی دنیا میں کبھی نہ پُر ہونے والے خلا سے تعبیر کیا۔[۱۱۹] محترمہ جمیلہ بیگم نے ''رانڈوں کا حمایتی'' کے عنوان سے اس روح فرسا خبر کو قوم کی بدنصیبی قرار دیا اوران کی خوبیوں اور قومی جذبات وخدمات کی بنا پر انھیں ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہستی قرار دیا۔[۱۲۰] مولوی محمد ظفر صاحب نے ''ملک کا نا قابلِ تلافی نقصان'' کے عنوان سے مرحوم کی مغفرت کی دعا کی اور قوم وملک کے لیے ان کی موت کو نا قابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔اور مولانا رازق الخیری سے مرحوم کی وفات پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا۔ [۱۲۱]

مولوی عبدالماجد دریابادی نے ''پتھروں کو موم کرنے والا انسان'' کے عنوان سے سرخی میں مرحوم کے پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی اور شب زندگی اور شامِ زندگی کے قارئین کے لیے ان کی ذات کو عزیزوں سے بھی بڑھ کر قرار دیا ہے۔[۱۲۲] ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ''اردو ادب کو صدمۂ عظیم'' کے عنوان سے مرحوم کی وفات کو اردو ادب کے لیے عظیم صدمہ قرار دیا اوران کی مغفرت کی دعا کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کی اشاعت جاری رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔[۱۲۳] جناب منشی پریم چند صاحب نے ''نسوانی حقوق کا حامی'' کے عنوان سے سرخی میں علامہ مرحوم کے اخلاق، وضع داری اور حساسیت کی تعریف کرتے ہوئے ان کی وفات کو نہایت دل شکن اور جانکاہ سانحہ قرار دیا۔[۱۲۴]

محترمہ ہمشیرہ ضیاء الدین صاحب نے ''شہنشاہ ادب کی دائمی جدائی'' کے عنوان سے مرحوم کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور انھیں اصلاح نسواں کا علم بردار، میدان ادب کا شہسوار قرار دیا۔ انھوں نے علامہ کی ذات کو یتیموں کا باپ، رانڈوں کا وارث، مظلوموں کا حمایتی، تاجدار ادب اور دہلی کی اردو زبان کو زندگی رکھنے کا موجب قرار دیا۔[۱۲۵] عصمت کے دیگر قارئین نے بھی علامہ راشد الخیری کی وفات پر ''دلّی کا آفتاب درخشندہ غروب ہوگیا''، ''عورتوں کا روحانی باپ''، ''بے کس فرقہ کا

حقیقی حامی‘‘، ’’اردو ادب کا حقیقی چراغ‘‘، ’’خواتین کی دولت بے بہا‘‘، ’’اردو ادب کی موت‘‘، ’’بلند پایہ سحر نگار ادیب‘‘، ’’ہمارا شفیق باپ‘‘، ’’چمن اردو کی بہار لٹ گئی‘‘، ’’ہمارے سچے خیر خواہ اور مصلح‘‘، ’’دلّی کی بد نصیبی‘‘، ’’ہمارا گوہر نایاب‘‘، ’’مظلوم عورتوں کا سچا ہمدرد‘‘، ’’طبقہ اناث کی یتیمی‘‘، ’’آہ طوطی ہند‘‘، ’’پیغمبر نسواں‘‘، ’’خدمت نسواں کا سب سے بڑا علمبردار‘‘، ’’ہمارا سب سے بڑا محسن‘‘، ’’زندہ جاوید مصنف‘‘، ’’اردو کا زبردست محسن‘‘، ’’خواتین ہند کی بد نصیبی‘‘، ’’ہمارا راہ نما‘‘، ’’حقوق نسواں کا حامی‘‘، ’’بے یار و مددگار طبقہ کا ہمدرد‘‘، ’’ہمارے غمخوار کی رحلت‘‘، ’’عورتوں کا سہارا‘‘، ’’مادر گیتی کوئی راشد سا بیٹا پھر جنے‘‘ اور ’’نسوانی طبقہ کا مخلص سرپرست‘‘ کے عنوانات کے تحت اپنے دکھ اور غم کا اظہار کیا۔

مولانا رازق الخیری نے ’’آہ! علامہ اقبال‘‘ کے عنوان سے مضمون میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی وفات کو دنیائے اسلام کے لیے نا قابلِ تلافی نقصان کا باعث قرار دیا۔ مصنف کے بقول علامہ اردو اور فارسی کے بہترین شاعر اور اسلام کے بہترین مفکر تھے۔ بڑے بڑے لیڈران کے افکار سے مستفید ہوئے۔ مذہب اسلام کی خاطر وہ آخر دم تک لڑتے رہے۔ مولانا رازق الخیری نے اقبال کو اسلام کا سچا پرستار، مشرقیت کا علمبردار، ملک کا ہمدرد اور قوم کا مصلح قرار دیا اور ان کے کلام کو آئندہ نسلوں کے لیے قلب کی تازگی اور روح کی بیداری کا ذریعہ قرار دیا۔[۱۲۶]

فکری و فنی لحاظ سے ماہنامہ عصمت کے مضامین ادبی شہ پارے تو قرار نہیں دیے جا سکتے تاہم انھوں نے اپنا گوہر مقصود ضرور پالیا۔ ماہنامہ عصمت میں شائع ہونے والے تمام مضامین اصلاحی اور مقصدی نوعیت کے حامل تھے۔ مصنفین کا اسلوب نگارش سادہ، سہل، بے ساختہ اور تصنع سے پاک تھا۔ ان مضامین کی سلاست اور روانی قارئین کے دل کو چھو لیتی ہے۔ مضمون نگاران عصمت کا مقصد چونکہ طبقۂ نسواں کی اصلاح، تربیت، رہنمائی، حقوق کی بحالی، تعلیم کی فراہمی، نصاب کا تعین اور ان میں سیاسی شعور اجاگر کرنا تھا، اس لیے انھوں نے سادگی و سلاست سے کام لے کر ادب کو اپنے خیالات کے لیے ذریعہ اظہار اور عوامی زندگی کا ترجمان بنایا اور یوں طبقۂ نسواں کی بیداری میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔

۲۔ سفرنامے

خارج سے متعلق بیانیہ اصناف ادب میں سفرنامہ سرفہرست ہے۔ سفرنامہ ادب، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ کا مجموعہ ہوتا ہے اور اس میں معلومات کے ساتھ ساتھ حیرت اور تجسس کے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔[۱۲۷]

ماہنامہ عصمت کے پہلے شمارے جون ۱۹۰۸ء میں محترمہ زہرہ بیگم صاحبہ فیضی نے بزم عصمت کے مستقل سلسلے میں عصمت کے لیے نہ صرف خود مضامین بھیجنے کا وعدہ کیا بلکہ اپنی بہن ہر ہائی نس جناب نواب بیگم صاحبہ ریاست جزیرہ کے حالات سفرِ یورپ بھی عصمت کو عنایت کرنے کا مژدہ سنایا۔ ہر ہائی نس نواب بیگم صاحبہ جزیرہ حبشان (نازلی رفیعہ سلطان) اپنے شوہر نامدار نواب صاحب بہادر، بھائی مسٹر علی اصغر اور اپنی چھوٹی بہن مس عطیہ فیضی کی ہمراہی میں یورپ کی سیاحت کو روانہ ہوئیں۔ ان کا عصمت میں قسط وار شائع ہونے والا یہ سفرنامہ ''سیر یورپ'' کے نام سے مشہور ہوا اور خواتین سفرنامہ نگاروں میں وہ اوّلیت کا مقام رکھتی ہیں۔ یہ سفرنامہ سفر یورپ کے دوران ہندستان میں قیام پذیر بزرگوں کو لکھے گئے خطوط پر مشتمل ہے۔ اس سفرنامے کی نمایاں پہچان نسوانی طرز تحریر ہے۔ ''سیر یورپ'' میں محترمہ نازلی رفیعہ سلطان صاحبہ نے ایک مشرقی عورت کی نظر سے یورپی تہذیب کا مشاہدہ کیا ہے جو دلچسپی کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ ایک روشن خیال، عالی مرتب بیگم صاحبہ کا اپنے شوہر کی معیت میں اتنا لمبا سفر طے کرنا اس زمانہ میں طبقۂ نسواں کی تاریخ میں ایک یادگار بات تھی۔

۲۵ اپریل ۱۹۰۸ء، کو اپالو بندر سے جہاز میسیڈونیا میں ان کے اس طویل سفر کا آغاز ہوا۔ ان کی جماعت میں کل آٹھ افراد شامل تھے، محترمہ نازلی رفیعہ سلطان صاحبہ، ان کے شوہر جناب نواب سر سیدی احمد خان بہادر جی۔ سی۔ آئی۔ ای، ان کے بھائی علی اصغر بیگ فیضی، ہمشیرہ عطیہ بیگم فیضی، سردار سیدی حسن، سیدی سعید صاحب، ڈاکٹر ہاشم لکھانی اور ایک ملازم اور ایک خادمہ۔ محترمہ کا یہ سفرنامہ اپنے اندازِ بیاں اور دلچسپ طرز تحریر کی بدولت انفرادیت کا حامل ہے۔ جہاز میں ان کی ملاقات مہارانی صاحب بڑودہ کی بھانجی جی جی بائی جن سے ہوتی ہے جو اپنے شوہر اور دو بچوں کے ہمراہ تین

سال کے لیے یورپ جارہی تھیں۔ جی جی بائی جن صاحب خود پڑھنے جارہی تھیں اوران کے شوہر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ جا رہے تھے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان خواتین کی نسبت ہندوخواتین آگہی وشعور کی منازل تیزی سے طے کررہی تھیں اور تعلیمی میدان میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک عورت کا اس زمانے میں شادی کے بعد شوہراور دو بچوں کی موجودگی میں تعلیمی سلسلہ جاری رکھنا یقیناً عصمتی خواتین کے لیے نہایت سبق آموز تھا۔ محترمہ نازلی رفیعہ سلطان صاحبہ کے پردہ چھوڑ کر آزادی سے باہر گھومنے پھرنے پر بھی بہت سی شخصیات نے ان کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔ مسٹر گوکھلے نے بھی ان سے پردہ کی بابت ہی سوال کیا جس پر انھوں نے کہا کہ:

> بے شک گراں گزرتا ہے مگر اتنا نہیں جتنا آپ کو خیال ہے کیوں کہ میری ایسی عادت ہے کہ جیسا وقت آئے گزار لیتی ہوں۔ [۱۲۸]

یقیناً خود کو حالات کے مطابق ڈھال لینا مشرقی خواتین کی بہترین خوبی شمار کیا جاتا ہے۔ سفر کے دوران اپنی مذہبی عبادت پوری لگن سے انجام دیتی رہیں۔ ان کے سفر میں جہاز کے اندر کا احوال پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگوں میں مذہبی تعصب بالکل بھی نہیں تھا۔ ہر جگہ رواداری کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ جہاز میں جہاں مسلمانوں نے نماز پڑھی وہاں کلکتہ کے پادری صاحب نے انجیل سے کچھ پڑھ کر سنایا جسے مسلمان بھی دلچسپی اور توجہ سے سنتے رہے۔ محترمہ کا انداز بیاں کافی شاعرانہ ہے۔

> اس بات سے جی ذرا دق ہوتا ہے اوپر آسمان نیچے آسمانی سمندر اور ہم گویا تنکوں کی طرح بہہ رہے ہیں۔ [۱۲۹]

ہندستانی اور یورپین طرزِ معاشرت کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مسلمان خواتین چوں کہ پردے کی پابند ہوتی ہیں اس لیے کیبن یعنی اپنا کمرہ ہی ان کے لیے سایہ عافیت ہوتا ہے۔ عرشے پر یا جہاز کے کسی حصے میں انھیں اطمینان اور سکون نہیں ملتا۔ اس کے برعکس انگریز خواتین نہ صرف عرشے پر آرام کرسی پر لیٹے رہتی ہیں بلکہ تمام مسافروں کے درمیان بھی بلا جھجک لمبی تان کر سوجاتی ہیں۔ سفرنامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ قدامت پرست نہیں بلکہ جدید فیشن جہاں دیکھتی

ہیں کھل کر اسے سراہتی ہیں:

> آج کل کا یہ فیشن ہے کہ بیبیاں چھوٹا سا دوپٹہ اوڑھتی ہیں اور اس سے یہ غرض ہے کہ بال ہوا سے بکھر نہ جائیں کسی کسی پر واقعی بہت سجتا ہے۔ ۱۳۰؎

زیورات خواتین کی ویسے ہی بڑی کمزوری ہوتے ہیں اور مصنفہ تو ہر ہائی نس نواب بیگم صاحبہ جزیرہ حبشان کی حیثیت سے ویسے ہی زیورات کی بہت دلدادہ معلوم ہوتی ہیں۔ خوب صورت اور قیمتی زیورات فوراً ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ایک روسی خاتون کے گلے میں موجود موتیوں کی لڑی کو سراہتی ہیں اور اس کا حال اس طرح بیان کرتی ہیں:

> پلاٹینم اور الماس کی کھولی میں سے بے شمار لڑیاں لٹکتی ہیں لیکن اصل خوبی اس جھمکے کے موتیوں میں ہے۔ ہر رنگ کا موتی اس میں ہے گلابی، آسمانی سب لڑیوں کی لڑیاں، رنگین سچے گول دانوں سے بنی ہوئی ہیں۔ واقعی نادر خیال ہے اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ ۱۳۱؎

ہر ہائی نس نواب بیگم صاحبہ جزیرۂ حبشان مسٹر دت اور اپنی چھوٹی بہن، عطیہ فیضی سے گفتگو کا حال بیان کرتی ہیں تو بڑی بہن کی شفقت اور پیار ان کے لہجے سے جھلکتا ہے۔ محترمہ عطیہ فیضی کی وسعت معلومات اور انگریزی زبان کی مہارت پر انگریزوں کا متاثر ہونا انھیں تسکین دیتا ہے۔ مشرقی عورت خواہ غریب اور متوسط طبقے کی ہو یا نواب بیگم ہو اس کا ازلی تجسس اسے کہیں پر بھی چین نہیں لینے دیتا۔ محترمہ نازلی صاحبہ بھی جہاں روسی خاتون کی وضع قطع سے متاثر ہوتی ہیں وہاں انھیں اس کے شوہر کے متعلق جاننے کا بھی اشتیاق رہتا ہے:

> بس ایک عقدہ نہیں کھلتا کہ اس کا شوہر ہے یا نہیں اور ہے تو کہاں ہے؟ کیوں کہ اپنے خاوند کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہتی۔ ۱۳۲؎

ایک عرصہ تک پردہ کی زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ کبھی کبھی اس ہنگامے اور شور سے بیزاریت کا اظہار بھی کرتی ہیں اور بن ٹھن کر رہنے اور دوسروں سے میل ملاقات کے لیے ہر وقت تازہ دم رہنے سے انھیں اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہندستانیوں کا ناچنا انھیں پسند نہیں لیکن یورپ سے کسی فن میں آگے بڑھنا انھیں اچھا لگتا ہے جو ان کی حب الوطنی کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنفہ کے اس سفرنامے سے

ان کے ذاتی کوائف بھی پتہ چلتے ہیں کہ ان کے والدین کا کاروبار استنبول میں تھا اور ان کی پیدائش بھی وہیں کی تھی۔ دورانِ سفر ان کا خطوط لکھنا اکثر لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے مگر ان کے نزدیک یہ ان کی تسکین کا ایک ذریعہ تھا:

> اپنے عزیزوں کو خط لکھنا گویا ان سے باتیں کرنا ہے اور دل کے آرام کا ایک ذریعہ ہے۔ [۱۳۳]

خاتون ہونے کے ناطے جہاز میں موجود خواتین کے لباس، ان پر کیا گیا دستکاری کا کام اور روایتی کھانے پینے کی چیزیں ان کی دلچسپی کا سامان بنتی ہیں۔ آبدوز کا اندرونی حصہ دیکھتے ہوئے وہ اس کے پرزوں اور کام کے طریقہ کار سے متعلق بھی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ نہر سویز پہنچ کر وہ اس کے پانی کا موازنہ چشمہ ویرناگ سے کرتی ہیں۔ پردہ ترک کرنے کے باوجود عورت کی ازلی شرم وحیا ان کے ہر انداز سے جھلکتی ہے:

> بہت جلد کپڑے پہن کر عرشے پر جانے کے لیے تیار ہو جانا بھی بے سود ہے۔ کیوں کہ باہر مرد ایسے لباس میں پھرتے ہیں کہ بیبیوں کا جلد نکلنا مناسب نہیں۔ [۱۳۴]

روداد سفر سے ان کے مشاغل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مسٹر دت کو انھوں نے اپنی کتاب دکھائی جس میں بہت سی بڑی شخصیات کے آٹوگراف لیے گئے تھے اور ان سے بھی اس کتاب میں کچھ لکھنے کی فرمائش کی جس پر انھوں نے ملک وقوم کی محبت اور ترقی کے حوالے سے فی البدیہہ کچھ انگریزی اشعار لکھ دیے۔ عطیہ فیضی صاحبہ کی کتاب میں بھی انھوں نے کچھ ابیات لکھیں۔ مارسیلز کی سیر کرتے ہوئے وہ وہاں کے گھوڑوں اور اپنے ملک کے بیلوں کا موازنہ کرتی ہیں کہ وہاں کے گھوڑے ہندستانی بیلوں کی مانند بوجھ کھینچنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ جو ان کے لیے کافی حیران کن تھا۔ ہندستانی ہونے کے ناطے انگریزوں سے مرعوب ہونے کی بجائے انگریزوں سے برتر نظر آنا انھیں تسکین دیتا ہے اپنے ہندستانی میزبان مسٹر ٹاٹا کا لندن میں عالی شان مکان ان کی خوشی کا باعث بنتا ہے:

> لندن میں ایک ہندستانی امیر کا اتنا بڑا مکان اور پھر اس عمدگی سے سجا ہوا۔ یہ دیکھ

کر بہت خوشی ہوئی۔ [۱۳۵]

یورپی طرز معاشرت میں جہاں انھیں یہ بات پسند آئی کہ ہونے والی بہن بھی اپنی شادی کے ذکر میں شریک ہو وہاں ریجنٹ سٹریٹ پر خواتین کا خریداری کرنا اور چائے پینا انھیں تکلیف دہ بھی معلوم ہوا کہ کیا عام سی زندگی ہے کہ سب کچھ سب کے درمیان کیا جاتا ہے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں آپ کو تنہائی میسر ہو۔

سر کرزن واٹلی، لیڈی رے اور لارڈ رے سے ملاقات کا احوال بتاتے ہوئے مصنفہ ایک مشرقی عورت کی طرف بہت عزت واحترام سے اپنے شوہر کا ذکر کرتی نظر آتی ہیں۔ کبھی حضور اور کبھی نواب صاحب کہہ کر پکارتی ہیں۔ نئے نئے مقامات کی سیر کے باجود وطن کی یاد دل سے محو نہیں ہوتی، بے چینی سے وطن سے آنے والے خطوط کا انتظار کرتی ہیں:

مغرب تک خطوط سے فرصت نہیں ملی۔ خوشی اور رنج دونوں نے دل کو گرفتار کر لیا۔ خوشی خیر و عافیت معلوم کرنے سے ہوئی اور رنج یادِ وطن سے۔ مجھے تو یہاں کی زندگی بھائی نہیں۔ میرے مزاج سے بالکل الگ ہے۔ [۱۳۶]

لندن کے مشہور مقامات ہائیڈ پارک اور اوپیرا کا حال لکھتی ہیں۔ ملباؔ (مشہور گلوکارہ) کے گیت سننے کے لیے اوپیرا میں ملکہ معظّمہ اور شہزادی وکٹوریہ بھی آئی ہوئی تھیں۔ ملکہ کے حسن سے متاثر ہوتی ہیں، البتہ شہزادی وکٹوریہ میں انھیں کوئی خاص دلکشی نظر نہیں آتی۔ اس سفرنامے میں انگریز خواتین کی وضع داری کی داد دینی پڑے گی کہ مس سموئل اپنی پارٹی میں ہر ہائی نس نواب بیگم صاحبہ جزیرہ حبشان کو ایک الگ جگہ لے جا کر بٹھاتی ہیں اور وہاں بڑی بڑی خواتین شخصیات کی ان سے ملاقات کرواتی ہیں۔ مس سموئیل کو چوں کہ معلوم تھا کہ مصنفہ نے پردہ حال ہی میں ترک کیا ہے اس لیے وہ کسی مرد کو ان سے ملاقات کے لیے نہیں لائیں۔ ایسی وضع داری بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

مصنفہ سر کرزن واٹلی کی اردو میں مہارت کی داد دیتی ہیں کیوں کہ انھوں نے پینتیس سال ہندستان میں بسر کیے اور زیادہ حصہ لکھنؤ میں گزارا۔ ان سے ہز مجسٹی کے حضور حاضری سے متعلق ہدایات لی گئیں اور ہندی لباس پہننے اور اپنے ملک کے رواج کے مطابق سلام کرنے کا سن کر مصنفہ نے

بہت خوشی کا اظہار کیا جو ان کی حب الوطنی کو ظاہر کرتا ہے۔

ان کے سفر نامے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی ہندستان میں لوگ وظیفہ ملنے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جایا کرتے تھے جیسے ان کے ازہر بھائی کے دوست ڈاکٹر انصاری ہز ہائی نس نظام دکن کی طرف سے بیس پونڈ ماہوار وظیفہ پر لندن آئے ہوئے تھے۔ اسی عرصے میں شاعر مشرق علامہ اقبال بھی یورپ گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر انصاری ان کی شاعری کے بہت مداح تھے۔ مصنفہ کے شوہر کو بھی علامہ اقبال سے شرف ملاقات کا بہت شوق تھا مگر ان کی آمد پر وہ وہاں موجود نہ ہونے کی وجہ سے اقبال سے ملاقات نہ کر سکے۔

ایک ریاست کی نواب ہونے کے باوجود محترمہ نازلی رفیعہ سلطان صاحبہ نہ جہاز پر کوئی چیز خریدتی ہیں اور نہ کوونٹ گارڈن کے تماشے کے لیے اتنی بڑی رقم صرف کرنا انھیں مناسب معلوم ہوتا ہے جو یقیناً ہندستانی خواتین کے لیے کفایت شعاری کا بہترین پیغام تھا۔ اپنے بھائی ازہر اور بہن عطیہ فیضی کے لیے محبت اور شفقت ان کے حرف حرف سے جھلکتی ہے۔ عطیہ فیضی کے متعلق لکھتی ہیں کہ:

> ان کی معیت سے مجھے بہت ہی مدد ملی۔ اس کے بغیر میں یہاں کے سفر کے ناقابل تھی۔ مجھ سے یہاں کچھ نہیں ہوسکتا۔ سب انتظام وہی کرتی ہے۔ ۱۳۷

بادشاہ سلامت اور ملکہ معظّمہ سے ملاقات کے لیے یہ سب اپنے روایتی ہندستانی لباس میں ملبوس ہو کر گئے، جہاں نیپال کے مہاراجہ جوانندنوں، مہاراجہ کوچ بہار پرنس سکر بتی، شہزادہ ویلز، شہزادہ ٹیک وغیرہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ معظّمہ سے ملاقات کے وقت دونوں میاں بیوی نے ان سے ہاتھ ملایا۔ ملاقات کے دوران سر کرزن بطور ترجمان موجود تھے۔ ملکہ معظّمہ نے بھی مصنفہ کی انگریزی میں مہارت کی داد دی۔ دستور کے مطابق رخصت ہوتے وقت دوبارہ سلام کیا گیا اور ہاتھ ملایا گیا اور اس طرح الٹے قدموں باہر نکالا گیا کہ بادشاہ اور ملکہ معظّمہ کی طرف پیٹھ نہ ہو۔

بادشاہ کے دربار میں بادشاہ کے تخت پر بیٹھنے کے بعد سب خواتین بھی بیٹھ گئیں جبکہ مرد حضرات کھڑے رہے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ میں خواتین اپنے حقوق کی جنگ لڑ کر

کامیاب ہو رہی تھیں۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ معظّمہ کے حضور آٹھ سو خواتین نے سلام کیا (ماڈلنگ کا مظاہرہ) جس میں دو ڈھائی گھنٹے صرف ہوئے۔ مصنفہ کے نزدیک بادشاہ اور ملکہ کا اتنی دیر تک سکون اور اطمینان سے بیٹھے رہنا اور ہنس ہنس کر سب کے سلام لینا کافی حیرت انگیز تھا۔ مگر انھیں بتایا گیا کہ یہ منصب شاہی کے فرائض میں شامل ہے۔ محترمہ نازلی رفیعہ سلطان اور ان کی بہن عطیہ فیضی کی دربار میں آمد سے متعلق لوگوں کا یہ کہنا کہ ایسے دربار میں کسی مسلمان بیگم کی شرکت کا یہ پہلا موقع ہے۔

محترمہ نازلی رفیعہ سلطان صاحبہ نے لارڈ لیمینگٹن سابق گورنر بمبئی سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال سے ملاقات کا بھی حال بیان کیا۔

> اقبالؔ بھی اسی شب کو آئے تھے، کھانا یہیں کھایا اور دیر تک دنیا بھر کی تاریخ اور فلسفہ کی گفتگو ہوتی رہی۔ ۱۳۸

یورپی لوگوں کے جذبۂ حب الوطنی کو سراہتے ہوئے انھوں نے لیڈی رے صاحبہ اور ڈچس سامرسٹ کی تعریف کی جنھوں نے ایک مجلس قائم کر کے دیہات کے غربا کو مرغیاں پالنے اور انڈے جمع کرنے کا کام سکھایا تا کہ انگلستان اپنی ضروریات کے مطابق انڈوں کے معاملے میں خود کفیل ہو سکے۔ اور ہر سال انڈوں کی خریداری پر جتنا پیسہ اور نفع دوسرے ممالک کو ملتا ہے وہ اپنے ملک میں ہی رہے۔ ہندستان کی سیاسی حالت پر انگلستان میں بہت بے چینی پائی جاتی تھی۔ مصنفہ نے لارڈ کرومر اور لیڈی کرومر کی تعریف کی اور ان سے مصر کی بیگمات سے متعلق دریافت کیا کہ وہ پردہ چھوڑ چکی ہیں تو معلوم ہوا کہ مصطفیٰ پاشا کی صاحبزادی پرنسس نازلی باہر آتی جاتی ہیں۔ پرنسس نازلی اور ان کی بہن پرنسس رقیہ سے متعلق تفصیلی معلومات مصنفہ سے جان کر لارڈ کرومر کافی متعجب ہوئے۔ چوں کہ لارڈ کرومر کے ہاں دعوت مصنفہ اور اس کے شوہر کے اعزاز میں دی گئی تھی اس لیے دعوت سے فارغ ہو کر انھوں نے پہلے رخصت چاہی جس کا جواز انھوں نے یوں پیش کیا:

> چوں کہ حضور کی عزت میں ضیافت دی گئی تھی اس لیے بہت اچھا وقت گزار کر ہم پہلے اٹھے اور رخصت ہوئے تا کہ سب مہمانوں کو آزادی ہو جائے۔ کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب تک کہ وہ جن کے واسطے دعوت دی گئی ہے رخصت نہ ہو لیں

دوسرے مہمان پابند رہتے ہیں اور وہ اجازت نہیں مانگ سکتے۔[139]

بلا شبہ نازلی رفیعہ سلطان صاحبہ کا ''سفر نامۂ سیر یورپ'' نہ صرف ایک اعلیٰ پائے کا سفر نامہ ہے اور سفر نامے کے مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہے۔ بلکہ یہ اس زمانے کے لحاظ سے بھی ایک اہم علمی کاوش تھی اور آج کے دور میں بھی اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس سفر نامے میں مصنفہ نے یورپی رسوم و رواج، طرز بودوباش، سائنسی حقائق، ذاتی خیالات و جذبات، دو مختلف تہذیبوں کا موازنہ، جذبہ حب الوطنی غرض یہ کہ ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جو پڑھنے والے کو تشنگی کا احساس نہیں دلاتا۔ یہ سفر نامہ یقیناً بیداری نسواں کے باب میں ایک اہم پیش رفت تھی۔

محترمہ ایس کے صغرا سبزوار یہ ''سفر نامۂ ایران'' میں اپنے ایران کا سفر حال بیان کرتے ہوئے نہ صرف سلطنت ایران کا جغرافیائی محل وقوع بیان کرتی ہیں بلکہ دار الخلافہ تہران کی تمام اہم عمارات اور مقامات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالتی ہیں۔ اس زمانے میں جب ہندستانی خواتین کا گھر سے باہر نکلنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا۔ مصنفہ کا پردیس کی نہ صرف سیر کرنا بلکہ اپنی سیر کا احوال صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا یقیناً گھر بیٹھی خواتین کو ایک نئے جہان کی سیر کرا رہا تھا۔ تہران میں ان کی ملاقات آغا سیف آزاد مدیر ''ایران پاستان'' سے ہوتی ہے۔ ایک خاتون ہونے کے ناطے مصنفہ مکان کی سجاوٹ، آرائشی کام اور پھولوں کی کیاریوں کا بغور جائزہ لے کر انھیں سراہتی ہیں۔ وہاں کے رسم و رواج سے متعلق آگاہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

> ناشتہ میں وہاں انگور اور خربوزوں کا ہونا لازمی ہے۔ وہ لوگ ہم لوگوں کی طرح خربوزہ چھیل کر، پھانکیں کر کے نہیں کھاتے صرف بیچ سے دو ٹکڑے کر کے اوپر سے تخم وغیرہ صاف کر کے اس طرح کاٹتے ہیں کہ اسی میں ٹکڑے رہتے ہیں کانٹے سے اٹھا اٹھا کر کھاتے ہیں۔[140]

مصنفہ سفر نامے کی روایت کے مطابق اپنے ملک کا موازنہ ایران سے کرتی ہیں اور ہندستانی خواتین کو تہران کے حمام کی بابت آگاہ کرتی ہیں کیوں کہ ہندستان میں خواتین کا حمام جانا ختم ہو چکا تھا۔ بہت ہی معمولی رقم کے عوض ایرانی خواتین اور بچے آ کر حمام میں غسل کا اہتمام کرتے تھے۔ حمام

سے متعلق اپنے خیالات بتاتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

غرض کہ ایک عجب دلچسپی کی جگہ ہے چار پانچ گھنٹے حمام میں ہی گزر جاتے ہیں کیسی ہی سردی کیوں نہ ہو حمام میں مطلق تکلیف نہیں ہوتی۔ [۱۴۱]

مصنفہ کا کہیں آنے جانے کے لیے برقعہ میں ملبوس ہو کر جانا، نماز کی پابندی کرنا، مسلم خواتین کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال تھا کہ پردے میں رہ کر ہر جائز کام کرنے میں کوئی ممانعت نہیں اور اپنی روایات کی پاسداری ہر جگہ رہ کر کی جاسکتی ہے۔ ایرانی خواتین سے ہندستانی طرز معاشرت پر گفتگو کر کے مصنفہ انھیں بھی اپنے ملک سے متعلق آگہی دیتی رہیں۔ واپسی پر ہندستانی طریقے کے مطابق انھیں قرآن پاک کے سائے میں رخصت کیا گیا۔ محترمہ ایس کے صغرا سبزواریہ کا یہ سفر نامہ بہت معیاری سفر نامہ نہ سہی لیکن طبقۂ نسواں کو بیرونی دنیا سے متعلق آگہی دینے کے حوالے سے ایک اہم قدم ضرور تھا۔

۳۔ ناول

ناول (NOVEL) اطالوی زبان کا لفظ ہے جو انگریزی زبان کے ذریعے اردو میں رائج ہوا۔ اس کے معنی ''انوکھا''، ''نرالا'' اور ''عجیب'' ہیں۔ اصطلاح میں ناول وہ مقصد یا کہانی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہو اور ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کا مکمل اور گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد ایک خاص سلیقے اور ترتیب کے ساتھ اپنے تجربات اور مشاہدات کو کہانی کی شکل دے۔ [۱۴۲]

ماہنامہ عصمت کے قیام پاکستان سے پہلے کے دستیاب شماروں میں صرف علامہ راشد الخیری کے ایک ناول شام زندگی سے متعلق مواد ملتا ہے۔ طبقۂ نسواں کی تعلیم قصے کے پیرایے میں جس مؤثر طریقے سے علامہ نے دی ہے وہ انھی کا خاصہ ہے۔ بچپن سے لے کر شادی سے پہلے تک کی زندگی سے متعلق تعلیمات صبح زندگی میں شادی سے لے کر موت تک کا درس شام زندگی میں اور اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے شعبہ ہائے زندگی کے مختلف مدارج شب زندگی کی صورت میں وہ سامنے لائے۔ اسی ناول کی وجہ سے قوم نے انھیں ''مصورِ غم'' کا لقب دیا۔

بیویوں کو ہم مزاج بنانے، گھر کو رشکِ جنت بنانے، خاوندوں کا دل موہ لینے اور اولاد کی تربیت کے لیے بلاشبہ اس ناول سے بہتر کوئی اتالیق نہیں۔ شامِ زندگی میں قصہ کے طور پر ایک لڑکی کا احوال بیان کیا گیا ہے کہ اس نے شادی سے لے کر مرنے کے وقت تک زندگی کس طرح بسر کی۔ زندگی کے کسی شعبے اور حیات کے کسی مرحلے کو اس ناول میں نظرانداز نہیں کیا گیا۔ ان کی تحریریں طبقۂ نسواں کی مظلومیت کی جان دار اور دردناک تصویریں پیش کرتی ہیں۔ چوں کہ ان کی ناول نگاری کا مقصد اخلاقی اور اصلاحی تھا اس لیے ان کا علم طبقۂ نسواں کی اصلاح اور فلاح کے لیے وقف تھا۔ انھیں بجا طور پر مسلمان لڑکیوں کا سرسید کہا جاتا ہے۔[۱۴۳]

ناول شامِ زندگی کا مرکزی کردار نسیمہ اپنی پھوپھی کے زیرِ تربیت دنیا کے نشیب و فراز اور شادی کے اصل راز سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے بعد سسرال سدھارتی ہے۔ جہاں وہ سب سے پہلے شوہر کی عادات و خصائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اس مقصد کے لیے سرگرداں رہتی ہے کہ کسی طرح میاں کی ہم خیال ہو جائے یا اسے اپنا ہم خیال بنالے تاکہ گھریلو جھگڑوں کی نوبت نہ آئے۔ معاملاتِ زندگی میں بھی اپنی پسند ناپسند چھوڑ کر شوہر کی پسند کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتی ہے۔ لیکن شوہر کی دین سے دوری اسے بے طرح کھٹکتی ہے اور اس کا مزاج اچھا دیکھ کر دین پر مفصل بحث کر کے اسے اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے:

> خوش الحان عورت، قرأت سے واقف، کلام اللہ جیسی کتاب ایک ایک حرف تیر کی طرح قسیم کے کلیجے میں گڑ رہا تھا۔ اپنے افعال کو یاد کر کے اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ نسیمہ ختم کر چکی تو وہ بے ساختہ اٹھا، اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا میں آج سے تمہارا مرید ہوتا ہوں، اب ان شاء اللہ نماز قضا نہ ہو گی۔[۱۴۴]

علامہ ہر مسلمان عورت کو اسلام کی طاقت سے واقف کرانا اور اس کے زریں اصولوں پر عمل کرانا چاہتے ہیں کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی عورت زندگی میں صحیح راستے پر نہیں چل سکتی۔ اس لیے وہ صنفِ نازک کے لیے مذہبی احکام کی پابندی کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کی بجا آوری سے دلوں میں خلوص و محبت اور نیک چلنی و پاکبازی کے خیالات پروان چڑھتے ہیں۔ چناں چہ

ان کے ناول کی ہیروئن نسیمہ نہ صرف خود اسلامی احکام کی پابندی کرتی ہے بلکہ اپنے شوہر کو بھی دین کی طرف مائل کرنے کا باعث بنتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے پیش کردہ تصورِ عورت کو علامہ راشد الخیری نے بڑی حد تک وسیع کر دیا۔ انھوں نے طبقۂ نسواں کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی۔ شامِ زندگی میں بھی صنف نازک سے متعلق ہر مسئلے کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ان کی ناول کی ہیروئن ہندستانی عورت ہے جس کی پامالی، کسمپرسی اور زبوں حالی پر وہ خون کے آنسو روتے ہیں۔ ان کی تحریر کے ایک ایک لفظ میں ہمدردی کا رنگ اس قدر غالب ہوتا ہے کہ پہلی ہی نظر میں قاری سارے منظر سے واقف ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ ہندستانی عورت کی زندگی درد اور غم سے عبارت ہے اس لیے طبقۂ نسواں کی زندگی کے نشیب و فراز بیان کرتے ہوئے ان کا انداز بہت دردناک اور الم انگیز ہو جاتا ہے جو باقی تمام رنگوں پر غالب آجاتا ہے۔ نسیمہ جہاں شوہر کی رضامندی کو زندگی کا مقصد سمجھتی تھی وہاں ساس کی دلجوئی، چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کا ادب بھی اس کا وطیرہ تھا۔ ساس، نندوں، دیوروں غرض تمام سسرالی رشتے داروں کی خدمت میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا لیکن شرکتِ محبت جو ساس بہو کے تعلقات کی خرابی کی جڑ ہے نہ کھوکھلی ہو سکتی تھی نہ ساس کا غصہ مٹ سکتا تھا۔ ایک طرف نسیمہ جیسی بہو تھی جو اپنی ساس سعیدہ کے پاؤں دھو دھو کر پیتی تھی اور دوسری طرف نسیمہ کی جیٹھانی جس نے سب کو جوتے کی نوک پر رکھا ہوا تھا۔ علامہ اس کردار کے ذریعے بہوؤں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ:

> بہوؤں کو اچھی طرح یہ مان لینا چاہیے کہ آج ہماری زندگی بہو کی حیثیت سے ہے۔ لیکن آرہا ہے وہ وقت جب ہمیں ساس بننا ہے اور آج ہم کو اپنی ساس سے وہی سلوک کرنا چاہیے جو کل اپنی بہوؤں سے توقع رکھتے ہیں۔ [۱۴۵]

علامہ ساسوں کو بھی یہ نصیحت کرتے ہیں کہ لڑکوں کی شادی کے وقت ماؤں کو بہوؤں کے حوالے سے یہ سوچ لینا چاہیے کہ ایک لڑکی اپنے تمام عزیز و اقارب اور گھر بار کی قربانی شوہر کے لیے دیتی ہے پھر اسے اس کے شوہر کے ساتھ خوش دیکھ کر بحیثیت ماں انھیں اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے نہ کہ تنگ دلی کا جیسا کہ نعیمہ کی ساس نے تاحیات احسان فراموشی کا رویہ اپنائے رکھا لیکن مرتے وقت

احساس ندامت سے چور ہوکر اس سے معاف بھی مانگ لی۔ نسیمہ کا شوہر ویسے تو نئی روشنی کا دلدادہ اور ترک رسوم کا حامی تھا مگر ماں کی وفات پر غیر شرعی رسومات، قبر پر پھول ڈالنے، قل اور چالیسویں کے نام پر انواع واقسام کے کھانے پکانے پر ہزاروں روپے اڑا دیے۔ اس موقع پر بھی نسیمہ نے ایک نیک اور صالح بیوی کی طرح شوہر کی رہنمائی کی اور نقد رقم مسجد، مدرسے یا یتیم خانے میں بھیجنے کا مشورہ دیا:

> جب ہم پڑھے لکھے ہی ان رسموں میں پڑ کر اپنی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے تو جاہلوں کا شمار کس گنتی میں رہا۔ ۱۴۶

یہاں نمود ونمائش اور عزیز واقارب میں واہ واہ کروانے کی غرض سے ادا کی جانے والی غیر اسلامی رسومات کی ممانعت کی گئی اور مردے کو ثواب پہنچانے کے لیے یتیموں، رانڈوں، اپاہجوں اور محتاجوں کی مدد کرنے اور ان کو کھانا کھلانے کا درس دیا گیا۔

ایک اچھی بیوی اور بہو بننے کے بعد بطور بھابی نسیمہ کا کردار سامنے لایا گیا۔ مرحومہ ساس دو نندوں کی ذمہ داری اسے سونپ گئی تھی۔ نسیمہ نے نہ صرف خود نندوں کو اولاد سے بڑھ کر پیار دیا بلکہ شوہر کو بھی بہنوں کی دلجوئی کا احساس دلایا۔ ساس کے مرنے کے بعد دونندوں کے ساتھ وہ شوہر کے ہمراہ ہی رہنے لگتی ہے اس سے پہلے شوہر ملازمت کی غرض سے اکیلا ہی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ وہاں پہنچ کر نسیمہ کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے کہ ایک بیوی اپنے طریقے سلیقے سے کس طرح شوہر کے گھر کو جنت بنا دیتی ہے:

> اس نے میلے کپڑے پہن جو گھر میں جھاڑو دینی شروع کی تو ٹوکروں کیا چھکڑوں ہی کوڑا نکال کوٹھڑیاں اور دالان چندن کر دیے۔ مٹکوں پر سیروں کائی جم رہی تھی، ان کو اٹھا کورے مٹکے منگوا، اوپر سے قلعی دار کوڑے رکھے تو گھر کی شان ہی اور نکل آئی۔ ۱۴۷

نندوں کی تربیت کرتے ہوئے وہ انھیں سائنسی حقائق سے بھی آگاہ کرتی ہے۔ زلزلے، مسان، ہسٹریا، بادل، کانبنا، آسمانی بجلی، نظام شمسی، چاندگرہن، سورج گرہن، قبلہ نما اور کشش ثقل کی حقیقت بتاتی اور اس طرح تعویز گنڈوں، ٹونے ٹوٹکوں، بھوت آسیب اور مزاروں پر چڑھاوؤں جیسی

مشرکانہ رسومات سے منع کرتی ہے۔

نسیمہ کے کردار کے ذریعے علامہ ماؤں کی بھی تربیت کرتے ہیں جو اپنی آسانی کے لیے اور تکلیف سے بچنے کے لیے افیون کے اثر سے بچوں کو سلا دیتی ہیں اور بچے کے اعضا ہمیشہ کے لیے سستی کا شکار ہو جاتے ہیں یا زیادہ مقدار دے دینے سے وہ ہمیشہ کے لیے غفلت کی نیند سو جاتا ہے۔ پھر وقت بے وقت بچے کو دودھ پلانا بھی بچے کو تکلیف دیتا ہے۔ بچوں کے بڑے ہونے کے دوران غفلت برتنے سے سکے وغیرہ پیٹ میں چلے جانا بھی ماؤں کی لاپرواہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

علامہ نے اپنی تخلیقات میں ہندستانی عورت کے زخمی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے جو قارئین کو رنجیدہ کرنے کا باعث بنتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ قاری کے دل میں اس کردار کے لیے ہمدردی کا ایک سیلاب امڈنے لگتا ہے۔ ان کے ناولوں کی ہیروئنوں کو ایسی ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کو پڑھ کر روح کانپ اٹھتی ہے اور کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے لیکن وہ ان سب پریشانیوں کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کر کے بہادری، ہمت اور استقلال کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ شام زندگی کی ہیروئن نسیمہ کو بھی اکلوتے لاڈلے بیٹے نسیم کی وفات اور شوہر قسیم کی لاتعلقی اور بے اعتنائی کا صدمہ اٹھانا پڑتا ہے اور وہ زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے لیکن اس موقع پر پھوپھی کا نصیحت بھرا خط اسے دوبارہ زندگی کی طرف لاتا ہے:

> یہی آزمائشوں کا وقت ہے۔ پہلے سے زیادہ خدمت کرو اور بتا دو کہ شریفوں کی بیٹیاں مصیبت میں کندن اور تکلیف میں سونے کی طرح چمکتی ہیں۔ یہ دن ہمیشہ رہنے والے نہیں۔ [۱۴۸]

نند کی شادی کے موقع پر نسیمہ اسے ایک اچھی بیوی بننے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی ماں بننے کی نصیحت بھی کرتی ہے۔ اپنے شوہر کے بچوں کو بن ماں کا بچہ سمجھ کر سینے سے لگانے کا درس دیتی ہے۔ سوکن کے ازلی جلاپے سے بچتے ہوئے بن ماں کے بچوں کو اپنے بچوں سے زیادہ اپنا سمجھ کر پرورش کرنے کا سبق دیتی ہے کیوں کہ ان معصوموں کی آہ عرش ہلا دیتی ہے۔ نندوں کی تربیت کرتے ہوئے بحیثیت بیوی میاں کے گاڑھے پسینے کی کمائی اور محنت ومشقت کی قدر کرنے کا کہتی ہے اور فضول خرچی

سے منع کرتی ہے۔نواب قمر آرا بیگم کی مثال کے ذریعے خواتین کو ہر قسم کے حالات میں شوہروں کا سہارا بننے اوران کی ہمیت بندھانے کی تلقین کرتی ہے۔

علامہ اپنے ناول کی عورتوں کو پست حالت میں پیش کر کے ان کے عیب گنواتے ہیں تا کہ پڑھنے والوں پر اس کا تاثر دیرپا اور گہرا ہو۔لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا مثالی کردار بھی پیش کر دیتے ہیں جو کسی بھی خامی سے مبرّا ہوتا ہے۔شام زندگی میں ناول کی ہیروئن کی ساس سعیدہ، اس کے شوہر قسیم، اس کی جیٹھانی، اس کی بڑی نند رابعہ کا شمار ایسے ہی کرداروں میں ہوتا ہے جو خطاؤں پر خطائیں کرتے چلے جاتے ہیں اوران کے مقابلے میں نسیمہ ایثار اور محبت کی مورت، سر تا پا وفا کی دیوی جو اپنی خدمت سے سب کو اپنا اسیر بنا لیتی ہے۔دو مختلف اور متضاد کرداروں کا موازنہ اچھائی اور برائی میں فرق کرنے اور اصلاح معاشرہ میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

علامہ کی پیش کی ہوئی عورت باحیا ہوتی ہے کیوں کہ حیا ہی عورت کا سب سے بڑا زیور ہے۔ ناول کی ہیروئن نسیمہ کے ذریعے وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ عورت کو محبت صرف اپنے شوہر سے ہی کرنی چاہیے اور وقت پڑنے پر اسے اپنے شوہر کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہونا چاہیے کیوں کہ اس دنیا میں اور خصوصاً مشرقی معاشرے میں عورت کی زندگی شوہر کے بغیر بے کار ہے۔ان کے ناول کی ہیروئن جہاں مرد سے اپنے جائز حقوق منواتی ہے وہاں یہ بھی فراموش نہیں کرتی کہ مرد کو خوش رکھنا اس کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔جیسے نسیمہ اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر شوہر قسیم سے بیٹی کو گلوبند یعنی مالا دینے کا تقاضا کرتی ہے:

> تم چوں کہ زبان سے کہہ چکے تھے اور سب کو خبر ہوگئی تھی کہ مالا جہیز میں ہے اس لیے اب نہ دینا مناسب نہ تھا۔صرف اس لیے میں نے تم سے کہا لیکن تمہاری رائے نہ ہو تو نہ دو۔[۱۴۹]

بیٹی کو وداع کرتے وقت نسیمہ اسے ہر حال سسرال میں نباہ کرنے کی تلقین کرتی ہے اور شادی کو عورت کی شرافت پرکھنے کا پیمانہ قرار دیتی ہے۔وہ اپنی بیٹی تسنیم کو نصیحت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ:

> مفلسی میں صبر، رنج میں شکر، سختی پر خوش، زیادتی پر خاموش، ہر حال میں راضی، ہر

حالت میں رضا عورتوں کا شیوہ ہے۔ مصیبت سے گھبرانا، آفت سے اکتانا، لاپروائی سے ہراس بے اعتنائی سے بدحواس، جوہرِ شرافت نہیں۔ [۱۵۰]

بیٹے کی شادی طے کرتے وقت نسیمہ سمدھیانے پر پہلے ہی کھل کر واضح کر دیتی ہے کہ جہیز کے نام پر بیٹی کو کچھ دینے دلانے کی ضرورت نہیں اور بہو کو بیٹی سے بڑھ کر پیار سے رکھتی ہے۔ چار سال کی طویل جدائی کے بعد سب سے بڑا بیٹا وسیم بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے آتا ہے۔ ابھی ماں کا کلیجہ پوری طرح ٹھنڈا بھی نہیں ہو پاتا کہ اسی رات معمولی دست اور قے سے وفات پا جاتا ہے۔ مگر آفرین ہے اس ماں پر کہ کڑیل جوان بیٹے کی موت پر خون کے آنسو رونے کے بعد بھی جوان بیوہ بہو کا زمانے کی روایت کے خلاف خود دوسرا نکاح کرواتی ہے۔ اپنی غرض اور خدمت کے لیے بیوگی کی زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کرتی۔ بیٹے کا غم بھلانے کے لیے اور اسے ایصال ثوب پہنچانے کے لیے اپنی زندگی مخلوق خدا کی خدمت کے لیے وقف کر دیتی ہے۔

غرض یہ کہ شام زندگی کی ہیروئن نسیمہ کی زندگی ایک دریا کی مانند تھی جس کی لہروں سے ہزاروں بندگانِ خدا سیراب ہوئے۔ ایک چمن تھی جس کے پھول تمام عالم کو مہکا رہے تھے:

بیٹی بنی تو ہیرا، بیوی بنی تو پارس، ماں بنی تو کندن اور انسان بنی تو چندن، زندگی کی کسوٹی پر جواہرات کی طرح چمکی اور کوہِ نور کی طرح دَمکی۔ [۱۵۱]

علامہ راشد الخیری نے اپنے ناول میں صنفِ نازک کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اپنے ماحول کے اعتبار سے اعتدال پسند رویے کا حامل ہے نہ انتہا پسند اور نہ قدامت پرست، نہ بہت زیادہ ترقی پسند اور نہ بہت زیادہ رجعت پسند بلکہ اعتدال کے راستے پر چل کر وہ صنف نازک کو سماج کے لیے زیادہ مفید اور انسانی زندگی کے لیے زیادہ اہم ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول میں پیش کردہ خواتین کرداروں پر پے در پے مصائب کے پہاڑ توڑے تاکہ قارئین کے دل ان کی حالتوں پر رحم کھائیں اور طبقۂ نسواں کو ان پریشانیوں سے نکالنے کی کوشش کریں۔

فنی لحاظ سے بھی ان کا ناول تمام ادبی محاسن پر پورا اترتا ہے۔ ناول کے کردار خامیوں اور خوبیوں سے مبرا نہیں۔ کرداروں میں یکسانیت نہیں۔ مکالمے سادہ اور برجستہ ہیں۔ کہانی اور جملوں

میں مکمل ربط ہے۔ ناول اصلاح اور مقصدیت سے خالی نہیں۔ ناول کا مواد انسانی زندگی سے لیا گیا ہے۔ ناول منظم پلاٹ اور جاندار اور متحرک کرداروں کا حامل ہے اور فطری انداز میں ناول کی کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔

۴۔ افسانے

افسانہ قصہ کہانی کی وہ شکل ہے جس کے لیے انگریزی میں (Short Story) لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ داستان اور ناول کی ارتقائی اور ترقی یافتہ صورت ہے۔ اختصار، جامعیت اور وحدت تاثر کسی بھی افسانے کی بنیادی خصوصیات ہیں۔[۱۵۲]

ماہنامہ عصمت میں شائع ہونے والے تمام افسانوں میں بھی ہندستانی خواتین کی حالتِ زار اور ان سے روا رکھے گئے، ناروا سلوک کو موضوع بنایا گیا تا کہ معاشرے کا مکروہ چہرہ سامنے لا کر لوگوں کو ان کی غلطیوں کا احساس دلایا جائے اور طبقۂ نسواں کو اس کے حقوق لائے جا سکیں۔

علامہ راشد الخیری کا طویل افسانہ ''نانی عشو'' ایک مزاحیہ کردار کی تصویر سامنے لاتا ہے۔ نانی عشو ساٹھ برس کی ہونے کے باوجود سرخ لباس زیب تن فرماتی تھیں اور آرائش حسن کے تمام ہتھیاروں سے لیس رہتی تھیں۔ تعلیم سے ان کا تو کیا ان کے خاندان کا بھی دور دور تک واسطہ نہ تھا۔ لیکن اپنی بارعب شخصیت کی وجہ سے پسماندہ اور جاہل خواتین کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ قرآن وحدیث کے نام پر بے سروپا قصے خواتین کو گھڑ گھڑ کر سناتی تھیں اور ان پڑھ خواتین ان کی باتوں پر آمنا وصدقنا کہتی تھیں اور انھیں کسی پیر سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ کھانے پینے کی رسیا تھیں۔ ایک خاتون کے کہنے پر اسکے بیمار بچے کا علاج کرنے گئیں تو بجائے بچے کو دیکھنے کے اپنی فرمائشی فہرست پیش کر دی۔

> میں بازار کا کھانا نہیں کھاتی تم جلدی سے ایک چار پراٹھے ڈال لو، کباب بگھار لینا۔ ہاں میٹھا ضرور ہو۔ خیر پاؤ سیر ربڑی منگا لو۔ میں تو ماموں اللہ بخش کو ساتھ بٹھا لیتی مگر وہ بے خربوزوں کے ٹکڑا نہیں توڑتے۔ اگر خربوزے آ جائیں تو اچھا ہے اور ہاں ایک چھ بدھنیاں ضرور منگوا لو۔[۱۵۳]

اس زمانے کے انگریزوں کے لیے ایسے ہندستانی کردار تفریح طبع کا باعث بنتے تھے۔ ان

کی ہیئت کذائی پر انھیں اوران کے دوستوں کو ہنسنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر نے نانی عشو کو بھی اسی مقصد کے لیے جلسے میں آنے کی دعوت دی جہاں جا کر نانی عشو نے وہ رنگ جمایا کہ مجمع ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گیا:

گلابی کلّے اور سپید برّاق لباس گلنار ہو گئے۔ اس غلطی کا اقرار نانی نے اس طرح کیا کہ مس صاحبہ نے منہ پوچھنے کو جو رُومال نکالنا چاہا تو بی نانی نے اپنا رومال پیش کر دیا۔ یہ وہ رومال تھا کہ کل نانی نے اس میں مچھلی رکھی تھی۔ منہ پر پھیرتے ہی مس صاحبہ کو ابکائی آئی۔[۱۵۴]

نانی عشو کو سارا شہر نانی کہہ کر بلاتا تھا۔ مگر بقول ان کے گیارہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوئی، چودہ برس کی عمر میں وہ بیوہ ہو گئیں۔ بچے کی موجودگی میں دوسری شادی نہ کی۔ یہاں پر نانی عشو کا کردار بہت جی دار دکھایا ہے جو خود ہی مجاور کو شادی کی پیش کش کرتی ہیں اور شادی کے انتظامات کے حوالے سے سب ہدایات دیتی ہیں۔ یہ بات اس زمانے کی روایات سے بالکل متضاد ہونے کی بنا پر قاری کو چونکانے کا باعث بنتی ہے۔

جوڑا، چڑھاوا، پھولوں کا گہنا، سہاگ پڑا، تیل کنگھی، عطر، جوتی، موزے، دستانے، بنیان، رومال سب سامان عصر سے پہلے پہنچ جائے۔ قاضی جی سے کہتے جاؤ۔ اور دیکھو یہ پانسو اشرفیاں الگ رکھی ہیں۔ کہو سامان منگوا دوں، چاہے نقد لے لو۔[۱۵۵]

شادی کی رسومات ادا ہوتے ہی ہر طرف سے مبارکباد کی آوازیں آنے لگیں۔ اس موقع پر بھی نانی عشو نے روایتی دلہن والی شرم وحیا کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ اپنے اسی پُرمزاح کردار میں نظر آئیں جو ان کی طبیعت کا خاصا تھا۔ ایک خاتون کے مبارکباد دینے پر نانی کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو:

نانی نکاح ہو گیا۔ مبارک ہو۔
اب نانی کہاں تھیں، گھونگھٹ بیٹا۔ شرم توڑ، جوتی ہاتھ میں لیے کہنے والی کے پیچھے لپکیں۔ دولھا بھی کھڑا سیر دیکھ رہا ہے اور مہمان بھی۔ نانی جوتی لیے پیچھے پھر رہی ہیں اور کہتی جاتی ہیں چڑیلوں نانی نانی کہہ کر میرا گھر کھاؤ گی![۱۵۶]

جہاں علامہ راشد الخیری کا یہ پر مزاح کردار ان کی حزنیہ تحریروں سے بالکل برعکس پڑھنے والوں کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے ہوا اس طویل افسانے کا مجموعی جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں طبقۂ نسواں میں تعلیمی شعور نہیں تھا جس کی بنا پر وہ جہالت اور لاعلی کے باعث اسلامی تعلیمات سے بالکل عاری تھیں۔ اس جہالت اور لاعلمی کا ایک نقصان یہ بھی تھا کہ خواتین آداب معاشرت اور آداب محفل سے نا آشنا تھیں۔ نانی عشو کا پان کی پیک مس صاحبہ پر پھینک دینا اور اپنا گندا رومال انھیں پیش کر دینا سراسر حفظانِ صحت کے اصولوں کے منافی ہے۔ پھر خواتین مذہبی شعور نہ ہونے کے باعث توہمات کا بھی شکار تھیں۔ علامہ راشد الخیری ایسے کرداروں کے ذریعے معاشرے میں بیداری نسواں کے حوالے سے شعور اجاگر کرنا چاہتے تھے جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

علامہ راشد الخیری کا دوسرا مشہور اور معرکتہ الآرا افسانہ جو جنوری ۱۹۲۸ء میں عصمت میں قسط وار شائع ہوتا رہا ''تمغۂ شیطانی'' تھا۔ ''تمغۂ شیطانی'' میں علامہ نے امتِ شیطانی کے آٹھ بے مثل کردار پیش کیے اور ہر کردار ہندستانی مسلمانوں کے طرز عمل کی عملی تفسیر پیش کرتا ہے۔ خداوند عزازیل کے دربار میں وزیر جنگ اپنے دنیا میں کیے گئے کارناموں کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ وزیر جنگ کی طرف سے ''تمغۂ شیطانی'' کے لیے نامزد کیے جانے والے ساتوں انسان انسانیت کے ہر پہلو کی عکاسی کر رہے تھے۔

پہلی تصویر نماز روزے کے پابند اور شوقین مفتی کی پیش کی گئی جس کی پرہیز گاری سے متاثر ہو کر اس کی ایک عزیز بڑھیا ماما نے اپنی بیٹی فرزانہ کے نکاح کا معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔ اور ان محترم نے خوامخواہ کے روڑے اٹکا کے فرزانہ کو چھوڑ کر اپنی بھتیجی کی شادی وہاں کر دی۔ اس تصویر کے ذریعے علامہ نے ایسے مسلمانوں پر تنقید کی ہے جو شادی بیاہ کے معاملات میں فریقین میں غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں اور مفتی صاحب جیسے بظاہر مقدس لیکن بباطن بدنیت افراد اسلامی معاشرے میں کلنگ کے ٹیکے کی مانند ہیں جو اسلام کا تقدس پامال کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

دوسری تصویر علامہ نے ایک ایسے خاں صاحب کی پیش کی ہے جو امرا، رؤسا اور انگریز حکام کی تفریحِ طبع کا باعث ہیں۔ ان کی بیوی رضیہ ویسے تو سچی مسلمان ہے لیکن سوکن کا بچہ ہمیشہ اس کی آنکھ

میں کانٹا بن کے چبھتا ہے اور وہ اس سے ناروا سلوک کرتی ہے۔ شب برأت کے دن بخار میں جلتے ہوئے بچے کی آتش بازی چھوڑنے کی معصومانہ خواہش پر سوتیلی ماں کا انسانیت سوز رویہ دل دہلا دیتا ہے:

> اس کی معصوم خواہش کا جواب ایک جلتی ہوئی چھچھوندر تھی جو رضیہ نے اس پر یہ کہہ کر پھینک دی ''لے'' بچہ جھلس گیا۔ اور جھلّی کی وجہ سے چھچھوندر اسی کے اوپر چکر کھاتی رہی اور تمام بدن کی چربی نکل گئی۔ ۱۵۷

سوتیلی ماؤں کی بدسلوکی اور انسانیت سوز مظالم ہندستانی معاشرے میں عام تھے۔ علامہ نے بھی اس موضوع کو اپنے افسانے میں زیر بحث لایا لیکن وہ اس کا ذمہ دار عورت کو نہیں بلکہ مرد کو ٹھہراتے ہیں جنھوں نے اپنی بیویوں سے کبھی باز پرس نہیں کی اور دونوں اولادوں سے مساوی سلوک روا نہیں رکھا۔ خاں صاحب کی طرح کے دوسروں کی خوشامدیں کر کے اپنی زندگی بسر کرنے والے مسلمان ہندستانی معاشرے میں بے شمار تھے۔

''تمغۂ شیطانی'' کے لیے نامزد کردہ تیسرا کردار ناکڑے والی بہری کا ہے۔ اس کردار کے ذریعے علامہ نے مسلمان خواتین میں تعلیم کی کمی کی بنا پر شرک، بدعت، پیری مریدی اور دیگر غیر اسلامی رسومات کے پھیلاؤ کو نشانہ بنایا ہے۔ مذہبی تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے باعث ان پڑھ خواتین میں مریدی کی دھن سوار ہوتی ہے۔ جس سے جو سنتی ہیں اس پر ایمان لے آتی ہیں۔ ناکڑے والی بہری بھی جعلی پیر کی جھوٹی کرامات کا شہر بھر میں چرچا کر کے نہ صرف چندے کے نام پر پیسا بٹورتی ہے بلکہ ہزاروں خواتین اس کے منہ سے پیر جی کی کرامات سن کر ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو جاتی ہیں۔ جہالت اور لاعلمی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی عورت پیر کے ہاتھ چومتی، کوئی قدموں میں گرتی کوئی سجدے کرتی اور کوئی رکوع میں پڑی ہوتی ہے۔ نامحرم پیر کے سامنے خواتین بے پردہ آنا قابلِ فخر سمجھتی ہیں۔ اس کردار کے ذریعے جہاں ایسے پیروں فقیروں کی اصلیت سے پردہ اٹھایا گیا ہے وہاں مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ طبقہ نسواں کے لیے حصول علم ناگزیر ہے۔

چوتھا کردار ایک شخص شمس ہے جو حالت بخار میں کراہ رہا ہوتا ہے اور اس کی چار سالہ بچی اس

کا سر دبا رہی ہوتی ہے کہ اچانک سانپ نکلنے پر باپ کے جاگنے کے ڈر سے وہ اس کو ہاتھ سے پکڑ لیتی ہے اور باپ کو بچاتی ہے۔ اسی اثنا میں سانپ بچی کو ڈس لیتا ہے لیکن باپ اس کی موت پر افسردہ ہونے کی بجائے خوش ہوتا ہے کہ اس کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ باپ کی ذمہ داری سے آزاد ہوا۔ زمانۂ جاہلیت سے بیٹی کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسلام پھیلنے کے باوجود ہندستانی مسلمانوں کی سوچ میں لڑکیوں کی پیدائش کے حوالے سے کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

پانچواں کردار ایک مولوی صاحب ہیں جن کا نام ہی دوسطروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ احترام کا کوئی ایسا لفظ نہیں جو ان کے نام کا جزو نہ ہو۔ لیکن عملی طور پر انھوں نے ان خطابات کی وہ مٹی پلید کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ خلع کا حق جو اسلام عورت کو خود دیتا ہے اس کو انھوں نے محض اس خدشے کے پیش نظر کہ عورتیں شوہروں کے قبضے میں نہیں رہیں گی خلاف شرع اور ناجائز قرار دے دیا۔

> مولانا آپ کا فرمانا درست مگر اتنا تجھیے آج اگر میں خلع کو جائز کردوں تو ہندستان میں آگ لگ جائے گی۔ عورتیں قبضہ میں نہ رہیں گی۔ ہزاروں دعوے دائر ہوں گے اور مسلمانوں کا اطمینان بے اطمینانی سے بدل جائے گا۔ [۱۵۸]

علامہ نے اس کردار کے ذریعے ہندستانی مسلمانوں کی اس رسم کو بھی سامنے لایا جس کے تحت بیویاں اپنی جائیداد شوہروں کے نام کر دیتی تھیں اور اپنے جائز حق یعنی خلع سے بھی محروم رکھی جاتی تھیں۔ خواتین کو ان کے حق سے محروم رکھنا یقیناً علامہ راشد الخیری جیسے دردمند اور طبقۂ نسواں کے حامی شخص کے لیے بہت اذیت ناک تھا۔ اس لیے انھوں نے نہ صرف اپنے مضامین بلکہ افسانوں میں بھی ان موضوعات کو اٹھایا تا کہ خواتین کو ان کے جائز حقوق مل سکیں۔

خداوند عزازیل نے اپنے دربار میں اپنے مصاحبین سے مسلمان مردوں کے طرز عمل پر اطمینان کا اظہار کیا جو خواتین کے حقوق پامال کر کے اپنے نفس کے غلام بنے ہوئے تھے اور منصفی کے نام پر قرآن وحدیث کو روندکر، موت کو بھول کر معاشرتی ضروریات کو مقدم سمجھتے تھے۔

''تمغۂ شیطانی'' کے لیے نامزد چھٹی تصویر لکھنؤ کے خاندان شاہی کی مشہور خاتون نواب قمر زمانی بیگم کی تھی۔ انگریزی حکومت کی وجہ سے انھیں کمشنر اور کلکٹر کی میموں سے بھی ملنے کا اتفاق ہوتا تھا

اور مجالس وغیرہ میں بھی شریک ہوتی تھیں۔لاعلمی اور جہالت کا یہ عالم تھا کہ انگریزی مہینے کی تاریخوں سے ناواقف تھیں۔وقت کی پابندی ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔اپنی جہالت کا اظہار فخریہ انداز میں تعویز گنڈوں کی کرامات بتا کر کرتی تھیں۔پیر جی محمود کے فلیتے جلانا، مولوی رحمت کی طشتریاں پہننا، تعویز پہننا، جمعرات کے دن چڑھاوا چڑھانا، معمولات میں شامل تھا۔اس کردار کے ذریعے علامہ نے ایسے ہندستانی معاشرے کی تصویر کشی کی ہے جو نام کے مسلمان اور قول و فعل میں ہنود کی مانند تھے۔اس کے برعکس قرون اولیٰ میں امت مسلمہ اپنے دور کی ممتاز قوم تھی۔اس کا عالم نسواں حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت خولہؓ جیسی نامور خواتین کے کارہائے نمایاں سے روشن ہے۔ان خواتین کے علم و فضل، اخلاق و عادات، اقوال و افعال انسانیت کے بہترین نمونے تھے۔لیکن آج اس قوم کی خواتین شرک جیسے بدترین فعل کی مرتکب ہو رہی تھیں اور یہ سب کرامات لاعلمی اور جہالت کی تھیں جس کا طبقۂ نسواں شکار تھا۔

خداوند عزازیل کے نزدیک ''تمغۂ شیطانی'' کا اصل مستحق ساتواں کردار اصفہان قرار پایا۔ اصفہان ہندستانی مسلمان معاشرے کے ان کرداروں کا نمائندہ ہے جو اپنی برادری کی ضروریات پر خدائی احکام ٹھکراتے اور ارشاد رسول جھٹلاتے ہیں۔اصفہان نے محض اپنی برادری کو خوش کرنے کے لیے، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اور اپنی جائداد کو اپنے بیٹے کے لیے محفوظ کرنے کے لیے بیٹی شیرازی کو قربان کر دیا، اور زمانۂ جاہلیت کی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی روایت دوبارہ زندہ کر دی۔

اصفہان کے کردار میں ہندستانی مسلم معاشرے کی کئی خرابیاں سامنے آتی ہیں مثلاً بیوی کی جائداد شوہر کی ملکیت ہونا، شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکیوں سے رائے نہ لینا، ولی کو کافی سمجھنا، جائداد جانے کے ڈر سے لڑکی کو غیر خاندان میں شادی نہ کرنا، تعلیم نسواں کی مخالفت، لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دینا۔یہ وہ خلاف شرع کام تھے جو مسلم معاشرے میں رواج پا چکے تھے اور جن کی بیخ کنی ضروری تھی۔علامہ نے اپنے اس طویل افسانے کے ذریعے خواتین کے حقوق کی بحالی کے لیے آواز بلند کی تاکہ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور معاشرے کی اصلاح ہو سکے۔

فنی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو علامہ راشد الخیری کے یہ دونوں طویل افسانے، افسانے کی

تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ وحدت تأثر پیدا کرنے کے لیے ایک معیاری افسانے میں صرف ایک مقصد پر زور دیا جاتا ہے لیکن ''نانی عشو'' اور ''تمغۂ شیطانی'' میں ایک سے زیادہ مقاصد نے فنی خرابی پیدا کردی ہے اور افسانے اور مخلوط پلاٹ کا متبادل بنا دیا ہے۔ اختصار کی بجائے طوالت نے انھیں ناول اور ناولٹ سے قریب تر کر دیا ہے۔ افسانے کے پلاٹ میں واقعات کا آغاز وارتقا، پھر عروج یا منتہا تک پہنچ کر موزوں نتیجے پر ختم ہونا بھی ضروری ہے۔ اس صفت پر یہ دونوں افسانے پورے اترتے ہیں۔ افسانے کے کردار ارتقا سے عاری ہوتے ہیں۔ جس طرح ''نانی عشو'' اور ''تمغۂ شیطانی'' کے ساتوں کردار بھی شروع سے آخر تک ایک جیسے ہی رہے، ان کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو علامہ راشدالخیری کا مقصد ہندستانی معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی کرنا تھا جس میں پوری طرح کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔

افسانہ ''مظلوم بیوی کا پاک جذبہ'' میں علامہ راشدالخیری مشرقی بیوی کی شوہر سے وفاداری کو موضوع بناتے ہیں۔ صغیرہ جیسی حسین، نازوں سے پلی، سگھڑ بیوی سے بے وفائی کر کے اس کا شوہر عرفان ایک طوائف شہزادی کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے اور روپیہ پیسہ، زیور سب اس پر نچھاور کر کے خود کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاتا ہے۔ شہزادی عرفان کی محبت کا صلہ اس پر چوری کا الزام لگا کے دیتی ہے۔ ایسے نازک وقت میں بھی صغیرہ جیسی وفا کی دیوی اس کی تمام خطائیں اور ظلم وستم بھلا کر آگے بڑھتی ہے اور اس کی رہائی کی کوشش کرتی ہے۔ آخر اس کی کوشش رنگ لاتی ہے اور عرفان رہا ہو جاتا ہے اور اپنی عفت مآب بیوی سے معافی کا طلب گار ہوتا ہے۔ [۱۵۹]

''فسانۂ تنویر'' بھی وفا کی دیوی، شرم وحیا کا پیکر، ممتا کی دیوی ایک مشرقی مظلوم بیوی ملکۂ تنویر کی داستان ہے جسے نواب فریدون قدر دھوکا دہی سے بیوی بنا کر تمام مال و جائیداد پر قبضہ کر کے گھر کے ایک کونے میں ڈال دیتا ہے اور خود اپنی پھوپھی زاد بہن سے دوسرا نکاح کر لیتا ہے۔ تنویر جہاں بیگم پر تین بچے چھوڑ کر ان کے چچازاد بھائی ثریا قدر کے ساتھ بھاگنے کا الزام لگا کر طلاق دے دیتا ہے۔ وہ ممتا کی دیوی اپنے بچوں سے بچھڑ کر در در کی ٹھوکریں کھاتی، ملازمہ بن کر گھروں میں کام کرتی ہے۔ یکے بعد دیگرے دو بچوں کی وفات کی خبر اسے دیوانہ بنا دیتی ہے۔ تیسرے اور سب سے

بڑے بیٹے کی علالت کی خبر پر ماما کی حیثیت سے بیٹے کی تیمارداری کے لیے جاتی ہے اور بیٹے کے ساتھ ہی خود بھی ابدی نیند سو جاتی ہے۔ [۱۶۰]

جس افسانہ ''بے گناہ کا قتل'' میں علامہ مرد کی بے انصافی کی ایک اور مثال پیش کرتے ہیں جس میں امیر احمد آفندی والیِ غرناطہ ایک غریب کسان کی بیٹی عزہ کی گفتگو سے متاثر ہو کر اسے اپنی ملکہ بناتے ہیں لیکن عزہ کی دوست مغیرہ سے یہ برداشت نہیں ہوتا تو وہ عزہ جیسی پاکدامن دوست پر اپنے چچازاد بھائی حارث کی محبت میں مبتلا ہونے کا الزام لگا کر اس باعصمت خاتون کو تختۂ دار پر چڑھا کر خود ملکہ بن جاتی ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی عزہ جیسی وفا کی دیوی بچوں کو باپ کی اطاعت کا درس دیتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ [۱۶۱]

اسی ہندستان میں طبقۂ نسواں کی حالت جتنی ابتر اور بدتر تھی وہ بیان سے باہر ہے اور علامہ اسی بے زبان طبقے کے ترجمان تھے۔ اس لیے ان کے افسانے بہت دردناک ہیں۔ وہ حزنیہ افسانوں کے موجد بھی تھے اور حزنیہ افسانوں کے خاتم بھی۔ ان کے افسانوں پر فضا بھی سسکیاں لے کر روتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

محترمہ صفیہ نقوی افسانہ ''الٰہی خیر'' میں ایک ماں کے خدشات کا ذکر کرتی ہیں جو اپنی بیٹی کے بورڈنگ میں رہنے کی صورت میں اسے لاحق ہیں۔ مسلمان گھرانے بیٹیوں کو تعلیم کو دلانے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن ساتھ ہی مغربی کورانہ تقلید سے بھی پریشان تھے کہ ان کی بیٹیاں جدید فیشن اختیار کر کے اسلامی روایات سے منحرف نہ ہو جائیں۔ مذکورہ افسانے میں بھی نصرت کی والدہ بیسویں صدی کی لڑکیوں کے لیے جناب سیدہؓ اور حضرت عائشہؓ جیسی علمی مہارت، زینب بنت علیؓ جیسی بہادری، زبیدہ زوجۂ ہارون رشید جیسی علم پروری، رضیہ اور نور جہاں جیسی سیاسی قابلیت، چاند سلطانہ جیسی دلیری اور اپنے جیسی پاکدامنی عطا کرنے کی دعا کرتی ہیں۔ مصنفہ نے خواتین کے توہمات کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے جن کی وجہ سے وہ طرح طرح کے خدشات کا شکار رہتی ہیں۔ [۱۶۲]

محترمہ عطیہ نازلی صاحبہ نے افسانہ ''دو بھائی'' میں عورت کو بھابی کے روپ میں رشتوں میں دراڑ ڈالنے کا سبب قرار دیا ہے۔ اس افسانے میں بھی نسیم اور تسنیم دو بھائی ایک دوسرے پر جان نچھاور

کرتے ہیں لیکن شادی کے بعد نسیم اپنی بیگم جمیلہ کی باتوں میں آ کر اپنے بھائی تسنیم سے بدگمان ہو جاتا ہے حالاں کہ تسنیم اپنی بھابی کی بہت عزت کرتا ہے۔لیکن اس کے باوجود جائیداد میں اس کا حصہ ہڑپ کرنے کی غرض سے جمیلہ اپنے شوہر کو سگے بھائی سے بدظن کر دیتی ہے۔آخرکار اس کا راز فاش ہو جاتا ہے اور تسنیم کا شادی سے پہلے کا یہ خدشہ بھی سچ ثابت ہو جاتا ہے کہ عورت اپنے مکر و فریب سے دو حقیقی بھائیوں میں تفرقہ ڈلوا دیتی ہے۔افسانہ نگار کا مقصد خواتین کو رشتوں کے تقدس کی ترغیب دینا ہے تا کہ وہ گھر کو جہنم بنانے کی بجائے جنت بنانے کا مؤجب بنیں۔[۱۶۳]

محترمہ راضیہ انور نے افسانہ ''سوکن'' میں طبقۂ نسواں کی جہالت اور لاعلمی کے ساتھ ساتھ رشتہ طے کرتے وقت فریقین کے حوالے سے تمام نشیب و فراز کا اندازہ نہ کرنے کو موضوع بنایا ہے۔ڈاکٹر زبیر کی شادی بھی ان کی خواہشات کے برعکس ایک ان پڑھ خاتون نزاکت سے ہو جاتی ہے جو پردے کی پابند اور مشرقی شرم و حیا کا پیکر ہونے کی وجہ سے مغربی تمدن کے دلدادہ شوہر کو اپنا اسیر نہیں بنا پاتیں اور شوہر ان سے چھٹکارا پانے کے لیے روپوشی اختیار کر کے دوسری شادی کر کے خوش و خرم زندگی گزارتے ہیں۔نزاکت شوہر کی تلاش سے مایوس ہونے کے بعد ہمت نہیں ہارتیں اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگتی ہیں۔جہاں ان کی دوستی مسز قریشی سے ہو جاتی ہے۔دونوں دیرینہ دوست بن جاتی ہیں۔اپنی بیماری سے مایوس ہو کر نزاکت اپنی زندگی کی کہانی ان کو سنا کر اپنی بیٹی خورشید کی ذمہ داری ان کے سپرد کرتی ہے۔نزاکت کے علاج کے لیے مسز قریشی اپنے شوہر ڈاکٹر قریشی کو ساتھ لاتی ہیں جو نزاکت کے شوہر ڈاکٹر زبیر قریشی نکلتے ہیں۔ڈاکٹر زبیر اپنی سفاکی پر نزاکت سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں لیکن مسز قریشی اور نزاکت کے تعلقات میں ''سوکن'' کا رشتہ معلوم ہونے پر سرد مہری آ جاتی ہے۔اس افسانے میں مصنفہ نے جہاں تعلیم کی اہمیت کو موضوع بنایا ہے وہاں نزاکت کے کردار کے ذریعے خواتین کو ہمت نہ ہارنے اور حالات کا مقابلہ کرنے کا درس بھی دیا ہے اور سوکن کے رشتے کو خواتین کے لیے سب سے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔[۱۶۴]

محترمہ آمنہ نازلی صاحبہ افسانہ ''افشاں'' میں ہندستانی معاشرے کی اس روایت کو تنقید کا نشانہ بناتی ہیں جس کے تحت گھر بھر کی ذمہ داری صرف ایک فرد پر ڈال دی جاتی ہے۔اس افسانے میں

بھی ایک ماں کا راج دلارا بیٹا اور بہنوں کا پیارا بھائی کم عمری میں ہی پورے گھر کی ذمہ داریوں کے بوجھ، ضرورت سے زیادہ محنت کرنے اور تفکرات کا شکار رہنے کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے اہلِ خانہ کو گہرے دکھ اور غم میں ڈال دیتا ہے۔ مصنفہ نے ماں، بیٹیوں کے صبر وتحمل کو دکھایا ہے کہ کس طرح وہ اس ناگہانی دکھ کو صبر سے جھیلتی اور اللہ کی رضا میں راضی رہتی ہیں جو یقیناً طبقۂ نسواں کے لیے ایک مثال تھا۔ [۱۶۵]

مجموعی طور پر ماہنامہ عصمت میں شائع ہونے والے تمام افسانوں میں طبقۂ نسواں کی زندگی سے متعلق ہر پہلو کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالی گئی اور ہندوستانی خاص پر مسلمان عورت پر معاشرہ جو ظلم روا رکھے ہوئے تھا اس کو سامنے لایا گیا۔ اس طرح مصنفین نے ایک طرف تو معاشرتی خرابیوں اور مردوں کی ناانصافی کو نمایاں کر کے حامیانِ نسواں کو اصلاح نسواں کی طرف متوجہ کیا اور دوسری طرف عورت کے حوالے سے ایسے پہلو بھی سامنے لائے کہ مسلمان عورت کس طرح شرافت کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ گھر اور جماعت کی اصلاح، مذہب کی تلقین، اخلاق کی تعلیم، مطالبہ حقوق نسواں، تعدد ازدواج، بیواؤں کی شادی، طلاق، خلع، بیٹیوں کو جائیداد میں حصہ دینا، اور مغربی معاشرت کی اندھا دھند تلقین، غرض طبقۂ نسواں سے متعلقہ ہر پہلو کو افسانوں کا موضوع بنا کر خواتین کی اصلاح اور حقوق کی جنگ لڑی گئی۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا رازق الخیری، عصمت کی کہانی (دہلی: عصمت بک ڈپو، ۱۹۴۶ء)، ص ۷۔

۲۔ شیخ محمد اکرام، ''عصمت'' عصمت (جولائی ۱۹۰۸ء): ص ۴۔

۳۔ مولانا رازق الخیری، ص ۵۱۔۵۲۔

۴۔ مدیرِ عصمت، ''مضمون نگاری کے قواعد'' عصمت (دسمبر ۱۹۴۰ء): ص ۴۳۴۔

۵۔ سکندر جہاں بیگم، ''اخبار و رسائل'' عصمت (جون ۱۹۰۸ء): ص ۲۶۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۵۔۲۶۔

۷۔ سلطان بیگم، ''عصمت کا خیر مقدم'' عصمت (جون ۱۹۰۸ء): ص ۲۷۔۲۹۔

۸۔ علامہ راشد الخیری، ''نارضامندی کی شادی'' عصمت (نومبر ۱۹۱۰ء): ص ۲۔۶۔

۹۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۱۰ء): ص ۲۔۸۔

۱۰۔ ایضاً، ''عورتوں کے حقوق'' عصمت (جنوری ۱۹۱۲ء): ص ۵۹۔۶۱۔

۱۱۔ ایضاً، ''آئینہ عبرت'' عصمت (جون ۱۹۱۲ء): ص ۲۔۶۔

۱۲۔ ہمشیرہ ایس۔ ایم، ''حقوق نسواں'' عصمت (اپریل مئی ۱۹۱۶ء): ص ۴۷۔۴۸۔

۱۳۔ مسز ڈپٹی لال صاحبہ، ''ہندوستان میں لڑکیوں کی حالت'' عصمت (جون ۱۹۱۳ء): ص ۳۳۔۳۶۔

۱۴۔ علامہ راشد الخیری، ''حقوق نسواں'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۶۸۔۲۷۰۔

۱۵۔ نذر سجاد حیدر، ''اسبابِ دِق وسِل'' عصمت (اگست ۱۹۲۷ء): ص ۱۲۰۔۱۲۵۔

۱۶۔ علامہ راشد الخیری، ''مظلوم کی فریاد'' عصمت (ستمبر ۱۹۱۰ء): ص ۱۔۹۔

۱۷۔ علامہ راشد الخیری، ''ساون کی چڑیاں'' عصمت (اپریل ۱۹۱۰ء): ص ۱۔۹۔

۱۸۔ ایضاً، ''ہماری بیٹیاں'' عصمت (اپریل ۱۹۱۱ء): ص ۴۔۸۔

۱۹۔ ایس۔ جے۔ عارف، ''دلہن بننے والی لڑکیوں پر ظلم'' عصمت (فروری ۱۹۱۳ء): ص

۱۸۔۲۲۔

۲۰۔ علامہ راشد الخیری، ''رواج'' عصمت (نومبر ۱۹۱۵ء): ص ۵۔

۲۱۔ علامہ راشد الخیری، ''عورت کی تحقیر'' عصمت (جون ۱۹۴۴ء): ص ۲۳۵۔۲۳۶۔

۲۲۔ صغرا ہمایوں مرزا، ''تقریر حقوق نسواں'' عصمت (اپریل ۱۹۳۰ء): ص ۴۰۔۴۴۔

۲۳۔ سہروریہ بیگم صاحبہ، ''مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم'' عصمت (جولائی ۱۹۰۸ء): ص ۸۔۱۱۔

۲۴۔ دختر صاحبزادہ عبدالمجید خاں، ''بدرالنسا بیگم'' عصمت (ستمبر ۱۹۰۸ء): ص ۱۸۔۲۱۔

۲۵۔ مسز ایچ فیضی صاحبہ، ''فلارنس نائٹنگل'' عصمت (اکتوبر ۱۹۰۸ء): ص ۱۔۸۔

۲۶۔ ذکیہ، ''مذہب اور عورتوں کی تعلیم'' عصمت (دسمبر ۱۹۰۸ء): ص ۲۔

۲۷۔ اے۔ ایف، ''بہنوں کو نصیحت'' عصمت (دسمبر ۱۹۰۸ء): ص ۲۷۔۲۸۔

۲۸۔ ہمشیرہ مرزا عبداللہ بیگ، ''مسلمان خواتین'' عصمت (اگست ۱۹۰۹ء): ص ۳۳۔۳۷۔

۲۹۔ ہدایت اللہ شیدؔا، ''خواتین مغلیہ کی علمی فیاضیاں'' عصمت (اکتوبر ۱۹۰۹ء): ص ۳۳۔۳۷۔

۳۰۔ سیدہ اصغری بیگم، ''تعلیم نسواں'' عصمت (اپریل ۱۹۱۱ء): ص ۵۹۔۶۰۔

۳۱۔ ہر ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم، ''تقریر'' عصمت (فروری ۱۹۱۲ء): ص ۲۔۱۳۔

۳۲۔ حامد اللہ افسر، ''امۃ العزیز زبیدہ'' عصمت (فروری ۱۹۱۲ء): ص ۳۷۔۳۹۔

۳۳۔ ذکیہ، ''تعلیم نسواں'' عصمت (مارچ ۱۹۱۲ء): ص ۵۰۔۵۵۔

۳۴۔ مسز تقی، ''کیا عورتوں کی تعلیم ضروری نہیں'' عصمت (جون ۱۹۱۲ء): ص ۶۹۔۷۵۔

۳۵۔ بنت محمود الحسن، ''مستورات کو تعلیم کی ضرورت'' عصمت (مارچ ۱۹۱۵ء): ص ۱۷۔۱۹۔

۳۶۔ وا۔ ح۔ د۔ س محمد نظام الدین خاں، ''لڑکیوں کی تعلیم'' عصمت (اگست ۱۹۱۵ء): ص ۱۰۔۱۲۔

۳۷۔ شہر بانو، ''عہد مغلیہ میں عورتوں کی حالت'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۹۴۔۲۹۶۔

۳۸۔ سیدہ، ''ہم خرما و ہم ثواب'' عصمت (جولائی ۱۹۰۸ء): ص ۱۶۔۱۸۔

۳۹۔ دختر انِ سید محمد شاہ صاحب، ''ایک تجویز'' عصمت (ستمبر ۱۹۰۸ء): ص ۷۔۱۰۔

۴۰۔ بیگم فیروز الدین احمد، ''نہ خرمانہ ثواب'' عصمت (ستمبر ۱۹۰۸ء): ص ۱۱۔۱۷۔

۴۱۔ حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں، ''اسلامی خواتین'' عصمت (اگست ۱۹۰۸ء): ص ۴۵۔۴۸۔

۴۲۔ محترمہ سروری صاحبہ، ''علم اخلاق'' عصمت (اکتوبر ۱۹۰۸ء): ص ۲۹۔۳۰۔

۴۳۔ نواب بیگم آف سچین، ''اخلاق'' عصمت (دسمبر ۱۹۰۸ء): ص ۴۔۵۔

۴۴۔ مسز احمد سعید، ''پردہ اور میل جول'' عصمت (اکتوبر ۱۹۰۹ء): ص ۱۵۔۱۷۔

۴۵۔ سید علی حیدر زیدی، ''طریقۂ تعلیم نسواں'' عصمت (اکتوبر ۱۹۰۹ء): ص ۴۹۔۵۳۔

۴۶۔ سیدہ وحید النساء بیگم رضوی، ''تعلیم نسواں پر ایک مختصر نوٹ'' عصمت (اپریل ۱۹۱۱ء): ص ۴۳۔۴۸۔

۴۷۔ سید علی امیر، ''انسان کی ضروریات'' عصمت (فروری ۱۹۱۲ء): ص ۲۸۔۳۲۔

۴۸۔ محی الدین بی۔اے، ''عالمِ خواب'' عصمت (فروری ۱۹۱۲ء): ص ۴۰۔۴۸۔

۴۹۔ پروفیسر زاہدی بی۔اے دہلوی، ''تحفۃ العروس'' عصمت (جون ۱۹۱۲ء): ص ۱۴۔۲۴۔

۵۰۔ تراب النساء بیگم، ''تعلیم نسواں'' عصمت (جون ۱۹۱۲ء): ص ۴۶۔۴۹۔

۵۱۔ ز۔خاتون، ''لڑکیوں کو اسکول میں تعلیم دینے پر ایک نظر'' عصمت (دسمبر ۱۹۱۴ء): ص ۴۹۔۵۲۔

۵۲۔ علامہ راشد الخیری، ''تقریر حقوق نسواں'' عصمت (جنوری ۱۹۲۶ء): ص ۲۔۸۔

۵۳۔ مریم عبداللہ بیگم، ''لڑکیوں کو خانہ داری کی تعلیم'' عصمت (ستمبر ۱۹۳۰ء): ۲۱۴۔۲۱۶۔

۵۴۔ مسز یوسف الزماں، ''ہماری تعلیم کس زبان میں ہونی چاہیے'' عصمت (جولائی ۱۹۲۷ء): ص ۵۸۔۶۰۔

۵۵۔ الف بیگم، مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کا طریقہ‘‘ عصمت (نومبر ۱۹۲۲ء): ص ۹۔
۵۶۔ ڈاکٹر نصیر الدین احمد، ’’نسوانی نصاب تعلیم‘‘ عصمت (مئی ۱۹۳۶ء): ص ۳۹۱۔۳۹۲۔
۵۷۔ مسز راشد الخیری، ’’بیوقوف‘‘ عصمت (نومبر ۱۹۰۸ء): ص ۴۲۔۳۹۔
۵۸۔ امینہ خاتون، ’’کثرت از دواج‘‘ عصمت (نومبر ۱۹۰۸ء): ص ۴۶۔۴۳۔
۵۹۔ مسز محمد اکرام، ’’اچھی بیوی‘‘ عصمت (جولائی ۱۹۰۹ء): ص ۶۔۸۔
۶۰۔ بیاہی بہنوں کی خیر خواہ، ’’شوہر کیونکر بگڑتے ہیں‘‘ عصمت (اکتوبر ۱۹۰۹ء): ص ۱۔۵۔
۶۱۔ علمدار حسین واسطی، ’’ساس اور بہو‘‘ عصمت (اکتوبر ۱۹۰۹ء): ص ۵۴۔۵۷۔
۶۲۔ اہلیہ مولوی عبد الجبار، ’’حریت نسواں‘‘ عصمت (نومبر ۱۹۰۹ء): ص ۹۔۱۴۔
۶۳۔ مولوی عطا محمد، ’’ایک متوسط درجہ کی مسلمان عورت کے لیے دستور العمل‘‘ عصمت (فروری ۱۹۱۳ء): ص ۲۷۔۳۱۔
۶۴۔ سید محمد فاروق محمد، ’’ساس بہو کے جھگڑے‘‘ عصمت (جنوری ۱۹۱۵ء): ص ۲۔۶۔
۶۵۔ ہمشیرہ احمد عبد اللہ، ’’پردہ‘‘ عصمت (جنوری ۱۹۱۵ء): ص ۷۔۸۔
۶۶۔ عالیہ خاتون نقویہ، ’’ساس اور بہو کے تعلقات‘‘ عصمت (ستمبر ۱۹۱۴ء): ص ۲۱۔۲۵۔
۶۷۔ زیڈ۔ بی، ’’خاوند کا مرتبہ اور اس کی محبت‘‘ عصمت (اکتوبر ۱۹۱۴ء): ص ۹۔۱۲۔
۶۸۔ سردار محمدی بیگم، ’’ساس بہو کے جھگڑے اور اس کا علاج‘‘ عصمت (اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۷۸۔۲۸۴۔
۶۹۔ مولانا عبد الحلیم شرر، ’’رخصتی کی نصیحتیں‘‘ عصمت (نومبر ۱۹۲۶ء): ص ۳۱۶۔۳۱۸۔
۷۰۔ ظفر جہاں بیگم، رشتہ کرتے وقت احتیاط‘‘ عصمت (ستمبر ۱۹۲۷ء): ص ۲۰۳۔۲۰۶۔
۷۱۔ مسز یوسف الزماں، ’’منگنی‘‘ عصمت (ستمبر ۱۹۶۷ء): ص ۱۹۹۔۲۰۲۔
۷۲۔ رضویہ خاتون، ’’منگیتر سے خط و کتابت‘‘ عصمت (ستمبر ۱۹۲۷ء): ص ۱۹۵۔۱۹۸۔
۷۳۔ صغرا ہمایوں مرزا، ’’منگیتر سے خط و کتابت‘‘ عصمت (اگست ۱۹۲۷ء): ص ۱۱۵۔۱۱۹۔
۷۴۔ مولانا شوکت علی، ’’مسلمان بیٹیوں کے لیے میرا پیام‘‘ عصمت (جولائی ۱۹۳۸ء): ص

۱۰۳۔۱۰۴۔

۷۵۔ مسزعبداللہ، ''شہرت کی خواہش''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جون ۱۹۰۸ء)، ص۲۲۔۲۴۔

۷۶۔ علامہ راشدالخیری، ''سچا زیور''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جولائی ۱۹۰۹ء)، ص۱۔۵۔

۷۷۔ ر۔ب، ''اصولِ زندگی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جولائی ۱۹۰۹ء) ،ص۲۴۔۲۵۔

۷۸۔ علامہ راشدالخیری، ''عشا کی نماز''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، ستمبر ۱۹۰۹ء)، ص۱۔۶۔

۷۹۔ علامہ راشدالخیری، پکارشتہ، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اگست ۱۹۰۹)ء، ص۴۔۵۔

۸۰۔ زمزم بی۔اے دہلوی، ''فریبِ جلوہ''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، مئی ۱۹۱۰ء)، ص۲۶۔۳۲۔

۸۱۔ نوراحمد وکیل، ''خانہ داری اور تربیت''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جون ۱۹۱۰ء)، ص۱۸۔۲۲۔

۸۲۔ علامہ راشدالخیری، ''مذہب''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، ستمبر ۱۹۱۲ء)، ص۶۲۔۶۳۔

۸۳۔ ہر ہائینس نواب بیگم آف سچین، ''سینا پرونا''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اگست ۱۹۰۸ء)، ص۱۔۳۔

۸۴۔ مسز محمد عبداللہ، ''سینا پرونا''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اکتوبر ۱۹۰۸ء)، ص۲۵۔۲۸۔

۸۵۔ سید احمد دہلوی، ''عورتوں کے من گھڑت مسئلے''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن

پریس، جولائی ۱۹۰۸ء)،ص ۴۰۔۴۴۔

۸۶۔ بنت حفیظ اللہ، ''میٹھی زبان''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اپریل ۱۹۱۱ء)، ص ۵۷۔۵۸۔

۸۷۔ علامہ راشد الخیری، ''بڑوں کا ادب''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اگست ۱۹۱۰ء)، ص ۲۔۷۔

۸۸۔ علامہ راشد الخیری، ''عید کی خوشی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اکتوبر ۱۹۱۰ء)، ص ۲۔۸۔

۸۹۔ فخرِ جہاں، ''گھر کی صفائی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جون ۱۹۰۸ء)، ص ۲۱۔

۹۰۔ امۃ الوحید بیگم، ''چند مفید باتیں''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، فروری ۱۹۱۳ء)، ص ۱۵۔۲۲۔

۹۱۔ علامہ راشد الخیری، ''کیا ہماری خواتین نے کچھ ترقی کی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اکتوبر۔نومبر ۱۹۱۲ء)، ص ۲۔۶۔

۹۲۔ مسز عزیز، ''غصہ''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اپریل ۱۹۱۱ء)، ص ۴۰۔۴۳۔

۹۳۔ فیروزہ سراج الدین، ''ننھوں کی نگہداشت''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جولائی ۱۹۰۸ء)، ص ۱۔۷۔

۹۴۔ بنتِ نذر الباقر، ''مہذب گھر''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اگست ۱۹۰۸ء)، ص ۹۔۱۸۔

۹۵۔ بنت نذر الباقر، ''مہذب گھر''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، دسمبر ۱۹۰۸ء)، ص ۶۔۲۱۔

۹۶۔ ن۔ا بیگم، ''بچوں کے اخلاق کی درستگی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، دسمبر ۱۹۰۸ء)، ص ۲۹۔۳۱۔

۹۷۔ کنیز محمد بیگم، ''تعلیم جدید اور ہندُستانی لڑکیاں''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، جنوری ۱۹۲۶ء)، ص ۱۳۔۱۹۔

۹۸۔ عائشہ بیگم، ''بچوں کی بری عادتیں''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، ستمبر ۱۹۲۷ء)، ص ۲۴۴۔۲۴۵۔

۹۹۔ شائستہ اختر بانوں سہروردی، ''تعلیم یافتہ لڑکیاں اوران کی ماؤں کی بے جا نازبرداری''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو۔ جون ۱۹۳۵ء)، ص ۴۱۷۔۴۲۱۔

۱۰۰۔ دختر صاحبزادہ عبدالمجید خاں، ''تعلیم وتربیت''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جون ۱۹۰۸ء)، ص ۱۷۔

۱۰۱۔ سید احمد دہلوی، ''بچوں کا رکھ رکھاؤ'' (ناسمجھ مائیں)، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، جون ۱۹۰۸ء)، ص ۳۶۔۴۲۔

۱۰۲۔ سید احمد دہلوی، ''بچوں کا رکھ رکھاؤ (نیند کا بیان)''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، ستمبر ۱۹۰۸ء)، ص ۵۰۔۵۴۔

۱۰۳۔ سلطان، ''مسلمانان ہندستان اور ٹرکی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، نومبر ۱۹۰۸ء)، ص ۳۵۔۳۸۔

۱۰۴۔ والدہ سید معین الامام، ''بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائی نہیں جاتی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، فروری ۱۹۱۳ء)، ص ۲۸۔۳۰۔

۱۰۵۔ بلقیس بیگم، ''اتفاق''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، فروری ۱۹۱۳ء)، ص ۴۱۔۴۴۔

۱۰۶۔ بنت عطا محمد خاں، ''آیا اسلام ترقی کر رہا ہے یا تنزلی؟''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، مارچ ۱۹۱۲ء)، ص ۱۵۔۲۰۔

۱۰۷۔ کشور حمیدی، ''موجودہ جنگ میں عورتوں کا حصہ''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، جنوری ۱۹۴۵ء)، ص ۲۲۔۲۳۔

۱۰۸۔ عبدالحئ عباسی، ''تحریک نسواں کی ابتدااور ترقی اسلامی ممالک میں''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، نومبر ۱۹۲۸ء)، ص ۴۲۹۔۴۳۴۔

۱۰۹۔ شائستہ اختر سہروردی، ''روس نے کیوں کر تیاری کی''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، اگست ۱۹۴۴ء)، ص ۷۹۔۸۲۔

۱۱۰۔ ایس۔ کے صغرا سبزواری، ''سیاسی ماحول میں عورتوں کی ترقی کے وسائل''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، جنوری ۱۹۳۷ء)، ص ۱۵۔۱۶۔

۱۱۱۔ مسز سید احمد مچھلی شہری، ''حق رائے دہندگی اور عورتیں''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، فروری ۱۹۳۷ء)، ص ۹۲۔۹۵۔

۱۱۲۔ نصیرالدین ہاشمی، ''خواتین یورپ اور ہندستان کی مسلمان عورتیں''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، اکتوبر ۱۹۳۱ء)، ص ۲۸۹۔۲۹۵۔

۱۱۳۔ ر۔س صاحبہ، ''مسلمان اور کانگریس''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، ستمبر ۱۹۳۸ء)، ص ۲۱۷۔۲۲۰۔

۱۱۴۔ شبیہ فاطمہ، ''سیاسی تحریکات اور مسلم خواتین''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، اکتوبر ۱۹۳۸ء)، ص ۳۱۷۔۳۲۱۔

۱۱۵۔ برج کماری، ''ہائے موت''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اکتوبر ۱۹۰۸)ء، ص ۳۱۔۳۳۔

۱۱۶۔ شیخ محمد اکرام، ''مسز ممتاز علی کا انتقال''، مشمولہ عصمت، (دہلی: مخزن پریس، اکتوبر ۱۹۰۸ء)، ص ۴۲۔۴۷۔

۱۱۷۔ مولوی محمد ظفر، ''ملک کا ناقابلِ تلافی نقصان''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو دسمبر ۱۹۳۸ء)، ص ۲۲۷۔

۱۱۸۔ رازق الخیری، ''مصطفیٰ کمال اتاترک''، مشمولہ عصمت، (دہلی: عصمت بکڈ پو، دسمبر ۱۹۳۸ء)، ص ۴۴۲۔۴۴۳۔

۱۱۹۔ ر۔س صاحبہ، ''مصطفیٰ کمال اتاترک'' عصمت (دسمبر ۱۹۳۸ء): ص۴۴۴۔۴۴۸۔

۱۲۰۔ نذر سجاد حیدر، ''مصورِ غم کا کوہِ الم'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص۲۲۶۔

۱۲۱۔ محترمہ جمیلہ بیگم، ''رانڈوں کا حمایتی'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص۲۲۶۔

۱۲۲۔ عبدالماجد دریابادی، ''پتھروں کو موم کرنے والا انسان'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص ۲۲۷۔

۱۲۳۔ ڈاکٹر محمد اقبال، ''اردو ادب کو صدمۂ عظیم'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص۲۲۸۔

۱۲۴۔ منشی پریم چند، ''نسوانی حقوق کا حامی'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص۲۲۸۔

۱۲۵۔ ہمشیرہ ضیاء الدین صاحب، ''شہنشاہ ادب کی دائمی جدائی'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص۲۲۸، ۲۳۰۔

۱۲۶۔ مولانا رازق الخیری، ''آہ علامہ اقبال'' عصمت (مئی ۱۹۳۸ء): ص۳۲۶۔

۱۲۷۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص۱۸۸۔۱۹۰۔

۱۲۸۔ ہر ہائی نس نواب بیگم صاحبہ جزیرہ حبشان، ''سیر یورپ'' عصمت (جولائی ۱۹۰۸ء): ص ۱۳۔

۱۲۹۔ ایضاً، ص۱۴۔

۱۳۰۔ ایضاً، ص۱۵۔

۱۳۱۔ ایضاً۔

۱۳۲۔ ایضاً (اگست ۱۹۰۸ء): ص۳۹۔

۱۳۳۔ ایضاً، ص۴۳۔

۱۳۴۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۰۸ء): ص۳۴۔

۱۳۵۔ ایضاً، ص۳۹۔

۱۳۶۔ ایضاً (اکتوبر ۱۹۰۸ء): ص۲۲۔

۱۳۷۔ ایضاً، (نومبر ۱۹۰۸ء): ص۲۶۔

۱۳۸۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۰۸ء): ص ۲۵۔

۱۳۹۔ ایضاً (اپریل ۱۹۱۱ء): ص ۴۲۔

۱۴۰۔ الیس کے صغرا سبزواریہ، ''سفرنامۂ ایران'' عصمت (فروری ۱۹۳۶ء): ص ۱۱۲۔

۱۴۱۔ ایضاً، ص ۱۱۳۔

۱۴۲۔ رفیع الدین ہاشمی، ص ۱۱۶۔۱۲۸۔

۱۴۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔

۱۴۴۔ علامہ راشدالخیری، ''شام زندگی'' عصمت (اپریل ۱۹۱۷ء): ص ۱۷۔

۱۴۵۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۱۴۶۔ ایضاً، ص ۱۹۔

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۱۴۸۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۱۴۹۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۱۵۰۔ ایضاً، ۱۳۶۔

۱۵۱۔ ایضاً، ص ۱۳۱۔

۱۵۲۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۲۸۔۱۳۶۔

۱۵۳۔ علامہ راشدالخیری، ''نانی عشو'' عصمت (جولائی ۱۹۲۷ء): ص ۵۳۔

۱۵۴۔ ایضاً (اگست ۱۹۲۷ء) ص ۱۱۲۔

۱۵۵۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۲۷) ص ۱۸۷۔

۱۵۶۔ ایضاً، ص ۱۸۸۔

۱۵۷۔ علامہ راشدالخیری، ''تمغۂ شیطانی'' عصمت (جنوری ۱۹۲۹ء): ص ۲۰۔

۱۵۸۔ ایضاً (مارچ ۱۹۲۹ء): ص ۱۶۶۔

۱۵۹۔ علامہ راشدالخیری، ''مظلوم بیوی کا پاک جذبہ'' عصمت (اگست ۱۹۲۳ء): ص ۱۴۔۱۹۔

۱۶۰۔ ایضاً،''فسانۂ تنویر'' عصمت (اگست ستمبر ۱۹۱۳ء):ص ۵۷۔

۱۶۱۔ ایضاً،'' بے گناہ کا قتل'' عصمت (نومبر دسمبر ۱۹۱۶ء):ص ۴۸۔۵۰۔

۱۶۲۔ صفیہ نقوی،''الٰہی خیر'' عصمت (اپریل ۱۹۴۷ء):ص ۱۷۷۔۱۸۰۔

۱۶۳۔ عطیہ نازلی،''دو بھائی'' عصمت (۱۹۴۷ء):ص ۱۹۵۔۱۹۸۔

۱۶۴۔ رضیہ انور،''سوکن'' عصمت (مئی ۱۹۴۷ء):ص ۲۴۳۔۲۴۷۔

۱۶۵۔ آمنہ نازلی،''افشاں'' عصمت (مئی ۱۹۴۷ء):ص ۲۵۰۔۲۵۱۔

باب چہارم

بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت
کی شعری تخلیقات کا کردار: تنقیدی مطالعہ

باب چہارم

بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت کی شعری تخلیقات کا کردار: تنقیدی مطالعہ

جون ۱۹۰۸ء کے عصمت کے شمارے میں ''عصمت میں نظمیں کیسی ہوں گی'' کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا گیا۔ جس میں کلام منظوم کی اہمیت کے حوالے سے بتایا گیا کہ وہ بچوں کو جلدی یاد ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی خبردار بھی کیا گیا کہ ہر منظوم کلام نوعمر بچوں خاص طور پر ناتجربہ کار لڑکیوں کے پڑھنے کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ بچوں کے لیے اخلاقی مطالب اور مناظر فطرت واشیاء کی منظر کشی والی منظومات کو ان کی اخلاقی تربیت اور قوت مشاہدہ کی ترقی کے لیے بہتر بتایا گیا۔ بچوں، لڑکیوں اور نوجوان خواتین کے لیے ایسی شاعری لکھنے کا کہا گیا جو زبان کی سادگی، خیالات کی صفائی اور مطالب کی عام فہمی جیسی خصوصات سے بھرپور ہو اور اس میں صنعتہائے کلام کا کم سے کم استعمال ہو۔ سیدھی سادھی باتیں ہوں۔ گل وبلبل، زلف وسنبل اور ساغر وحل کے استعارات سے مبّرا ہو۔

سخن ور حضرات سے کہا گیا کہ وہ عصمت کے لیے خاص طور پر چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھیں۔ وہ نظمیں عصمت میں دیے گئے عنوانات پر لکھی جائیں۔ ان عنوانات سے متعلق کہا گیا کہ وہ مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور نیچرل ہوں جن کی اطلاع پہلے سے ہی رسالہ میں دے دی جایا کرے گی۔ جون اور جولائی ۲۰۰۸ء کے شمارے کے حوالے سے بتایا گیا کہ ان دو ماہ کے رسائل کے لیے منظومات کا اہتمام کر لیا گیا ہے۔ البتہ اگست کے شمارے کے لیے ۱۵ جولائی، ستمبر کے شمارے کے لیے ۱۵ اگست اور اکتوبر کے شمارے کے لیے ۱۵ ستمبر کی تواریخ تک منظومات بھیجنے کا کہا گیا اور ان تینوں مہینوں کے لیے علی الترتیب خدا پرستی، ادب اور نور جہاں کے عنوانات منظومات مقرر کیے گئے۔ شعرا کے لیے کچھ قیود کا التزام بلحاظ حجم رسالہ ودیگر حالات ضروری قرار دیا گیا:

ا۔ ہر نظم بیس اشعار سے زیادہ نہ ہو۔

۲۔ زبان کی سادگی کو مدنظر رکھا جائے۔

۳۔ مقررہ عنوان سے باہر نکلنے سے گریز کیا جائے۔[1]

ماہنامہ عصمت کی نامور شاعرات میں مسز ممتاز علی، زینب عثمانیہ لدھیانوی، زہرہ نقی الحسن، رابعہ خاتون پنہاںؔ، ام زہرہ ہاشمی بدایونی، بیگم دعا ڈبائیوی، تیمور جہاں بیگم حجابؔ، آمنہ خاتون عفتؔ، خورشید اقبال حیاؔ، گوہر اقبال حورؔ، صفیہ بیگم شمیمؔ، نواب بیگم آف سچین، سیدہؔ، ک خاتون اکبر آبادی، صفیہ بیگم قمرؔ، مسز محمد یوسف، بلقیس جمالؔ بریلوی، مسعودہ بیگم اداؔ، کافی بیگم ناموسؔ، اختر جہاں بیگم اخترؔ، انور جہاں سراج، زہرہ اختر بیگم الوری، مسز انعام الحق، ظہور بانو، عابدہ بیگم، صغرا بیگم، خورشید آرا خورشید، اہلیہ محمد حسن خان، نصیرہ راز، نواب قمر جہاں بیگم، نوشابہ خاتون قریشی اور خیر النساء ناچیز شامل ہیں۔

طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود کے لیے شاعری کرنے والے شعرا حضرات میں سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ، ابوالاعجاز ازلؔ، جلال ملیح آبادی، جام نوائی بدایونی، علامہ راشد الخیری، منظر عباس، خلیل الرحمٰن دانش دہلوی، آغا شاعر قزلباش، محمود اسرائیلی، تلوک چند محرومؔ، اندر جیت شرماؔ، محوی صدیقی لکھنوی، بالک رام شادؔ بجواڑیہ، کیف مرادآبادی، محشر عابدی، جوشؔ ہزار داستاں، سید راحت حسین، سید عنایت حسین امدادؔ عظیم آبادی، منشی درگا سہاے صاحب سرور جہاں آبادی، مولانا الطاف حسین حالیؔ، ذ۔ فتحپوری، جناب اشک بلند شہری، خواجہ دل محمد صاحب، حامد حسن قادری، روحؔ گیاوی، ناصر نذیر فراق دہلویؔ، عبدالخالق خلیق دہلویؔ، خلیق برہان پوری، مرزا احمد ہادی عزیز لکھنوی، سید محمود حسن کیتھل، ثاقب کانپوری اور ڈاکٹر سعید احمد شامل ہیں۔

ماہنامہ عصمت کی شعری تخلیقات میں منظومات، رباعیات، غزلیات، قطعات اور سانیٹ شامل ہیں۔

ا۔ منظومات

نظم کے لغوی معنی تنظیم کے ہیں۔ لیکن اصطلاح سخن میں نظم ایسی مسلسل اور مربوط صنف ہے جس کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے۔ شاعر اسی مرکزی خیال کو ذہن میں رکھ کر داخلی اور خارجی تاثرات

قلم بند کرتا ہے۔ پوری نظم ایک وزن مین ہوتی ہے اور اس میں قوافی کا ایک معین نظام ہوتا ہے۔ [۲]

ماہنامہ عصمت کے شعرا میں زیادہ تعداد خواتین کی ہے۔ تاہم مرد شعرا کی منظومات کی بھی ایک معقول تعداد نظر آتی ہے۔

موضوعات کے لحاظ سے ماہنامہ عصمت کی منظومات کو درج ذیل موضوعات میں تقسیم کر دیا گیا ہے:۔

۱.۱۔ حمدیہ منظومات

خالقِ کائنات کی تسبیح میں جہاں چرند پرند اور تمام مخلوقات رطب اللسان رہتی ہیں۔ وہاں انسان بھی اپنے رب کا شکر بجالاتے ہوئے اس کی ثنا خوانی کرتا ہے۔ ''حمدِ خدا'' کے عنوان سے نظم میں سید غلام مصطفیٰ ذہین نے اپنے معبود کے حضور سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہے:

اے خدا! ہے تُو ہی خلاقِ زمین و آسماں — تو ہی نے پیدا کیے مہر و ماہ و انس و جاں
کیا تری تعریف ہوسکتی ہے؟ ہو سکتی نہیں — حمد کے قابل نہ انساں ہے نہ انساں کی زباں [۳]

قاضی احمد میاں صاحب اختر ''نغمۂ توحید'' کے عنوان سے حمدیہ کلام میں اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے ہوئے اپنے دل و جاں اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جیسے دلبر پر دل فدا ہونے کو اپنی خوش نصیبی قرار دیتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے بہت پُر آشوب راستے سے گزرنا پڑتا ہے تبھی اس محبوبِ حقیقی کی معرفت نصیب ہوتا ہے:

دل ہو تجھ سے جدا یہ مشکل ہے — جاں فدا ہو یہ بات ہے آساں
وصل کی راہ تیری پُر آشوب — ہجر کا تیرے کچھ نہیں درماں [۴]

۱.۲۔ نعتیہ منظومات

آقائے دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت بیان کرنا ہر مسلمان کی آرزو ہوتی ہے۔ محترمہ زہرہ نقی الحسن صاحبہ نے بھی ان کے حضور ''نعتیہ کلام'' پیش کیا۔ اللہ نے خود قرآن پاک میں اپنے بعد حضورؐ کی اطاعت کرنے اور ان پر درود و سلام بھیجنے کا حکم دیا۔ شاعرہ حضورﷺ اور اہلِ بیت

حضرت علیؓ، حضرت امام حسنؓ و حسینؓ اور حضرت فاطمہؓ کے حضور بادِ صبا کے ہاتھ سلام بھجواتی ہیں اور اس خواہش کا اظہار کرتی ہیں کہ انہیں آپؐ کے روضہ مبارک کی زیارت نصیب ہو:

ہے آرزو یہ میری دیکھوں مزار تیرا
مکہ کی سرزمین پر آخر ہو کام میرا ۵

رابعہ خاتون پنہاںؔ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ''ہدیہ نعت'' پیش کرتی ہیں۔ شاعرہ حضور کو شاہ ہدیٰ، بدر الدجےٰ، نور الہدےٰ، خورشید اعظم، شہ جن و ملک، مالکِ ارض و سما، نجاتِ گمرہاں، شافع روزِ جزا، مداوائے جراحت، زخمی دل کی دوا، ختم المرسلین، تاج انبیا، خیر الورا، حبیبِ حق تعالیٰ اور سردارِ عالم، سرورِ کون و مکاں کے خوبصورت القابات سے یاد کرتی ہیں اور اس بات کی تمنا کرتی ہیں کہ انہیں روزِ محشر اللہ کے حضور شرمندہ نہ ہونا پڑے اور محمد ﷺ انھیں اپنے دامانِ رحمت میں چھپا لیں۔

یہ سر ہو اور سنگِ آستانِ مصطفےٰ بہنو
مجھے آغوش میں اپنی چھپا لے دامنِ یثرب
چھپا لیں اپنے دامن میں ہو پنہاںؔ
نہ روزِ حشر شرمندہ حضورِ حق میں ہو پنہاںؔ

مسدس ہیئت میں شاعر جام نوائی بدایونی نے نعت ''یتیموں کا والی'' لکھی۔ اس نعت میں شاعر نے روزِ عید کا مشہور اسلامی واقعہ منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔ حضور ﷺ صحابہ کرامؓ کے ہمراہ نمازِ عید کے لیے جا رہے تھے کہ بچوں کا ایک مجمع نظر آیا۔ آپؐ اُن کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ سب بچوں کی خوشی دیدنی تھی۔ معصوم بھولی بھالی صورتیں عید کی خوشی میں دمک رہی تھیں، لیکن انھی بچوں میں ایک یتیم بچہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس، حسرت و یاس کیساتھ دوسروں کو دیکھ رہا تھا۔ آپؐ اس بچے کو اپنے ہمراہ گھر لے آئے اور حضرت فاطمہؓ سے فرمایا کہ میں آپؓ کے لیے عید کا تحفہ، خدا کا انعام یہ بچہ لایا ہوں۔ جنابِ سیدہ شکرانۂ خالق بجالاتے ہوئے حضرت حسنینؓ کا ایک جوڑا لے آئیں۔ اپنے مبارک ہاتھوں سے اس بچے کو نہلا کر یہ لباس پہنایا۔ آپؐ نے اس بچے سے فرمایا! اب غم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ میں تمہارا نانا، حضرت علیؓ باپ، حضرت فاطمہؓ والدہ اور حضرت حسنینؓ تمہارے بھائی ہیں۔ حضرت حسنینؓ اس بچے کو ہمراہ لے کر خوشی خوشی عیدگاہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ بے شک آپ ﷺ کی زندگی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جو مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

سلام اس پر بدولت جس کی، غم کو بھول جاتے تھے
یتیم اپنی یتیمی کے اَلم کو بھول جاتے تھے [۷]

نعت ''ولادت نبویؐ'' میں حضرت علامہ راشد الخیریؒ ربیع الاول کے ماہِ مبارک کی خوبصورت ساعتوں کو بیان کرتے ہوئے آپؐ سے محبت وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ سب لوگ اکٹھے ہو کر آپؐ کی بارگاہ میں ہدیۂ درود وسلام بھیج رہے ہیں اور متمنی ہیں کہ آپؐ ان پر کرم فرما ہوں، ان کی محفل کو اپنی آمد سے جگمگا دیں۔ شاعر درحقیقت حضورؐ سے بے پناہ محبت کا اظہار کر رہے ہیں اور ان پر اپنی جاں فدا کرنے کا اظہار کر رہے ہیں:

زمیں و زماں تجھ پہ قربان ہو
ملائک سے ارفع تیری شان ہو
تو دنیا کا بے مثل انسان ہو
خدا تیرا حافظ نگہباں ہو
فدا تجھ پہ جاں جلد آ جلد آ [۸]

محترمہ حمیرا ثاقب ''عرضداشت'' کے عنوان سے نعتیہ کلام میں حضورؐ کی بارگاہ میں سلام پیش کرتی ہیں۔ اور آپ کی ذات بابرکات کو سید المرسلین، سرور کائنات، فخرِ موجودات، فخر آدم اور رہبر عظیم قرار دیتے ہوئے انہیں دین اسلام کے استحکام کا مؤجب قرار دیتی ہیں۔ آپؐ کی تعلیمات سے نظام کفر کا خاتمہ ہو گیا۔ شاعرہ کے بقول آپؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مسلمانوں نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ مگر جونہی مسلمان اطاعتِ رسولؐ سے منحرف ہوئے ان کی درویشی، سلطانی، جاہ وحشمت کچھ بھی باقی نہ رہا۔ شاعرہ امتِ مسلمہ کے اتحاد کی دعا کرتے ہوئے پورا عالم مسلمانوں کے زیرنگیں ہونے کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں:

ترے نقشِ قدم پر جب تلک چلتے رہے مسلم
شکوہ عزت و سطوت کا لہراتا رہا پرچم
بہار آجائے پھر اِک بار اس اُجڑے گلستان میں
اسی صورت سے ہو مسلم کے پھر زیرِ نگیں عالم [۹]

۳.۱۔ مظاہر ومناظرِ فطرت پر منظومات

زینب عثمانیہ لدھیانوی نظم ''کسان اور برسات'' میں برسات کی ایک کسان کے لیے اہمیت پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ آسمان پر بادلوں کا قافلہ دیکھ کر دہقانوں کے مایوس چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں، ان کی محنت کے بار آور ہونے کی امید برآتی ہے۔ برسات کی بوندیں گیت گاتے ہوئے ہر انسان کو شاد کر دیتی ہیں۔ برسات کی نعمت برسنے پر کسان اپنے رب کے حضور سجدۂ شکر بجالاتا ہے، اچھی فصلوں کی امید سے اس کا دل خوشی سے معمور ہو جاتا ہے:

ابر میں جیتا ہے یوں یہ سبزیوں کا پاسباں
کھیت میں دل اور گھر کی خام دیواری میں جاں [۱۰]

''ساون'' نظم شاعرہ سیدہ نے پٹنہ سے روانہ کی۔ اس نظم میں انھوں نے ساون کے موسم کی بہت خوبصورت منظر کشی کی۔ وہ اپنی دوستوں کو اپنے ساتھ ساون منانے کی دعوت دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ ساون کے موسم میں باغ میں گھٹائیں اپنے جوبن پر آئی ہوئی ہیں۔ بادل، سبزہ، ٹھنڈی ہوائیں، پتوں سے ٹپکتا پانی، پانی میں شرابور پودے سب ایک دل نشین منظر پیش کر رہے ہیں۔ روشیں چندن کی مانند صاف ہیں۔ انھوں نے بجلی کے چمکنے کو نیلم کے نگینے پہ جڑے ہوئے کندن اور پیڑوں کے جھکنے کو دلہن سے تشبیہ دی ہے۔

آؤ مِل جُل کے سکھی آج منائیں ساون
آج کل باغ پر عالم ہے، گھٹا پر جوبن
ہائے کیا باغ ہے، کیا ابر ہے، کیا سبزہ ہے
بوندیاں پڑتی ہیں، چلتی ہیں ہوائیں سَن سَن [۱۱]

''سحر کی آمد آمد'' کے عنوان سے نظم جوشؔ ہزار داستان نے لکھی۔ اس نظم میں انھوں نے خوبصورت و نادر تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر طلوعِ صبح کے دل نشین منظر کو بیان کیا ہے۔ سحر کی آمد کے ساتھ ہی کلیاں کھل کر پھول بن جاتی ہیں اور پرندے شاخوں پر چہچہانے لگتے ہیں۔ شاعر نے ''سحر'' کے لیے شمع اور عروسِ فطرت کا استعارہ استعمال کیا ہے اور سحر کی آمد کو ایک ایسی دلھن کہا ہے جو اپنی پیشانی سے اپنی زلفیں ہٹا رہی ہو:

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے گیسو اٹھا رہی ہے
سحر کا تارا نکھر چلا ہے، افق پہ سرخی سی چھا رہی ہے [۱۲]

مظاہر فطرت ہمیشہ انسان کا دل موہ لیتے ہیں۔ ''ندی کا راگ'' کے عنوان سے نظم میں سید راحت حسین بی اے، بی۔ ایل نے خوبصورت لہراتی، بل کھاتی ندی کی تصویر کشی کی ہے۔ ندی شان و تمکنت سے لہراتی، اپنے حسن و ادا کا جلوہ دکھاتی مرغابیوں کے گھیرے میں شور کرتی، غل مچاتی، اپنا فسانہ سناتی، اپنا راگ گاتی ہوئی آتی ہے۔ شاعر نے ندی میں چمکتے ریت کے ذروں کو طلائی زیورات اور موجوں کے شور کو نقرئی گھنٹیوں سے تعبیر کیا ہے:

ذرے میرے طلائی ہر موج نقرئی ہے   تاباں ہے مجھ میں سورج میں اس پر چھا رہی ہوں
طوفان خیز لہریں آلودہ جھاگ میں ہیں   قہر و غضب کا اپنے نقشہ دکھا رہی ہوں [۱۳]

''برسات کی ایک شام'' نظم میں شاعرہ بلقیس جمال خاتون نے برسات کے خوبصورت موسم کی ایک شام کو موضوع بنایا ہے۔ اس دلکش اور حسین شام میں ہوائیں، فضائیں، طیور، قمریاں، ڈالیاں اور شوخ و الہڑ لڑکیاں سب ہر فکر سے آزاد بس سہانے موسم سے حظ اٹھاتے ہیں:

ٹپک رہی ہیں بوندیاں   چمک رہی ہیں پتیاں
کہیں صدائے ''پی کہاں''   کہیں ہیں مست قمریاں
عجب فضائیں ہیں حسین
چمن ہے نغمہ آفرین [۱۴]

''چاند سے خطاب''، نظم میں شاعرہ مسعود بیگم آدا چاند سے مخاطب ہو کر اس پر اپنے دلی جذبات آشکار کرتی ہیں۔ پُر نور چاند کا بادلوں کی اوٹ سے ہنس ہنس کے دیکھنا شاعرہ کو کسی بچے کا ستانا لگتا ہے۔ شاعرہ اپنا دکھ درد چاند پر ظاہر نہیں کرنا چاہتیں۔ چاند دیکھ کر انہیں وہ خوبصورت چہرے یاد آنے لگتے ہیں جن کی یاد اب انہیں تڑپاتی ہے اور جن کے ساتھ انہوں نے چاندنی راتیں گزاری تھیں۔ چاند کا بادلوں کی اوٹ میں چھپ جانا شاعرہ کو اس بات کا غماز نظر آتا ہے کہ چاند بھی شاعرہ کے رنج و غم کی تاب نہ لا کر پس منظر سے ہٹ گیا:

جس طرح پردے میں چھپ کر ہو گیا محفوظ تو
اِس طرح دل میں آدا کے رنج و غم مشہور ہے [۱۵]

نظم ''تاروں بھری رات'' میں آغا شاعؔر دہلوی ایک خوبصورت تاروں بھری رات کی منظر کشی کرتے ہیں۔ شاعر اس حسین رات کو جانِ حسن، ملائکِ فریب، گوہری نقاب، افشاں، موتی، چراغ، گلہائے یاسمین اور لیلیٰ شب کے استعاروں سے مزین کرتے ہیں۔ شاعر خالقِ کائنات کی تعریف میں رطب اللسان ہے کہ وہ اپنی اس کائنات کو کس کس خوبصورت انداز سے سجاتا ہے:

کیا کیا سجا رہا ہے وہ اپنے مکان کو
شاعؔر وہ رنگ دیتا ہے کیا کیا جہان کو [16]

صفیہ شمیؔم ملیح آبادی نے نظم ''بارش کے مہینے'' میں برسات کے خوبصورت موسم کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ اس خوب صورت موسم میں ہر شخص اپنے دکھ درد بھول کر مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ مخمور ہوائیں، کوئل کی کوکو، طیور کے ترانے، پھولوں کی شوخیاں، آنکھوں کے چھلکتے ساغر ہر ذی روح پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتے ہیں:

شاخیں ہیں کہ نازک یہ لچکتی ہوئی باہیں   یہ پھول ہیں یا چرخ پہ چمکے ہوئے تارے
کیوں کر نہ مری روح پہ ہو وجد سا طاری   یہ نغمۂ جاں بخش، شمیؔم اور یہ نظارے [17]

کافی بیگم صاحبہ ناموؔس آروی نظم ''آیا ہے ماہِ ساون'' میں ساون کے موسم کی خوبصورت تصویر کشی کرتی ہیں۔ ساون کے مہینے میں الہڑ دوشیزائیں باغوں میں جھولا جھولتی، پکوان تیار کرتی اور اس موسم کے حسن سے لطف اٹھاتی ہیں۔ ساون کے موسم نے صحرا کو گلشن اور وادی کو چمن میں تبدیل کر دیا ہے۔ کوئل کی کوک، مور کا رقص اور بلبل کے گیت موسم کی دلکشی کو چار چاند لگا رہے ہیں، اور یہ سب ساون کی کرامات ہیں:

انبار اِک خوشی کا ناموؔس کے ہے دل پر   گلشن میں بلبلوں سے یہ نغمہ ہائے سن کر
آیا ہے ماہِ ساون، آیا ہے ماہِ ساون [18]

اختر جہاں بیگم اختؔر نظم ''باغ کی بہار'' میں بہار کے دل کش موسم کی بدولت باغ میں رونما ہونے والی تبدیلی کو بیان کر رہی ہیں۔ خزاں کے موسم میں خزاں رسیدہ پتوں اور اداسی نے ہر سمت ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ بہار آتے ہی ہر چیز کھل اٹھی ہے۔ شاعرہ کو باغ کی ہر شے میں خالقِ کائنات کا جلوہ نظر آتا ہے:

ہر اک ذرّہ میں تو مجھ کو نظر آیا بیاباں کے　　　خدایا تیرا جلوہ ہے ہر اک شے میں گلستاں کی [19]

نظم ''مالن سے'' میں صفیہ بیگم شمیم ملیح آبادی چمن کی شاہزادی، جنگلوں کی تاجدار، بے نیازِ ناز ونخوت، بے خبر، بھولی بھالی، خوش خرام، گیت گنگناتی اور خوش ادا مالن سے مخاطب ہیں۔ شاعرہ باغ، گلشن اور دشت رنگین ہونے کا سہرا مالن کے سر باندھتی ہیں۔ بلاشبہ مالن ہی کی شبانہ روز محنت چمن کو خوشنما پھولوں سے سجانے کا موجب بنتی ہے۔ شاعرہ مالن کی مترنم آواز، بجلی کے سے تبسّم اور چشمِ ناز کی تعریف کرتے ہوئے اس سے استفسار کرتی ہیں کہ وہ پھول کس کے ہاروں میں پرونے کے لیے لے کر جارہی ہے؟:

خوش ادا مالن بتائے جا کدھر جاتی ہے تُو
کس کے ہاروں کے لیے یہ پھول لے جاتی ہے تُو [20]

''گرمی کی ایک دوپہر'' نظم میں صفیہ بیگم شمیم ملیح آبادی الفاظ کی صورت میں ایک ایسی دوپہر کا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچتی ہیں جس میں ذرہ ذرہ گرمی کی حدت سے دہک رہا ہوتا ہے۔ پھولوں کے لب پانی کو ترس رہے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے درختوں کو گویا بخار ہو۔ چوپائے، صحرا، گلستان، بیاباں، طیور، سب مایوس، اداس اور پریشان ہیں۔ تنگ و تاریک گلیاں، دیواریں، ہوائیں سب سے شعلے اٹھتے معلوم ہوتے ہیں۔ شاعرہ نے گرمی کی شدت کو آنچ، شعلوں اور موت سے تشبیہ دی ہے۔:

موجِ ہوا سے دوزخ کی آنچ آرہی ہے
اک موت کی اداسی دنیا پہ چھا رہی ہے [21]

نظم ''پس منظر'' میں شاعرہ انور جہاں کہکشاں کی انجمن، محفل سیارگاں، چاند، تاروں اور ہوا کی مدھر بھری راگنی کی دل کش تصویر کھینچتی ہیں۔ تمام مناظرِ فطرت بہتے آبشار، شبنم کے چمکیلے شرار اور پھولوں کی بہار، مل کر بھی شاعرہ کے رنج وغم کو دور نہیں کر سکتے۔ یہ تمام حسین مناظر دکھی اور لاچار دل کے لیے پیغامِ بساط ثابت نہیں ہو سکتے:

ہیں نہاں اِن منظروں میں رنج وغم کی بجلیاں
ہمنشیں یہ کیا کریں گے دُور دُکھ کی آندھیاں [22]

۴.۱۔ اعلیٰ اخلاقی و دینی اقدار کی ترویج پر منظومات

''شمع اور پروانہ'' کے عنوان سے رسالہ تہذیبِ نسواں کی مدیرہ مسز ممتاز علی صاحبہ نے ماہنامہ عصمت میں نظم بھیجی۔ یہ نظم پہلے مخزن میں شائع ہو چکی تھی لیکن اس خیال سے عصمت شائع کی گئی کہ عصمت کے جو قارئین مخزن کو نہیں پڑھتے وہ اس نظم سے حظ اٹھا سکیں۔ نظم ''شمع اور پروانہ'' میں بہت خوبصورت مکالماتی انداز میں پروانے اور مکھی کی گفتگو کو منظوم طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ پروانہ، شمع کے حسن سے مسحور ہو کر اس پر جان فدا کرتا ہے لیکن ایک مکھی کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے اور وہ پروانے کو اس سے بدگمان کرتی ہے کہ شمع کی تپش ہر چیز کو جلا دیتی ہے۔ لیکن پروانہ اس بات پر یقین نہیں کرتا اور خود کو شمع کے قریب لے جاتا ہے اور بالآخر مر جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعرہ ہٹ دھرمی اختیار کرنے کو باعث نقصان قرار دیتی ہیں۔

شمع سوزاں ایک محفل میں تھی ایسی جل رہی   ہر طرف پھیلی تھی جس کی جگمگاتی روشنی
دیکھتا تھا اِک پتنگا شوق سے اس کی بہار   دل ہی دل میں کر رہا تھا جاں وہ اس پر نثار
پتنگے کس پہ شیدا کس پہ دیوانہ ہے تو؟   شمع سوزاں ہے یہ غافل جس کا پروانہ ہے تو
جلا دے گی تجھے گر پاس اس کے جائے گا   جل کے مر جائے گا ناداں دیکھ تو پچھتائے گا
جوں ہی پہنچا پاس اس کے جل گئے سب اس کے پر   مردہ سا نیچے گرا وہ سوختہ تن آن کر
شمع کے شیدا نے دے دی جاں تڑپ کر خاک پر   شمع بھی رویا کی نادانی پہ اس کی رات بھر

مان لو تم ناصح مشفق کا کہنا مان لو
اپنی ہٹ دھرمی سے تم نقصان اپنا مت کرو [۲۳]

نظم ''راستی'' میں شاعرہ بیگم دعا ڈبائیوی سچائی کے جذبے کی شان بیان کرتی ہیں کہ اچھے لوگوں کی پہچان یہی ہے کہ وہ سچائی کی راہ اپناتے ہیں۔ راستی اللہ کو بھی اور اس کی مخلوق کو بھی مرغوب ہے۔ سچ انسان کے سارے عیب چھپا دیتا ہے۔ سچ بولنے والے کی اللہ غیب سے مدد کرتا ہے۔ سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس لیے کبھی بھی راستی کے راستے سے گریز نہیں کرنا چاہیے:

راستی سے منہ نہ موڑا چاہیے
جیتے جی اس کو نہ چھوڑا چاہیے [۲۴]

نظم ''خواتینِ سلف کا رمضان'' میں شاعرہ ام زہرہ ہاشمی بدایونی مسلمان خواتین کو خواتین سلف کی یاد دلاتے ہوئے ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کر رہی ہیں۔ خواتینِ سلف اللہ کے فرائض کی بجا آوری میں کوئی کوتاہی نہ برتتی تھیں۔ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں، بے کسوں کی اعانت کرتیں، بھوکوں کو کھانا کھلاتیں، یتیموں ویسیروں کے سروں پر دستِ شفقت رکھتیں، مسافروں کے قیام کا بندوبست کرتیں، نمود ونمائش سے احتراز کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے چہرے ایمان کی روشنی سے منوّر رہتے۔ شاعرہ دعا گو ہیں کہ طبقۂ نسواں بھی خواتین سلف کی پیروی کرتے ہوئے کامیابی کی راہ پر گامزن ہو:

اے کاش ان کا نقشِ قدم خضرِ راہ ہو

ہوں ہم بھی اُن کی طرح سے اِس رَہ میں تیز گام ۲۵

''مچھر اور شہد کی مکھی'' نظم میں شاعر سید غلام مصطفیٰ ذہیںؔ ایک مچھر اور شہد کی مکھیوں کی منظوم کہانی بیان کرتے ہیں۔ مچھر بھوک سے نڈھال ہو کر شہد کی مکھیوں کے پاس کھانے کی فریاد لے کر جاتا ہے اور انہیں یہ پیشکش کرتا ہے کہ گانا گانے میں اس کا کوئی ہم پلّہ نہیں وہ نہ صرف انہیں گانا سنائے گا بلکہ ان کے بچوں کو بھی گانا سکھا دے گا اس کے عوض صرف اسے کھانا دے دیا جائے۔ شہد کی مکھیاں مچھر کو یہ کہتے ہوئے آئینہ دکھاتی ہیں کہ جو ہنر آپ کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دے اس کو اپنے بچوں کو سکھانے سے ہمیں کیا حاصل ہونا ہے؟ وقت آنے پر ہم اپنے بچوں کو اپنا ہی ہنر سکھائیں گی وہ ہنر کہ جس سے وہ اپنی روزی خود کما سکیں:

جس سے روزی ملے جہاں میں ذہیںؔ

سب کمالوں سے وہ ہنر اچھا ۲۶

نظم ''مساوات'' میں شاعرہ عابدہ بیگم حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت بلال حبشیؓ کا واقعہ منظوم انداز میں پیش کرتی ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ ایک روز حضرت بلالؓ کی سیاہ رنگت پر طنز کرتے ہیں تو حضورؐ انہیں سختی سے ٹوک دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ایسی باتیں جہل کی نشانی ہوتی ہیں۔ آپؓ کو گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ آپ کی باتوں سے دوسروں کی دل آزاری نہ ہو۔ اس پر حضرت عمرؓ زمین پر جھک گئے اور یہ شرط لگائی کہ جب تک حضرت بلالؓ ان کے سر کو ٹھوکر نہ ماریں گے وہ سر اوپر نہیں اٹھائیں گے۔ اس نظم کے ذریعے شاعرہ ہمارے اسلاف کی میراث ''مساوات'' لوگوں کے دلوں میں اجاگر کرتی نظر آتی ہیں:

کچھ خیال بندہ و آقا نہ تھا اسلاف میں
آہ اب ہے، خود پرستی عابدہ احناف میں [۲۷]

''دعوتِ عبادت''، نظم میں صغرا بیگم نے مسلمان خواتین کو نمازِ پنجگانہ کی تلقین کرتے ہوئے اسے خدا اور رسول کی خوش نودی کا ذریعہ بتایا ہے اور نماز کو آخرت میں کام آنے، خالق سے بخشوانے اور جنت میں گھر دلوانے کا سبب قرار دیا ہے:

نمازِ عقبیٰ میں کام آئے، نماز خالق سے بخشوائے
دلائے فردوس میں تمھیں گھر پڑھا کرو تم نماز بہنو [۲۸]

نظم ''صبر و تحمل'' میں شاعر ناصر نذیر فراق دہلوی خواتین کو حضرت ابراہیم ادہم کے منظوم قصے سے صبر و تحمل کا درس دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم ادہم کا غلطی سے ایک شخص کے پاؤں کے اوپر پاؤں آ گیا۔ اس شخص نے آپ کو تھپڑ مار دیا لیکن آپ غصہ ہونے کی بجائے مسکرا کر اپنے رب سے بولے کہ میں تیری رضا میں راضی ہوں اور اپنے نفس کو اپنے کنڑول میں لیا ہوا ہے۔ شاعر بھی خواتین کو اپنے اندر صبر و تحمل اور شکر جیسی اعلیٰ صفات پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے:

تیری رضا کا طالب ہوں میں اپنے نفس پہ غالب ہوں میں
مار پڑے دن رات بلا سے منہ نہ مڑے پر تیری رضا سے [۲۹]

''کیڑا'' بظاہر ایک حقیر سی مخلوق ہے۔ عموماً ہم اسے سرسری دیکھتے ہوئے بے پروائی سے پاؤں تلے روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں لیکن شاعر حضرات اپنی حساسیت کی بنا پر اس کی حالت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ''کیڑا'' کے عنوان سے جانب لالہ بالک رام صاحب شآد نے ایک چھوٹی سی نظم کو انگریزی سے ترجمہ کیا۔

یہ غریب ننھا کیڑا ہے ذرا سا جس کا جیوڑا
تجھے جس نے ہے بنایا ہے اسی کی یہ بھی خلقت
نہ کچل سمجھ کے بے کس اسے جلد چلنے والے
یہ روش نہیں ہے اچھی ہے خلافِ آدمیت

شاعر حضرتِ انسان سے مخاطب ہو کر اسے احترامِ انسانیت کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ غرور انسان کو زیب نہیں دیتا۔ سورج، چاند، ستارے، سبزہ اور ننھے منے کیڑے سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق

ہیں۔انسان کو ان کیڑوں کی جان لینے کا کوئی حق نہیں۔ درحقیقت شاعر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان کو کبھی کوئی ایسی غلطی نہیں کرنی چاہیے جس کا ازالہ نہ ہو سکے۔

کبھی بھول کر بھی ناداں نہ ہو ایسی جاں کا خواہاں
کہ نہ کرسکے اعادہ کبھی جس کا تیری طاقت[۳۰]

''ادب'' کے عنوان سے نظم اکبری بیگم از چنار نے عصمت کی نذر کی۔اکبری بیگم نے زمانے میں انسان کے ممتاز اور شریف المخلوق ہونے کو ادب کا شاخسانہ قرار دیا ہے۔لوگوں کے دلوں پر راج کرنے کے لیے بہترین نسخہ ادب کرنا ہے۔مسلمان قوم ادب کے میدان میں کسی زمانے میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔لیکن اب ادب کے معاملے میں مسلمان مفلسی کا شکار ہیں۔ ہر شخص کے نزدیک ادب مختلف مفاہیم رکھتا ہے کوئی ادب کو تعظیم سے تعبیر کرتا ہے اور کوئی ادب کو تعلیم سمجھتا ہے:

کوئی تعظیم سے تعبیر تجھے کرتا ہے کوئی تعلیم سمجھتا ہے عبارت تیری
ہم تو محمود خصائل تجھے لکھتی ہیں اپنی دانست میں آتی ہے یہ حجت تیری[۳۱]

''ادب'' ہی کے عنوان سے ظہور بانو نے بھی نظم لکھی۔اور اپنی خواتین بہنو سے مخاطب ہو کر انہیں ادب کا زیور پہننے کی تلقین کی۔انہوں نے اپنی نظم میں ''ادب'' کو قیمتی ہیرا، لطف الٰہی کا تاج اور بہترین گہنا قرار دیا اور تمام خصائل میں سب سے عمدہ اور تمام اخلاق میں سب سے اعلیٰ خلق ٹھہرایا۔ شاعرہ نے سب کے دلوں پر راج کرنے کا نسخہ ادب اپنانے کو قرار دیا:

ادب سے ملو ساس نندوں سے اپنی رہے رتبہ ملحوظ چھوٹے بڑے کا
یہ ہے نیک نامی کا زینہ جہاں میں بنائے گا تم کو یہ ہر اک کا پیارا[۳۲]

''ادب'' کے عنوان سے نظم جناب اشک بلند شہری صاحب نے بھی عصمت کے قارئین کی نذر کی۔شاعر نے ''ادب'' کو علم اخلاق کی شاہراہ اور آدمیت کا جوہر قرار دیا۔انہوں نے ہر ایک کے سامنے جھکنے اور خاکساری کو ادب قرار دیا اور ادب کو وہ جذبہ قرار دیا جس کی بدولت انسان دشمنوں کے دلوں کو بھی زیر کر لے:

عدو کو اگر پانی پانی کرے مخالف کو کر جائے ششدر ادب
بڑھائے نگاہوں میں توقیر و جاہ کرے دل کو دم میں مسخر ادب[۳۳]

''ایثار فاطمہؓ'' کے عنوان سے نظم میں روحؔ گیاوی صاحب نے خواتین کو حضرت فاطمہؓ کی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔ اور منظوم صورت میں ان کے ایثار کا قصہ بیان کیا کہ حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ ایک وقت کے فاقے کے بعد سب کو کھانا کھانے کو ملا۔ دونوں بھائی کھانا کھا چکے تھے۔ حضرت فاطمہؓ کھانا تناول فرمانے ہی لگی تھیں کہ ان کے دروازے پر ایک سائل نے صدا لگائی کہ اسے دو وقت سے کھانا میسر نہیں ہوا۔ یہ سن کر آپؓ نے کھانا سائل کو بھجوا دیا۔ شاعر حضرت فاطمہؓ کے ایثار کی مثال دیتے ہوئے خواتین کو ان کی تقلید پر اکساتے ہیں اور دل سے ہوسِ جاہ و احتشام نکالنے، مسکین، یتیم، سائل و بیکس کی اعانت کرنے کا کہتے ہیں اور خیرات کرنے کو بزم دہر میں شمعِ نجات قرار دیتے ہیں:

ہر ذی حیات کے لیے جام ممات ہے
خیرات بزم دہر میں شمع نجات ہے [۳۴]

۵.۱۔ اہمیتِ طبقۂ نسواں پر منظومات

نظم ''خاتونِ مشرق'' میں شاعر منظر عباس طبقۂ نسواں کی ہی ایک صورت ''بیوی'' پر اس کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ بلاشبہ شاعر نے ''بیوی'' کی تعریف کر کے اس کا حق ادا کر دیا۔ شاعر نے بیوی کو وفا کی پتلی، حیا کا پیکر، حور، شمع فانوس، گھر کو جنت بنانے والی، برے بھلے وقت کی ساتھی، شوہر کا ہاتھ بٹانے والی، مزاج دان، ادا شناس، رفیقِ شوہر، انیسِ شوہر، امینِ شوہر، امانِ شوہر، بلبلِ چمن، چراغِ روشن، رفیقِ سوز والم، مونس و ہمدم اور رفیقۂ زندگی قرار دیا ہے اور ایسے شوہروں پر رشک کیا ہے جنھیں ایسی بیویاں میسر ہیں:

بجا ہے اس کے لیے تفاخر، مناسب اُس کو ہے ناز منظؔر
''رفیقۂ زندگی'' جہاں میں، جسے ہو اس طرح کی میسّر [۳۵]

نظم ''بیٹی'' میں ام زہرؔہ ہاشمی بدایونی عورت ہی کے ایک روپ ''بیٹی'' کے رتبے پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''بیٹی'' ماں باپ کی آنکھ کا تارا اور بھائی بہنوں کا سہارا ہوتی ہے۔ بیٹیاں بہت اطاعت گزار، باادب اور سلیقہ شعار ہونے کے باعث ماں باپ کے لیے راحت کا ساماں ہوتی ہیں:

وہی بیٹی ہے ان اوصافِ حسنہ کی جو حامل ہو
ہُنر، تہذیب، علم، ایمان ہر جوہر میں کامل ہو [۳۶]

نسوانیت کی دوسری منزل ''بیوی'' کےاوصاف ام زہرہ ہاشمی بدایونی نے یہ بیان کیے ہیں کہ بیوی احکام حق کی پاسدار، مثال نکہت بادِ بہاری، عہدِ وفا کی پاسدار، غمگسار، خاوند کی مطیع، سراپا ضبط وحلم و بردباری اور بھری محفل پر بھاری ہوتی ہے۔ بیوی خوشی، غمی، دکھ، درد ہر قسم کے حالات میں شوہر کا ساتھ دیتی ہے اسی وجہ سے شوہر بیوی کو گھر کے ساتھ ساتھ دل کی ملکہ بھی بناتا ہے:

غرض بیوی وہ ہے سرتاج جس کو تاجِ سر سمجھے
اور اُس کے دم سے رشکِ باغِ جنت اپنا گھر سمجھے [۳۷]

نظم ''عورت'' میں محترمہ صفیہ بیگم قمر صاحبہ صنفِ نازک کی عزت وعظمت کو بیان کرتی ہیں۔ شاعرہ عورت کو تفسیر وفا، عقدہ کشا، راہ نما، آوازِ خدا، بانگ درا، ہم رتبۂ مردانِ خدا، آوازِ دعا اور مظلوم کی آہ سے تعبیر کرتی ہیں اور مردوں کے معاشرے پر واضح کرتی ہیں کہ خواتین کے بغیر نظامِ زندگی کا پہیہ بالکل جام ہے۔ اگر تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھا جائے تو بڑی بڑی مہمات میں خواتین نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ خواتین نے نہ صرف میدانِ کارزار میں اپنا کردار ادا کیا بلکہ ساتھ ساتھ گھریلو امور کی انجام دہی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ شاعرہ نے اس نظم میں خواتین کو بھی ان کی اہمیت کا احساس دلا کر ان کے حوصلے بلند کیے:

قائم ہے میرے دم سے یہ سب شانِ بشر کی — شمشیر بکف رَن میں تو رونق ہوں میں گھر کی
حامی ہوں ہمیشہ سے میں ایجاد و ہنر کی — بے میری حمایت کے مہم کونسی سَر کی
لاریب میں ہم رتبۂ مردانِ خدا ہوں [۳۸]

''ایک کمسن بچی سے خطاب'' نظم میں شاعر محشر عابدی صاحب بیٹیوں کو اللہ کی رحمت اور نعمت کہتے ہوئے ان کے وجود کو گھر کی رونق قرار دیتے ہیں۔ گھر کی زینت، وقعت، رفعت، عظمت، عزت، قیمت سب بیٹیوں کے وجود کی مرہونِ منت ہے۔ بیٹیاں ہمدردی والفت کا مخزن، ماں باپ کی اطاعت کا ستارۂ روشن، حیا اور وفا کا مسکن، صبر وایثار کا چمن ہوتی ہیں۔ تہذیب و اخلاق، حمیت، خودداری، محبت اور غمخواری کی دولت سے بیٹیاں مالا مال ہوتی ہیں۔ شاعر نے حکومت کرنا، موجد علامہ

بننا، وطن کی خاطر جنگ لڑنا، علم وفن سے دامن بھرنا سب خواتین کے لیے ممکن قرار دیا ہے۔ شاعر نے ان لوگوں کی ناسمجھی پر افسوس کا اظہار کیا ہے جو بیٹیوں کی اہمیت سے واقف نہیں اور انہیں اپنے کندھوں کا بار تصور کرتے ہیں:

تیرے دامن میں ہے تہذیب کی زندہ بستی　　　تیرے دامن مین ہے اخلاق کی زندہ ہستی
تیرے دامن میں ہے اوصاف کا دریا جاری　　　تیرے دامن میں ہے ادراک کی دنیا ساری
تیرے دامن میں حمیّت بھی ہے خودداری بھی　　　تیرے دامن میں محبت بھی ہے غمخواری بھی
تیری ہستی میں جہاں بھر کی ہے دولت نہاں [۳۹]

''چپ کی داد'' حالؔی کی شہرۂ آفاق نظم بھی عصمت کی زینت بنی۔ اس نظم میں مولانا الطاف حسین حالؔی نے بطور ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے خواتین کے کردار کو سراہا۔ حالؔی نے خواتین کو دنیا کی زینت، قوموں کی عزت، گھر کی شہزادیاں، دکھ سکھ میں راحت، ویرانے میں چمن، جینے کی حلاوت، گھر کی دولت، خاوند کی مونس اور فرزند کی غمخوار قرار دیا:

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو دنیا کی زینت تم سے ہے　　　ملکوں کی بستی ہو تمھی قوموں کی عزت تم سے ہے [۴۰]

''پیاری بہنو'' کے عنوان سے منشی درگا سہائے صاحب سرور جہاں آبادی نے عصمت کے پہلے پرچے کے لیے خاص طور پر نظم لکھ کر بھیجی۔ اس نظم میں انہوں نے خواتین کی عزت وعظمت کا اعتراف کیا۔ بحیثیت ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور بہو کے خواتین کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس نظم میں شاعر نے مردوں کی طرف سے خواتین کی تعریف اور حوصلہ افزائی کا حق ادا کر دیا۔

ہر اک دُکھ کا مداوا تمھی ہو　　　تمھی چارہ گر ہو، مسیحا تمھی ہو
مصیبت میں بپتا میں کام آنے والی　　　شریکِ غم و رنج دنیا تمھی ہو
نہ ہو تم، تو تاریک ہے بزم ہستی　　　اندھیرے گھروں کا اجالا تمھی ہو
مجسم ہو تصویر تم نیکیوں کی　　　حیا اور عصمت کا گہنا تمھی ہو
مصیبت کی کٹتی ہیں گھڑیاں تمھی سے　　　کہ جینے کا دکھ میں سہارا تمھی ہو
جو غمخوار ہو تم، تو غم بھی ہے شادی　　　شبِ غم میں صبحِ تمنا تمھی ہو [۴۱]

خلیق برہان پوری نظم ''خواتینِ ہند سے'' میں خواتین کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ وہ اس وطن

کے لیے کتنی اہمیت کی حامل ہیں، ہندوستان کی آزادی کا انحصار خواتین پر ہے۔ خواتین پر زمانہ بجا طور پر فخر کرتا ہے کیوں کہ انہوں نے تاریخ میں ناقابلِ فراموش کارنامے سرانجام دیے۔ طبقۂ نسواں کی بہادر ماؤں نے وہ سپوت پیدا کیے تھے جن کے نام سے بھی دشمن لرزتے تھے، جو علم وفن کے امین تھے، جو حقیقی معنوں میں ملک وملت کے پاسباں اور خدمت گار تھے۔ شاعر خواتین سے تقاضا کرتا ہے کہ آج جب وطن غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے انہیں اپنا جذبۂ وطنیت دکھا کر ہندوستان کو جنت بنانا ہوگا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں اپنی اولاد کو درسِ اخوت پڑھانا ہوگا۔ دلوں کے جمود کو توڑ کر جذبات کو ابھارنا ہوگا، امید کا جذبہ جگا کر یاس کو بھگانا ہوگا اور یہ سب طبقۂ نسواں ہی کے بس کا کام ہے:

کردو بلند نام خواتین ہند کا
اٹھو کہ اب ہے کام خواتینِ ہند کا [۴۲]

خورشید آرا بیگم (منشی فاضل) نظم ''عورت'' میں اہمیتِ تخلیق نسواں پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ تخلیق کا سلسلہ ازل سے جاری تھا، زندگی رواں دواں تھی لیکن نغمات سوز وگداز سے، سحر صباحت سے، گل رنگ و بو سے، فطرتِ صہبا خمار وکیف سے، بہارِ شام رنگینیٔ ساماں سے، عشق جنوں سے، فرقت بیقراری سے، وفا وعزم ذوقِ استواری سے، دوشیزگی حیا و تقدیس سے اور شاعری وجدانیت سے سراسر عاری تھی۔ فطرت نے اشیاء کے اس جمود کو محسوس کرتے ہوئے شباب، حسن ورعنائی، وفا وعزم و تقویٰ اور تبسم کی لطافت کو یکجا کر کے ایک حسین پیکر تراشا، جو مجسم جذبہ خودداری وشرم و وفا تھا اور اس پیکر کا نام اس نے ''عورت'' رکھا:

کیا عفت کو شامل اور بنایا اک حسین پیکر　　جو یکسر شعر و نغمہ تھا سراپا سوزش الفت
مجسم جذبۂ خودداری و شرم و وفا پرور　　پھر اُس کا نام اے خورشید فطرت نے رکھا ''عورت'' [۴۳]

نظم ''خواتینِ ہند'' میں شاعر تلوک چند محروم خواتین ہند کی صفات و اطوار کی تعریف میں رقمطراز ہیں۔ شاعر خواتینِ ہند کو فروغِ بزم حیا، مخزنِ اوصاف، خجستہ سیرت، فرخ نہاد، خوش اطوار، وفا پرست، صفا کیش اور پیکرِ ایثار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ صورتِ زیبا کے باوجود مشرقی خواتین فخر وناز، نمود ونمائش، ادا فروشی اور چنچل پن سے کوسوں دور ہیں۔ ان کے دل حسد، کینے، دشمنی سے پاک ہیں۔

یتیموں، فقیروں کی یہ دادرسی کرتی ہیں۔ امیر خواتین رعونت سے دور اور غریب شکوہ شکایت سے دور ہیں۔ ہر مصیبت کے آگے یہ ڈھال بن کر کھڑی رہتی ہیں۔ قصرِ محبت کی بنیاد انھی کے دم سے سے قائم ہے۔ شاعر اپنے رب سے دعا گو ہے کہ مشرقی خواتین یوں ہی اپنی روایات کی پاسدار بنی رہیں:

اثر نہ ان پہ ہو یارب ہوائے مغرب کا
نہ ہو وطن میں زوالِ فروغِ شمعِ حیا! [۴۴]

نظم ''عورت'' میں شاعر انور جہاں سراج خواتین کی صفات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ تخلیقِ وجودِ زن سے گلوں میں بہار اور چمن میں رنگ و بو پیدا ہوئی۔ دنیا کو ایثار و ہمدردی، آئینِ وفاداری، گلوں کو عصمت و پاکیزگی اور کلیوں کو خودداری کا سبق ''عورت'' نے دیا۔ کہیں خدیجہؓ بن کر ایثار اور کہیں زہراؓ بن کر صبر و فقر سے عالم کو روشناس کرایا۔ کہیں صدیقہؓ بن کر اپنے علم سے دنیا کو محو حیرت کر دیا اور کہیں زینبؓ جیسی جانثاری دکھا کر ششدر کر دیا۔ کہیں رابعہؒ جیسا زہد اور کہیں رضیہ جیسی بہادری دکھائی۔ کہیں نور جہاں بن کر عنانِ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی۔ غرض عورت ہر روپ میں ہر رنگ میں بے مثل اور یکتا ثابت ہوئی:

غرض ہر روپ میں ہر رنگ میں بے مثل یکتا ہوں
نہیں حاجت بیاں کی خود سمجھ لو کون ہوں، کیا ہوں [۴۵]

۶.۱۔ اصلاح وتربیتِ نسواں پر منظومات

عصمت کے قارئین میں اخلاقی اوصاف اجاگر کرنے کے لیے اہلیہ محمد حسن خان حیدرآباد دکن نے ''اخلاقی غزل'' کے عنوان سے نظم لکھی۔ شاعرہ نے انسانیت کے کچھ معیار بتائے کہ انسان یا خود کسی کا ہو جائے یا کسی کو اپنا بنا لے اور سیم و زر اور لعل و گہر جمع کرنے کی بجائے ہر ایک کے دل میں گھر کرنا سیکھے۔ اپنے عیبوں سے چھٹکارا پانے کا آسان طریقہ ہر وقت اپنا کڑا احتساب کرنا اور اپنی خطاؤں پر نظر رکھنا ہے۔ انسان کسی کو دھوکا نہ دے، اپنا دل صاف رکھے، غصہ سے دور رہے، حلم کو اپنائے تو ساری دنیا اس کے گیت گائے گی:

طریق ایثار کا آسان نہیں مشکل یہ جادہ ہے   قدم رکھے وہی اِس میں جو پتھر کا جگر رکھے

زمانہ میں سدا تیغِ حوادث چلتی رہتی ہے   قضا سے کیا خطر اس کو رضا کی جو سپر رکھے [۴۶]

''نیک و بد'' کے عنوان سے سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ نے نظم لکھی۔ اس نظم میں انہوں نے نیک اور بد خواتین کا موازنہ کرتے ہوئے ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ نیک سیرت عورت کو شاعر نے حورعین قرار دیا اور اس کے شوہر کے لیے دنیا کو ہی فردوسِ بریں ٹھہرایا۔ اس کے برعکس حور طلعت، مہ جبیں لیکن بدخلق عورت کے شوہر کے لیے دنیا دوزخ کی مانند قرار دی۔ نیک عورت کو شاعر نے وفا کوش، شوہر کی مطیع، مادرِ مہرباں کہا جبکہ شیطانِ لعین کو بدخو عورت کا مداح قرار دیا اور اپنے شوہر کے لیے اسے باعث مفلسی، نادار، حزیں، مضمحل اور مغموم ٹھہرایا:

نیک ہو عورت تو سب لوگ اس کی کرتے ہیں ثنا   تذکرہ جب اقربا میں اس کا ہوتا ہے کہیں
سب زنِ بدخلق کی ذم کرتے ہیں رہتے ہیں ذہینؔ   ہے مگر مدّاح اس عورت کا شیطانِ لعیں [۴۷]

''حقوق شوہر'' کے عنوان سے نظم زہرہ اختر بیگم الوری نے عصمت کی نذر کی۔ اس نظا [illegible] میں انھوں نے خواتین کی تربیت کے لیے ایک ماں بیٹی کا قصہ منظوم صورت میں پیش کیا ہے۔ جوان بیٹی کے مرنے کے بعد ماں اسے خواب میں جہنم کے عذاب میں مبتلا دیکھتی ہے۔ ناک اور منہ سے خون کا دریا بہہ رہا ہوتا ہے۔ پاؤں میں آگ کی بیڑیاں ہوتی ہیں۔ ماں ان تمام سزاؤں کی وجۂ تسمیہ دریافت کرتی ہے تو بیٹی ماں کو بتاتی ہے کہ اسے اپنے خاوند کے راز غیروں کو بتانے، خاوند کا مال بے دریغ لٹانے، اغیار کے بچوں کو دودھ پلانے، خاوند کو خاطر میں نہ لانے، اسے کوسنے دینے، اس سے گستاخی کرنے کا پھل ملا ہے۔ پھر بیٹی گڑگڑا کر ماں سے التجا کرتی ہے کہ وہ حضورﷺ سے اس کی جاں بخشی کی درخواست کریں۔ اس منظوم قصے کا مقصد خواتین کو شوہر کے حقوق باور کرنا مقصود تھا:

بن پوچھے نکل جانے کی رسوائی ہے اماں   بیڑی میرے پیروں میں جو پہنائی ہے اماں
بے اذن کے یوں دودھ پلانے کا یہ پھل ہے   سرتاج کو خاطر میں نہ لانے کا یہ پھل ہے [۴۸]

مسز انعام الحق نے نظم ''شوہر کے موہنے کا منتر'' میں خواتین کو اپنے شوہروں کو دام میں کرنے کا منتر بتایا ہے۔ یہ نظم ریحان، اس کے شوہر اور اس کی بھابی عائشہ کا منظوم قصہ ہے۔ ریحان اور اس کے شوہر میں جھگڑا رہتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کو مٹھی میں کرنا چاہتی ہے۔ جب کہ اس کا شوہر مرد ہونے کی بنا پر خود کو بیوی سے اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے۔ ریحان اپنی بھابی عائشہ اور بھائی کا مثالی پیار دیکھ کر

بہت متاثر ہوتی ہے اور اپنی بھابی سے بھائی کو رام کرنے کا طریقہ پوچھتی ہے۔ اس طریقے پر عمل کرنے کا عہد لے کر عائشہ ریحان کو سمجھاتی ہے کہ اگر تمھیں شوہر کو مطیع کرنے کی خواہش ہے تو پہلے خود اس کی اطاعت گزار اور فرمانبردار بنو، وہ خود بخود تمھارا مطیع ہو جائے گا:

موہنی منتر یہ ریحان گوش دل سے تم سنو　　گر مطیع کرنا ہو شوہر کو، مطیع اس کی بنو
اس طرح ریحان نے آخر موہ لیا شوہر کا دل　　یہ وہ منتر ہے کہ جس سے موم ہو پتھر کا دل [۴۹]

عصمت کے اجرا کا مقصد خواتین کی تربیت و اصلاح اور ان میں شعور اجاگر کرنا تھا۔ اسی مقصد کو شاعری میں بھی پیش نظر رکھا گیا اور منظوم قصوں کے ذریعے انہیں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق دیا گیا۔ نظم ''میٹھا بول'' میں بھی مسز انعام الحق نے بہت خوبصورت منظر کشی کرتے ہوئے ایک منظوم قصہ بیان کیا کہ شام کے وقت کچھ لڑکیاں اردگرد سے بے پرواہ اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھیں کہ اچانک ایک دلکش آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ آواز مثل لحن داؤدی تھی۔ آواز کی سمت دیکھنے پر انہیں ایک سیاہ، بدنما، بدرُو پرندہ نظر آیا جس کی شیریں زبانی نے انہیں بے خود کر دیا تھا۔ انہوں نے اس پرندے کو قید کر لیا۔ لڑکیوں کی ماں نے جب سارا ماجرا سنا تو انہیں اس پرندے سے سبق سیکھنے کا کہا کہ باوجود یہ کہ وہ پرندہ بہت بدنما ہے لیکن اس نے اپنے میٹھے بولوں سے سب کو گرویدہ کر لیا۔ اس طرح انسان کی شکل و صورت بھی خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی میٹھی زباں سے وہ ساری دنیا کے دلوں پر راج کر سکتا ہے:

بڑھ کے سب اوصاف سے ہے اس جہاں میں میٹھا بول　　یہ وہ گوہر ہے کہ دنیا میں نہیں ہے اس کا مول
ہوں بہت کچھ شکل میں گو مرد یا عورت کے عیب　　ہو زباں میٹھی تو چھپ جاتے ہیں سب صورت کے عیب [۵۰]

''نیک بیوی''، نظم میں شاعر سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ صاحب ایک اچھی اور نیک طینت بیوی کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ شاعر نیک بیوی کو حورِ عین، لعل و گہر، پھول، قمر، مونسِ خلوت قرار دیتے ہیں اور میاں بیوی کے رشتے میں الفت اور اتحاد کو گھر کی شادمانی کا ذریعہ ٹھہراتے ہیں:

چاہیے آپس میں الفت، اتحاد
اس طرح دونوں رہیں گے گھر میں شاد [۵۱]

۷.۱۔ شعورِ پامالیِ حقوقِ نسواں پر منظومات

سیّد محمود حسن کیتھل نظم ''عورت'' میں عورت کو آسمانی بہار، خالق کا اچھوتا شاہکار، رفیق

زندگی، شریک غم، پیکرِ شرم وحیا اور عفت وعصمت کی دیوی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ شاعر مردوں کی عقل پر ماتم کرتے ہیں جنھوں نے خواتین کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیا۔ انہیں وہ عزت، وہ وقعت نہیں دی جس کی وہ مستحق تھیں۔ بلکہ خواتین کو بوجھ سمجھ کر، عقل سے پیدل کہہ کر خود ان کی نظروں میں قابلِ رحم بنا دیا۔ شاعر خواتین کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ برے حالات میں بھی اللہ کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ایک دن آئے گا کہ علم وعمل کے میدان میں خواتین بھی آگے بڑھیں گی اور پورے عالم پر راج کریں گی:

جستجو جنّت کی ہوگی تیرے پاؤں کے تلے سر جھکا دے گا تری تقدیس کے آگے جہاں
زینتِ اوراق ہستی ہوگی تیری داستاں عالمِ اسباب میں ہوگا ترا سکّہ رواں[۵۲]

محمود اسرائیلی نے نظم ''داستانِ جفا'' میں مردوں سے مخاطب ہو کر انہیں شرم دلائی ہے کہ وہ کب تک صنف نازک جیسی بے زبان مخلوق پر کبھی بھائی، کبھی بیٹے، کبھی باپ اور کبھی شوہر کے روپ میں ظلم ڈھاتا رہیں گے۔ آخر ایک دن مردوں نے بھی خدا کو منہ دکھانا ہے۔ اسلام میں عورت کا بھی جائداد میں حصہ رکھا گیا ہے جسے یہ ہوس کا پجاری ہڑپ کر جاتا ہے۔ اللہ نے شوہر کو بیوی کے ناز نخرے اٹھانے کے لیے تخلیق کیا تھا۔ مگر بیچاری بیوی دانے دانے کو ترستی ہے۔ اس پر خرچ کرنا شوہر کو گوارا ہی نہیں۔ شاعر مردوں سے استفسار کرتا ہے کہ تم لوگوں کے سینوں میں بھی دل ہے؟ تمھیں وفا کا مطلب بھی پتا ہے؟ تم لوگوں کی خواتین پر ظلم وستم کی کوئی انتہا بھی ہے؟ آخر میں شاعر کہتے ہیں کہ مظلوم کا حامی خدا ہے وہ ضرور طبقۂ نسواں کے ساتھ انصاف کرے گا:

تری بیوی، بنا تھا تو ہی جس کے ناز اٹھانے کو ترستی ہے تری غفلت سے، وہ اب دانے دانے کو
نہیں ہیں صاف کپڑے بھی اب اس کا تن چھپانے کو یہی اک بے زباں باقی تھی اب تیرے ستانے کو
مگر پھر بھی ہے تو معصوم، کیا الٹا زمانہ ہے [۵۳]

محوی صدیقی لکھنوی نظم ''پامالی حقوق'' میں طبقہ نسواں کی حالت پر ماتم کناں ہیں۔ اس بے زبان طبقے کی فسردہ زندگی خود اپنی زبان سے اپنی حالت بیان کر رہی ہے۔ اس طبقے میں مائیں، بہنیں، بیٹیاں سب زندگی سے تنگ ہیں اور یہ مردوں کے ظلم وجور کا نتیجہ ہے۔ انہیں اس ظلم وستم کے نتیجے میں لبوں پر حرفِ شکوہ لانے کی بھی اجازت نہیں۔ شاعر مردوں سے شکوہ کناں ہیں کہ یہ دولت و مال، جاہ

وحشمت سب کو زوال آنا ہے، ادھر جو آفتیں نازل ہو رہی ہیں وہ اس مظلوم طبقے کے صبر کا وبال ہیں۔ شاعر مردوں کو خبردار کر رہے ہیں کہ میٹھی میٹھی باتوں کے جال میں پھنسا کر طبقۂ نسواں کے حقوق غصب کرنا قہر خداوندی کو دعوت دے گا۔ شاعر مردوں کو تلقین کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے خواتین کو جو حقوق عطا کیے ہیں ان کے ماننے میں انہیں حیل و حجت سے کام نہیں لینا چاہیے۔

وہ جو چپ ہے یہ نہ جان اس کے دل کو غم نہیں　　اک زبان شکوہ آج اس کا بال بال ہے
دل میں درد، لب پہ آہ، اشک آنکھ سے رواں　　درد آج زرد ہے، نرگس آج لال ہے
مائیں ، بہنیں، بیٹیاں سب ہلاک جور ہیں
محوِ حزیںؔ یہ رنگ دیکھ کر نڈھال ہے[۵۴]

نظم ''دخترِ ہند'' میں صفیہ بیگم شمیم دختران ہند کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ دختران ہند بیکس، مجبور، چیتھڑوں سے جسم ڈھانپے ایک ایسی لڑکی کی مانند ہیں جس کی پیشانی سوچ میں ڈوبی ہوئی، بال گردوغبار سے اٹے ہوئے، دل میں قیامت برپا ہو، اس کی آنکھ سے اشک بہہ رہے ہوں اور نازک ہاتھ بھیک کے لیے پھیلے ہوئے ہوں۔ یہ وہ دختران ہیں جو کبھی ہند کی شہزادیاں تھیں لیکن اب ان کی حالتِ زار ہر دردمند دل کو تڑپا دیتی ہے:

کیا بیاں ہو حالتِ ''ہندستاں''　　قلب میں طاقت نہ منھ میں ہے زباں
خاک کردیں گی چمن کی پتّیاں
بیکسوں کی ''آہ'' کی چنگاریاں[۵۵]

شاعر محمد ہادی عزیز لکھنوی نظم ''عقد بیوہ'' میں خواتین کے استحصال کو نشانہ بناتے ہیں کہ اسلام نے مرد و خواتین کو یکساں حقوق دیے ہیں لیکن بیوی کے مرنے کے بعد مرد تو شادی کر لیتے ہیں لیکن عورت ہمیشہ کے لیے بیوگی کی چادر اوڑھ کر زندگی کی ساری خوشیاں خود پر حرام کر لیتی ہے۔ شوہر کی لاش پر چوڑیاں توڑ دینا، ہمیشہ کے لیے سفید لباس زیب تن کرنا، زندگی کی رنگینیوں اور رعنائیوں سے منہ موڑ لینا یہ سب فضولیات معاشرے نے اس پر لاگو کر دی ہیں، اسلام ایسی کوئی پابندی بیوہ خواتین پر نہیں لگاتا بلکہ انہیں عقدِ ثانی کا مشورہ دیتا ہے۔ شاعر طبقۂ نسواں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ انہیں خود اپنی صنف کو ان بے رجا رسوم و رواج کی پابندیوں سے آزاد کرانا ہوگا اور معاشرے کی

لعنت وملامت کی پروا کیے بغیر اپنے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے فرمان پر عمل پیرا ہونا ہوگا تا کہ روزِ قیامت وہ بیواؤں کے سلسلے میں اللہ کے سامنے شرمندہ نہ ہوں:

اس میں کیا سبکی ہے، کیا تذلیل ہے   یہ خدا کے حکم کی تعمیل ہے
اپنے پیغمبر کا کہنا مانیے   لوم لائم کی نہ پروا کیجیے [۵۶]

نظم ''خاتونِ مشرق سے'' میں ثاقب کانپوری خواتینِ مشرق کی حالتِ زار پر ترحم بھری نظر ڈالتے ہیں کہ جہالت کی بنا پر خواتین کو حیوان کی مانند سمجھا جاتا ہے۔ ہر طرف اسے ذلیل وخوار کیا جاتا ہے۔ شاعر خواتین کو کہتے ہیں کہ وہ صنف قوی کا سہارا لینا چھوڑ دیں، ان سے امیدیں وابستہ نہ کریں بلکہ اپنے زورِ بازو پر خود کو اس قابلِ رحم حالت سے باہر نکالیں:

پھر مٹا دے اپنی پیشانی سے ذلّت کا یہ داغ
پھر جلے محفل میں تیری علم وحکمت کا چراغ [۵۷]

۸.۱۔ شعورِ بیداریٔ نسواں پر منظومات

شاعر محمود اسرائیلی نظم ''خواتینِ سلف'' میں طبقۂ نسواں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ماضی کے دریچوں کی سیر کراتے ہیں۔ شاعر خواتینِ سلف کو دنیا کی حوریں، چرخِ عصمت کے ستارے کہہ کر پکارتے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ ہندستان کی وہ مایہ ناز خواتین جو اپنے تدبر کی بنا پر بادشاہوں کو آئین جہاں بانی سکھاتی تھیں، جن کی نگاہوں میں مروت اور دلوں میں الفت کی فراوانی ہوتی تھی، جو میدان جنگ میں شیرِ نر بن کر اترتی تھیں اور محفلوں میں مریم ثانی بن کر جلوہ گر ہوتی تھیں، آج طبقۂ نسواں ایسی خواتین سے محروم نظر آتا ہے۔ اب جہاں آرا، گلبدن بیگم اور چاند بی بی جیسی با کمال ہستیاں خواتین میں مفقود نظر آتی ہیں۔ شاعر دعا گو ہے کہ طبقۂ نسواں خود پر طاری جمود کی کیفیت سے باہر نکل آئے اور خواتین سلف جیسے کارہائے نمایاں سرانجام دے کر دنیا میں اپنا نام روشن کرے۔

کوئی بھی آہ اب باقی نہیں اس اُجڑے گلشن میں
نہ کلیاں خاک ہونے کو ملی تھیں خاکِ مدفن میں [۵۸]

آنسہ خورشید اقبال حیا میرٹھی نظم ''خواتین ملت سے'' میں خواتین کو وطن کی عزت، عظمت اور شوکت قرار دیتی ہیں اور ان سے استدعا کرتی ہیں کہ وفا کی یہ شہزادیاں اور محبت کی یہ دیویاں اب اپنی

فطرت تبدیل کر کے وطن کی پجاری بن جائیں اور وطن کو آزاد کرانے میں اپنے مردوں کا ساتھ دیں۔ جہالت کی لعنت مٹا کر علم کے مدفن خزانے تلاش کریں اور اخوت کو اپنا کر آزادی کی منزل کی جانب رواں دواں ہوں:

وہ کیا دو قدم پر ہے ساحل نظر آ رہی ہے وہ منزل
سجی ہے وہ قوموں کی محفل
کرو تو ذرا سعی و ہمت
خواتین ملت !! ۵۹

نظم ''حالتِ نسواں'' میں شاعرہ خورشید آرا بیگم طبقۂ نسواں کی حالتِ زار پر ماتم کناں ہیں۔ خواتین ازل سے جمود کی سی کیفیت خود پر طاری کیے کولھو کے بیل کی طرح زندگی گزار رہی تھیں۔ شاعرہ کے نزدیک مروّجہ علوم سے یہ غفلت خواتین کا جہاں سے نام ونشان ختم کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔ دیگر اقوام میں خواتین علم و ہنر کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہی ہیں اور ہندُستانی خواتین جہالت کے اندھیروں سے باہر نکلنے پر آمادہ ہی نہیں۔ شاعرہ خواتین کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے جدید علوم سے استفادہ کرنے کا درس دے رہی ہیں تاکہ وہ بھی زمانے میں سر اٹھا کر جی سکیں:

بہ چرخِ اقوام بدرِ کامل، ضیائے علم و ہنر ہو حاصل ہو راہ سے دور سنگِ حائل، دعا لبوں پر یہ آ رہی ہے
مکیف بادۂ ترقی، ہوں خازن گنج ہائے علمی
ہوں نازشِ دہر و فخرِ ہستی، یہ دل میں خورشید آ رہی ہے ۶۰

نظم ''پیاری بہنوں سے'' میں شاعرہ بلقیس جمال بریلوی بہت خوب صورت منظر کشی کرتے ہوئے خواتین کو نئی صبح کی نوید دے رہی ہیں۔ اس نئی فضا میں ترقی اور تمدن کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ تمام اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ شاعرہ اولادِ آدم کی ترقی سے خواتین کو سبق حاصل کرنے کا کہہ رہی ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور مشرقی خواتین بچوں کے جھگڑوں اور شوہروں کے طعنوں و تشنیعوں میں گھری ہوئی ہیں۔ بیٹوں کو لاڈ پیار دے کر ایسا بگاڑتی ہیں کہ وہی بیٹے بڑے ہو کر آنکھیں دکھاتے، کھانا اٹھا کر ماں کے منہ پر پھینکتے ہیں۔ کہیں باپ کے مد مقابل ہیں، کہیں ماں کو جاہل کہہ رہے ہیں اور کہیں بیویوں پر عتاب نازل ہو رہا ہے۔ یہ نسل آدم کی بجائے حیوان معلوم ہوتے ہیں اور

یہ سب کا سب ان کی ماؤں کی پرورش کا نتیجہ ہے۔ جہالت کی بنا پر خواتین بیٹے اور بیٹی کی تربیت میں فرق روا رکھتی ہیں جس کے نتیجے میں ایسے مرد سامنے آتے ہیں جن کی نظروں میں عورت ہر رشتے میں حقیر ہوتی ہے۔ شاعرہ خواتین کو ان کی غفلت کا احساس دلا کر انہیں تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہیں:

ذرا ہمتیں اپنی مضبوط کیجیے بہت راہِ منزل میں اٹکے ہیں روڑے
ہے ہمت سلامت تو ہوں لاکھ خطرے قطع ہو ہی جائیں گے دشوار رستے [۶۱]

''تعلیم کے فوائد'' نظم سید عنایت حسین امداد عظیم آبادی از پٹنہ نے خواتین میں تعلیمی شعور، بیداری و آگہی پیدا کرنے کے لیے لکھی۔ اس نظم میں انہوں نے ''جہالت'' کو خواتین کی تباہی اور ہر مصیبت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اور خواتین کے جاہل ہونے میں خواتین اور مردوں دونوں کو برابر کا قصوروار قرار دیا۔ شاعر نے تعلیم کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر جاہل ہونے کے باوجود خواتین اتنی خوبیوں کی مالک ہیں تو تعلیم کا حصول تو ان کی مخفی صلاحیتوں کو چار چاند لگا دے گا۔ مردوں کے حقوق، خواتین کے حقوق، قانونِ شریعت، حفظانِ صحت کے اصول، کفایت شعاری، ترکِ رسومات، پابندیِ وقت، تربیتِ اولاد غرض یہ کہ وہ تمام امور جن کی وجہ سے خواتین خانگی زندگی میں مشکلات اٹھاتی ہیں۔ تعلیم کی بدولت انہی امور کی بجا آوری ان کے لیے سہل ہو جائے گی:

ہزاروں ایسی رسمیں ہیں کہ جن سے کچھ نہیں حاصل مگر مشکل ہے ان کا ترک مجبوری قدامت کی
کوئی تقریب کا سامان جو تم کو پیش آتا ہے نہیں پھر خیریت آتی نظر مال و معیشت کی [۶۲]

''کتابیں'' کے عنوان سے نظم میں حامد حسن قادری بدایونی نے کتابوں جیسی بیش بہا دولت کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ شاعر نے کتابوں کو انسان کے لیے نورِ نظر، باعث قرار قلب و جگر، بے ضرر، انسان کا رہنما و راہبر، علم و ہنر کا گنجینہ، تہذیب و ادب کا آئینہ، حکمت و ہنر کا مخزن، گلہائے علم و فن کا گلشن، توحید و معرفت کی دکان، گنجِ نہاں، دین کی ہادی، دنیا کی رہنما، ہمدم، ہم نشیں، حکمت کی آرسی اور دنیا کی نعمتوں کا ماحصل قرار دیا:

حامدؔ کے دل سے پوچھے انسان قدر ان کی جو کچھ کہو بجا ہیں یہ اُس سے بھی سوا ہیں
کیا کیا دقیق عقدے کرتی ہیں حل کتابیں دنیا کی نعمتوں کا ہیں ماحصل کتابیں [۶۳]

گوہر اقبال حورؔ نظم ''خواہرانِ خفتہ کو پیامِ بیداری'' میں انہیں نیند کے نشے سے بیدار ہو کر

منزل کی تلاش میں نکلنے کا کہہ رہی ہیں۔شاعرہ طبقۂ نسواں کو اپنی قابلِ رحم حالت کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے سرزنش کرتی ہیں کہ ہر چیز کا دوش قسمت کو دینا مناسب نہیں۔خواتین کو کم ہمتی و پست خیالی کو مٹا کر زمانے سے ٹکر لے کر آگے بڑھنا ہوگا ورنہ زمانہ انہیں اپنے قدموں تلے روند کر آگے بڑھ جائے گا اور اس وقت کفِ افسوس ملنے کے سوا خواتین کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوگا:

پروا نہ کرو اور قدم آگے بڑھاؤ
کم ہمتی و پست خیالی کو مٹاؤ
دیتا نہیں گر ساتھ کوئی، غم نہ کرو تم
تنہا بھی اگر چاہو، تو کچھ کر ہی دکھاؤ
ہونے دو اگر سارا زمانہ بھی خفا ہو[۶۴]

آغا شاعر قزلباش نظم ''خواتین ہند سے'' میں خواتین سے سوال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کا دھیان کس جانب ہے؟ کیا وہ اودھ، بہار، سندھ، پنجاب، شادرہ، اڑیسہ، سی پی، دکن اور بنگال کے حالت سے واقف ہیں؟ کیا اپنے گھروں کی دنیا سے نکل کر انھوں نے باہر کی دنیا کی سیر کی ہے؟ دنیا میں ہزاروں لوگ میٹرک، سیکڑوں بی اے، بہت سے ایم اے اور بہت سے پی ایچ ڈی ہیں مگر ہماری خواتین ابھی تک الف ب سے آگے نہیں بڑھیں۔مغربی خواتین علم حاصل کر کے وکیل، ڈاکٹر، جج، بیرسٹر، ادیب، شاعر اور مدیر کے عہدوں پر فائز ہوگئیں مگر خواتین ہند صدیوں سے گھریلو مسائل سے ہی نبرد آزما ہیں۔اور جب قوم کا ایک بڑا حصہ ہی مفلوج اور جاہل ہو تو قوم ترقی کے مدارج کیا خاک طے کرے گی؟

تمہارے یہی وطیرے جہاں تہاں ہونگے — تم ہی بتاؤ مسلمان پھر کہاں ہونگے؟
ہم اپنے حال پہ رو رو کے جان دیں شاعؔر — کہ ایک حصہ ہے مفلوج کیا کریں شاعؔر[۶۵]

آنسہ خورشید اقبال حیاؔ نظم ''مسلمان خاتون سے'' میں خواتین پر ان کی اہمیت اجاگر کرتی ہیں۔شاعرہ کہتی ہیں کہ خواتین اپنی عظمت و رفعت کو بھول بیٹھی ہیں۔انہیں تباہی کی کوئی فکر نہیں اور نہ اس بات کی کہ وطن پر تیرگی کے سائے منڈلا رہے ہیں۔شاعرہ خواتین کو بے حسی کا اور کسل مندی کا خول اتار کر امید کا دامن تھام کر رفعت و بقا کی جانب قدم بڑھانے کا کہتی ہیں۔شاعرہ کہتی ہیں علم کی شمع

روشن کرنا، کل جہاں کو روشن کرنا، وطن کو غلامی کے اندھیروں سے نکالنا خواتین کی بھی ذمے داری ہے اور انہیں اس ذمے داری سے منہ موڑ نا زیب نہیں دیتا۔

مِٹا، تو اب تو یہ کیفِ سکونِ خواب مِٹا! پکارتی ہے تجھے رفعت و بقا سُن لے
تو اپنی روح کو خود زندگی سے چونکا دے جو تجھ سے قوم کو ہے آج وہ گلا سُن لے
وطن کے ذرّوں کو پھر کردے نور سے روشن
پھر اپنی بزم ہو شمعِ سرور سے روشن[٦٦]

خورشید آرا بیگم نظم ''اے محترم خواتین'' میں علم اور جہل کا موازنہ کرتے ہوئے خواتین کو حصول علم کی طرف مائل کرتی ہیں۔ شاعرہ تاریخ سے مہر النساء، حولہ، زیب النساء اور عفیفہ جیسی نابغہ روزگار خواتین کی مثالیں دیتی ہیں کہ انہیں علم میں اتنا کمال حاصل تھا کہ مردوں نے ان سے فیض پایا جب کہ آج کی خواتین نہ صرف ناواقف شریعت ہیں بلکہ جہل کی بنا پر نماز روزہ سے بھی بیگانہ ہیں۔ شاعرہ تعلیم کو دین و دنیا کی متاع قرار دیتی ہیں:

ارکان مذہبی سے ہم بنجر ہیں حسرت!! آوارۂ ضلالت، ناواقفِ شریعت
آزردۂ مسرت، ظلمت کشِ جہالت
بیگانۂ نماز و روزہ ہیں وائے غفلت!
اے محترم خواتین[٦٧]

نظم ''نوائے بیداری'' میں خورشید آرا بیگم خواتین ہند کی حالت پر خون کے آنسو روتی ہیں کہ کس طرح طبقہ اناث ہند تمدن و عمل سے دور جہالت کی رسومات میں خود کو قید کیے ہوئے ہیں۔ احساس ذلت سے عاری، ناواقفِ رازِ ترقی خواب غفلت میں پڑی ہیں۔ شاعرہ خواتین کو عمل پر ابھارتے ہوئے کہتی ہیں کہ خواتین کی ترقی اور تعلیم میں ہی قوم کی بہتری مضمر ہے:

مساعی میں تمھاری بہتریٔ قوم ہے پنہاں
کرو یہ زندگی خورشید صرف خدمتِ نسواں[٦٨]

نظم ''محترم مہینوں سے'' میں شاعرہ نواب قمر جہاں بیگم صاحبہ نے لکھنؤ کے سنّی شیعہ فساد سے متاثر ہو کر خواتین کو اپنا کردار ادا کرنے کے لیے کہا ہے۔ اسلام غیروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا

ہے، قوم پر مصیبت کی گھڑی آئی ہے۔ ایک عرصے سے مسلمان سنی شیعہ کی یہ جنگ لڑ رہے ہیں، اب خواتین کو میدان عمل میں آ کر اس مسئلے کا حل نکالنا ہوگا۔ خواتین کو بحیثیت ماں، بہن، بیٹی کے اپنے مردوں کو سمجھانا ہوگا کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، سب کو متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ مذہب اسلام کینہ، حسد، عداوت، تعصب نہیں سکھاتا، یہ روش چھوڑ کر ہمیں خلق پیمبری کو اپنانا ہوگا:

دشمن سے اپنے کیونکر پیش آئے تھے پیمبرؐ — خُلقِ پیمبری کی ہم کو جھلک دکھاؤ

بس اتحاد کر لو اک دل ہو، اک زباں ہو — سب اختلاف اپنے اک دم سے بھول جاؤ [۶۹]

نوشابہ خاتون قریشی نے ''درسِ عمل'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے خواتین کو جمود و غفلت کا پردہ چاک کر کے میدانِ عمل میں آنے کی دعوت دی ہے۔ شاعرہ نے خواتین کے سامنے مغربی خواتین کی مثالیں پیش کی ہیں کہ وہ بھی اپنے گھر کا انتظام خود سنبھالتی ہیں۔ مگر خودداری اور خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ علم کی شوقین ہیں، اس میدان میں مردوں سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ صحرا، دریا، سمندر سب انہوں نے پار کر ڈالے، فضاؤں کو مسخر کر ڈالا، علم کی بدولت مغربی خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ اس کے برعکس ہندستانی خواتین کی وجہ سے ملت کا نصف حصہ عضو معطل کی سی زندگی بسر کر رہا ہے، ہندستانی قوم کیسے ترقی کر سکتی ہے۔ جب اس میں سے حضرت خولہؓ جیسی شجاعت، نور جہاں کی ہمت، زیب النساء کی عظمت اور چاند بی کی جرأت مفقود ہو گئی ہے، اس قوم میں رستم کیسے پیدا ہوں جب مائیں ہی بزدلی کا سبق دیں۔ شاعرہ دین حسین کی پاسداری کرتے ہوئے طبقۂ نسواں کو حصول علم و عمل پر ابھارتی ہیں:

حاصل ہو آپ کو بھی علم و ہنر کی دولت — طبقہ سے دور اپنے ہو کلفتِ جہالت

یورپ کی بیبیوں سے لیں درسِ جوش ہمت — ہاں مطلعِ وطن سے چھٹ جائے ابرِ ظلمت

فیشن پسندیوں کی تقلید ناروا ہے

بے باکیوں کی بے شک تمہید ناروا ہے [۷۰]

گوہر اقبال حور زبیری نظم ''نوائے عمل'' میں عصمتی بہنوں کو جاگنے کا درس دے رہی ہیں۔ شاعرہ کا کہنا ہے کہ سارا زمانہ جاگ کر اپنے اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اس مردہ قوم کی جان، جینے

کا سامان اور شان طبقۂ نسواں کے دم سے ہے۔ عہدِ غلامی موت سے بدتر ہے۔ ساری رکاوٹیں اور مشکلات عبور کر کے خواتین کو آزادی کا زیور پہننا ہوگا۔ قوم کی آنکھیں ان کی راہ تک رہی ہیں۔ قوم کی ساری امیدیں خواتین سے وابستہ ہیں۔ اس لیے خواتین کو جاگ کر میدانِ عمل میں آنا ہوگا اور اپنے وطن کو آزاد کرانا ہوگا:

ہم سے بندھی ہیں ساری امیدیں ہم پہ لگی ہیں قوم کی آنکھیں
بھارت کو آزاد کرادیں مل کے جو ہم میدان میں نکلیں
جاگو، جاگو، بہنو جاگو [۱]

خورشید آرا بیگم نظم ''خواتین بنگال سے'' میں بنگال کی مسلمان خواتین سے مخاطب ہو کر ان پر شیرِ بنگال مولوی فضلِ حق کی اہمیت واضح کرتی ہیں کہ تم بنگال میں اس لیے چین کی نیند سو رہی ہو کیوں کہ تمہیں مولوی فضلِ حق جیسا بہادر لیڈر اور راہنما ملا ہے۔ جبکہ ملک کے دوسرے حصوں میں مسلمان ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ شاعرہ کہتی ہیں کہ اب خواتین کے سونے کا وقت نہیں ہے بلکہ انہیں خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر علامہ اقبالؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، اور محمد علی جناحؒ کا ساتھ دینا ہوگا۔ اب آپس کے لڑائی جھگڑوں کو چھوڑ کر ایک ملک کے حصول کے لیے متحد ہونے کا وقت ہے اور اس اتحاد کے حصول کے لیے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونا ہوگا:

لیگ کے چشمہ سے بہنو دل کے سوتے جوڑ دو
حوصلے غیروں کے تم ہمت سے اپنی توڑ دو [۲]

عاصیہ رابعہ پنہاں نظم ''صنف نازک سے'' میں خواتین کو انکی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس دلاتی ہیں۔ شاعرہ مختلف تشبیہات و استعارات سے صنفِ نازک کو مخاطب کرتی ہیں۔ خواتین کے اوصاف تسلیم و رضا، تحمل، ضبط اور وفا شعاری کی بنا پر انھیں نور جہاں، کشورستان، شاہ شہاں کہہ کر پکارتی ہیں۔ اور اس بات پر افسوس کا اظہار کرتی ہیں کہ اتنی خوبیوں سے متصف خواتین عالم اسلام کو درپیش مسائل کے حوالے سے کیوں منظر عام پر نہیں آرہیں۔ آج جب ملت گوناگوں مسائل کا شکار ہے۔ خواتین کو اپنا کردار ان مسائل کے حل کے لیے ضرور ادا کرنا ہوگا:

کب تک یہ بے نیازی کب تک رہے گی غفلت | مدہوشِ خواب کب تک، کب تک خمارِ فرصت
اے مرکزِ وفا ہے یہ وقتِ شوقِ ہمت | چشم حجاب ریزاں سے دیکھ حالِ ملّت
ہاں چونکہ بے ہشی سے پھر کھول سرِّ دانش
اے نصف بہتر آیا ہنگام سعی و کوشش[۴۳]

نظم ''صنف نازک سے'' میں شاعر کیف مرادآبادی طبقۂ نسواں کو استعارۂ بہار مجسم، وجود لطیف کہہ کر ان سے استفسار کرتے ہیں کہ ان کے خیال اور ارادے کی طاقت اور پختگی کہاں گئی؟ انہوں نے اپنی قوتیں کیوں ضعیف کر دی ہیں؟ قوم کے لیے ان کا وجود کیوں بے معنی اور بے بود قطرے کی مانند ہے۔ خواتین ملکی حالات سے کیوں بے خبر ہیں؟ کوئی راہ کوئی منزل مقصود کیوں انہوں نے اپنے لیے متعین نہیں کی؟ شاعر خواتین کو قوم کے ساتھ شریک عمل ہونے کا درس دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ شرم وحجاب کا پردہ اور اپنی نسوانیت کا بھرم برقرار رکھنے کا بھی کہتے ہیں:

تو اپنی رفعت وعظمت کو خاک میں نہ ملا | تو اپنے عالمِ امکاں کو یوں نہ کر محدود
تو بن شریکِ عمل قوم کی وگرنہ کہیں | نہ تیری قوم پہ ہوجائے بار تیرا وجود[۴۴]

۹.۱۔ ممتا کی دیوی ''ماں'' پر منظومات

''تربیت اولاد میں عورتوں کا فرض''، تلوک چند محرومؔ کی ایک خوب صورت طویل نظم ہے۔ جس میں کئی منظوم قصوں کے ذریعے خواتین کو تربیت اولاد میں ان کی کوتاہیوں کا احساس دلایا گیا ہے۔ گندگی اور جھوٹ کی بدولت بچے کو سکول میں سزا ملتی ہے مگر وہ اسے اپنا نہیں اپنی ماں کا قصور مانتا ہے کہ ماں نے کبھی اسے ان دونوں کاموں سے منع کیوں نہیں کیا؟ ایک محرر رشوت لینے کے جرم میں معطل ہو گیا۔ ماں کی ہمدردی جتانے پر اسے ہی قصوروار ٹھہرایا کہ ماں نے اسے کیوں دیانت داری کا درس نہیں دیا؟ اسی طرح سزائے موت کا منتظر ایک قیدی بھی اپنی ماں سے شکوہ کناں ہے کہ ماں نے اسے غصے پر قابو پانا کیوں نہ سکھایا ورنہ آج موت اس کا استقبال نہ کر رہی ہوتی۔ ان تینوں الزامات کے نتیجے میں ماں رورو کر اپنے بچوں کو یقین دلاتی ہے کہ وہ تو صرف چکی، چولھا، کپڑے دھونا، اپلے تھاپنا اور چرخہ کاتنا اپنا کام سمجھتی تھی۔ تربیتِ اولاد پر تو کبھی اس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ شاعر خواتین میں یہ شعور

بیدار کرنا چاہتا ہے کہ پڑھ لکھ کر وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کر کے انہیں معاشرے کا ایک ذمہ دار اور کارآمد شہری بنا سکتی ہیں:

ان کو سچ کہنا سکھائے اور سکھائے ضبطِ نفس　　آدمی حیواں ہے نیکی سے نہیں گر ربطِ نفس!
جسم اور دل اور زباں کو صاف رکھنا بھی سکھائے　　جسم کی، دل کی، زباں کی ہر برائی سے بچائے
عورتیں ہوں اس وصیّت پر عمل پیرا اگر　　قید خانے ملک کے ویراں ہوں اور آباد گھر

اس نصیحت سے نہ چوکیں مادرانِ نیک ذات
قوم کی اس میں بھلائی، ملک کی اس میں نجات ۵ے

''بچّہ کا پہلا مکتب ماں کی گود ہے'' نظم میں شاعر اندر جیت شرما استاد اور ماں دونوں کے لیے حصولِ علم ضروری قرار دیتے ہیں۔ شاعر کے نزدیک ایک ماں اخلاق، تہذیب اور تقدیس کا پیکر ہو۔ بغض و حسد اور غصہ کے منفی جذبات اس کے قریب بھی نہ آنے پائیں۔ الفت و محبت کی خوگر ہو، عفت و عصمت کی دیوی، صورت و سیرت میں پارسا ہو۔ لڑائی جھگڑے، خوف و ہراس سے دور صرف بہادری اور امید کا دامن تھامے ہو۔ ایسی ہی ماں کی گود میں تربیت پانے والے بچے دنیا میں ان کا نام روشن کریں گے:

استاد کے لیے ہے جس علم کی ضرورت　　ماں کے بھی دل کا روشن اس نور سے دیا ہو
پُتلی وہ خُلق کی ہو، تادیب کی ہو پیکر　　چہرے سے اس کے ظاہر تقدیس کی ضیا ہو ۶ے

''ماں'' (نسوانیت کی آخری منزل) کے عنوان سے نظم میں اُم زہرا ہاشمی بدایونی معاشرے میں ماں کی اہمیت، وقعت اور قدر و منزلت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ بلاشبہ ماں دن رات، صبح و شام خود سے بے خبر ہو کر بچوں کی تکالیف دور کرنے میں لگی رہتی ہے۔ ایمان اور دولتِ اسلام ماں کے کرم سے ملتی ہے۔ ماں کے دل اور آنکھوں سے اپنے بچوں کے لیے ہر وقت محبت جھلکتی رہتی ہے۔ ماں گھر کے لیے سایۂ رحمت، سراپاءِ رحمت و انعام ہوتی ہے۔ ماں کے فیضِ تربیت سے ہی انسان دین و دنیا میں بخیر انجام پاتا ہے:

غرض وہ ''ماں'' ہے جو اُس قوم کی بنیاد رکھتی ہے
یہ دنیا کارنامے جس کے صدیوں یاد رکھتی ہے ۷ے

''بچے کے آسمان'' نامی نظم خواجہ دل محمد صاحب ایم اے نے خواتین کی ممتا کے اعتراف میں

لکھی۔اس نظم میں انہوں نے ''نیلے آسماں'' کو اماں کے پیارے نینوں کے لیے استعارۃً استعمال کیا ہے۔ایک بچے کی زندگی میں ماں کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ماں کی مسکراہٹ، اس کی لوری کی صدائیں بلاشبہ بچے کے دل کا چین ہوتی ہیں:

یہ اسکی پیاری اماں وہ اِس کا نورِ عین!
بچے کے آسماں ہیں اماں کے پیارے نین![۷۸]

''اے کاش میں ماں ہوتی''،نظم میں شاعر ڈاکٹر سعید احمد نے ممتا جیسے انمول اور اعلیٰ و ارفع جذبے کی تصویر کشی منظوم انداز میں کی ہے۔ایک ماں کے لیے اس کا بچہ دنیا کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔کبھی وہ اسے چینی کا کھلونا،کبھی بالشتی اور کبھی بونا کہہ کر پکارتی ہے۔ بچے کی کٹورا سی آنکھیں، پھول سے گال،ریشم جیسے بال،ہنسنے کی ادا اور آنکھوں سے ہویدا محبت خود بخود ایک ماں کے دل کو گداز کر دیتی ہے۔ایک عورت کی دنیا بلاشبہ اس کے بچے ہوتے ہیں۔شاعر نے کسی بھی عورت کی گود خالی نہ ہونے کی دعا کرتے ہوئے تمنا کی ہے کہ کاش وہ بھی ایک ماں ہوتا:

اِس دِل میں محبت کی اِک آگ نہاں ہوتی!
اے کاش میں ماں ہوتی!اے کاش میں ماں ہوتی![۷۹]

نظم ''آغوشِ مادر'' میں شاعر عنایت حسین عظیم آبادی نے اس نکتے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بچے کی پہلی تربیت گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔اگر ماں سلیقہ مند، پڑھی لکھی اور اوقات کی پابند ہو تو وہ بچے کو زندگی کے ہر قدم پر نیک و بد کا فرق سمجھائے گی۔ ماؤں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بناتی ہیں یا بگاڑتی ہیں اگر ماں ناجائز لاڈ پیار اٹھائے گی،رسمی تقاریب میں فضول خرچی کرے گی تو درحقیقت وہ بچے کو فائدہ نہیں نقصان پہنچائے گی۔شاعر ماؤں سے التجا کر رہے ہیں کہ اپنے بچوں کے روشن مستقبل کے لیے وہ ان کی تربیت پر پورا دھیان دیں:

تربیت میں اپنے بچوں کی بہت کوشاں رہو
ان کے مستقبل کی تم اس وقت سے نگران رہو[۸۰]

۱۰.۱۔ مغربی کورانہ تقلید پرستی پر منظومات

محوی صدیقی لکھنوی نظم ''خاتونِ ہندی سے'' میں مشرقی خواتین کی حالتِ زار پر ماتم کر رہے

ہیں کہ مسلمان پامال ہوئے جا رہے ہیں، غلامی کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالے سر جھکائے کھڑے ہیں اور خواتینِ مشرق کو اپنے مشاغل سے ہی فرصت نہیں۔ وہ اپنے عیش و عشرت میں مگن کپڑے، زیور کے شوق میں پاگل ہوئے جا رہی ہیں۔ شاعر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ جدید مغربی تعلیم نے خواتین کو اخلاق سے عاری اور عیبوں سے پُر کر دیا ہے۔ شاعر خواتین کو خبردار کرتے ہیں کہ یہ مغربی تہذیب صرف دور کا دھوکا ہے۔ شیوۂ مغربی کی نقالی کر کے خواتین اپنی اقدار سے محروم ہو جائیں گی:

ہوئے برباد ہم افسوس اب کیا تیری باری ہے دکھانا چاہتی ہے اور کچھ شاید بداعمالی
اُٹھ اے خاتونِ مشرق! فرض پہچان اپنی ہستی کا خدارا کھول آنکھیں اپنی اے ہندستاں والی [۸۱]

شاعری محوی صدیقی لکھنوی نظم ''شریف بی بی'' میں مشرقی خاتون کو بزم ہستی کی ضیا، شاہدِ شانِ خدا، جانِ پیر و برنا، روکش شاہ و گدا، نسیمِ جاں افزا، مسرت کی فضا، بادِ صبا اور قدرت کی ادا کہہ کر پکارتے ہیں۔ مگر وہ اس بات سے نالاں ہیں کہ مغرب کی تقلید پرستی میں خواتین نے شرم و حیا کا زیور بیچ ڈالا ہے، چراغ خانہ کی بجائے شمعِ محفل بن گئی ہیں۔ وہ مشرقی خواتین پر افسوس کر رہے ہیں کہ تہذیب مغرب کی چکا چوند میں پس کر انھوں نے اپنی مشرقی اقدار فراموش کر دی ہیں:

مگر تہذیبِ مغرب آہ وہ بس بولتی جاتی ہے
کہ تیری مشرقی بیدار فطرت سوتی جاتی ہے [۸۲]

سید محمود حسن نظم ''تعلیم نسواں میں لغزش'' میں مسلمان قوم پر طنز کرتے ہیں کہ پہلے تو انھوں نے خواتین کی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی اور جب دنیا کے ہم قدم ہونے کے لیے تعلیمِ نسواں کا بیڑا اٹھایا تو اس میں بھی مغرب ان سے چال چل گیا۔ انھوں نے اپنی خواتین کو مشنری سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا جہاں قرآن پاک کی بجائے انجیل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اساتذہ کی فیشن ایبل زندگی سے متاثر ہو کر لڑکیاں بھی مغربی تہذیب کی ہوا میں رنگ گئیں۔ مشرق کی سادہ زندگی خواب و خیال ہو کر رہ گئی۔ شاعر مسلمانوں سے سوال کرتا ہے کہ کیا انہیں یہ منظور ہے کہ ان کی لڑکیاں بھی شمع محفل بن جائیں۔ شاعر مغربی کورانہ تقلید کے انجام کو سوچ کر فکر مند ہے اور موجودہ روش کو ترک کر کے خواتین کو اسلام کے اصولوں پر تعلیم دینے کا درس دے رہا ہے:

چھوڑ دینا چاہیے ہم کو یہ موجودہ روش
درس دینا چاہیے اسلام کے اخلاق کا [۸۳]

نظم ''پردہ'' میں مسز محمد یوسف صاحبہ نے پردے کو حجاب خداوندی کہا ہے اور اسلامی تشبیہات کے ذریعے پردے کے تقدس کو سامنے لایا ہے۔ ہر قیمتی چیز خواہ وہ خواتین کی عزت وشرم وحیا ہو یا درّ بے بہا، قیادت ہو یا حسن سیرت، روح ہو یا سزا جزا کا دن، مقبول عمل ہو یا بقائے اصل، موت کا دن ہو یا روز شفا سب کا سب پردے میں ہے:

وہ قیامت تا قیامت جس کے ہیں سب منتظر
اس کا دن از ابتدا تا انتہا پردے میں ہے [۸۴]

''پردہ'' کے عنوان سے نظم میں ذ۔ فتحپوری نے خواتین کی اندھادھند مغربی تقلید پر کڑی تنقید کی ہے اور نوجوانوں سے مخاطب ہو کر انہیں خواتین کو جدید تعلیم دلانے سے منع کیا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ جدید تعلیم اور فیشن کی پروردہ خواتین کا گھر کی چاردیواری میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ بیٹی، بیوی، بہن اور ماں سب مرد کی مطیع نہیں رہیں گی لہٰذا خواتین کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ شرم کا گہنا پہن کر ہمیشہ گھر کی زینت بنی رہیں:

زمانہ کیا پتا دیتا ہے آنکھیں کھول کر دیکھو — نتائج ہوں اگر اچھے تو پھر ہم کو بُرا کہنا
شریفوں کو مناسب ہے سکھائیں لڑکیوں کو یہ — سدا عصمت سے گر رہنا پہن کر شرم کا گہنا [۸۵]

۱۱۔۱۔ ماہنامہ عصمت کی افادیت پر منظومات

امداد عظیم آبادی نظم ''عصمت کے کارنامے'' میں ماہنامہ عصمت کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ جب سے اس ماہنامے نے طبقۂ نسوان کی رہبری کا فریضہ سرانجام دینا شروع کیا ہے ان کے دلوں میں پڑھنے لکھنے کا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔ انھیں بھی اپنی جہالت کھٹکنے لگی اور تعلیم حاصل کرنے کا شعور بیدار ہو گیا۔ عصمت کی بدولت اب شاذ ہی کوئی ایسا گھر نظر آئے گا جہاں کی خواتین تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ عصمت سے قبل یہ حال تھا کہ صنف نازک جہل کا شکار تھیں۔ دو چار خواتین ہی تعلیم یافتہ تھیں، لیکن عصمت نے آتے ہی طبقۂ نسواں میں انقلاب برپا کر دیا، ہر خاتون کے ہاتھ میں کتاب نظر آنے لگی۔ اب پچھتر فیصد خواتین تعلیم یافتہ ہیں اور ان میں سے زیادہ تر اہل قلم ہیں۔

جن کی تحریریں دیکھ کر مرد اہلِ قلم حضرات بھی شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ شاعر نے علامہ راشد الخیری اور رازق الخیری کو محسن طبقۂ نسواں قرار دیا جن کی بدولت آج خواتین اس مقام و مرتبے کو پہنچیں:

علم سے دنیا ملی ان کو خدا بھی مل گیا　　زندگی کرتے ہیں کیوں کر بسر چل گیا اس کا پتا
علم سے آیا جو ان میں جوہرِ انسانیت　　اس سے واقف ہو گئیں کیا ہے ادب اور تربیت [۸۶]

ماہنامہ عصمت کی سالگرہ پر ''نویدِ سالگرہ'' کے عنوان سے نظم میں شاعرہ بلقیس جمالؔ نے عصمت کے لیے بہت سی نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔ شاعرہ نے اس نظم میں بہت خوب صورت منظر کشی کی ہے اور نادر تشبیہات و استعارات کا استعمال کیا ہے۔ علامہ راشد الخیری اور مولانا رازق الخیری کو کامیابی سے یہ سفر جاری رکھنے پر مبارکباد پیش کی ہے۔ اور طبقۂ نسواں کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے:

مبارک راشد و رازق کو پھر صبحِ مسرت ہو　　پیامِ کامرانی یہ نسیمِ فصلِ بہجت ہو
نویدِ فرحتِ نسواں یہ گرہِ سالِ عصمت ہو　　یہ تہنیت پیامِ لذتِ صد عیش و عشرت ہو

خدایا یہ گھڑی پیغامِ صد تسکین و ارماں ہو!
یہ لمحہ باعثِ بیداریٔ دلہائے نسواں ہو! [۸۷]

''سال گرہ عصمت'' کے عنوان سے نظم میں شاعرہ خورشید آرا بیگم نے فارسی اور اردو زبان میں عصمت کے مفید مضامین، نصیحت آمیز منظومات اور وقت پر اشاعت کو سراہا اور خاتون اکرم مرحومہ کی عصمت کے لیے خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا:

خدا کا شکر ہے امسال پرچہ خوب تر نکلا　　زود ہائے مضامین مثلِ بحرِ پُر گہر نکلا
نصیحت خیز نظموں سے مزیّن وقت پر نکلا　　کمالِ فن لیے تصویر گر کا خوش نظر نکلا

رہا ممتاز درجہ اب کے عصمت کا رسائل میں
سبق آموز مضمونوں میں کارآمد مسائل ہیں [۸۸]

''نغمۂ عصمت''، نظم میں شاعرہ بلقیس جمال بریلوی نے ماہنامہ عصمت کی طبقۂ نسواں کے لیے خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ بلاشبہ عصمت نے خواتین کو شرابِ ہوش پلا کر غفلت کی نیند سے بیدار کیا۔ خواتین کی کسمپرسی اور حالتِ زار سے قوم کو آگاہ کر کے ان کی بہبود کا سامان کیا۔ اس راہ

میں اگرچہ عصمت کو بہت تکالیف سہنا پڑیں لیکن اس کے پایۂ استقلال میں کبھی لغزش نہ آئی۔

مرے ہمراہ آ کر کچھ جہاں میں کام آ کر   آجہاں میں انقلابِ تازہ کا ہنگام کر
روشنی سے پھر منوّر ظلمتِ ایّام کر   زندہ میں دوبارہ اپنا مردہ نام کر[۸۹]

۱۲.۱۔ خاتونِ اکرم (مرحومہ) پر منظومات

خاتون اکرم علامہ راشد الخیری کی بہو اور مولانا رازق الخیری کی اہلیہ محترمہ تھیں۔ خاتونِ اکرم کی وفات سب کے لیے ایک جانکاہ صدمے سے کم نہ تھی۔ ان کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے خورشید آرا بیگم نے نظم ''خاتون اکرم مرحومہ'' لکھی۔ یہ نظم مسدس ہیئت میں لکھی گئی۔ اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے الفاظ استعمال کیے گئے۔ اس نظم میں شاعرہ نے نہ صرف ان کی شخصیت کے اوصاف سامنے لائے بلکہ ان کی تحریروں کی خوبیاں بھی بیان کیں اور ان کی جواں مرگ موت کو کبھی پُر نہ ہونے والا خلا قرار دیا:

موجبِ فخر خواتین تھی ذاتِ خاتون   نکہتِ گُل سے بھی پاکیزہ صفات خاتون
بہر مالائق تقلید حیاتِ خاتوں   قابل رشک ہے لاریب مماتِ خاتون[۹۰]

خاتونِ اکرم کو ہی خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے عابدہ بیگم نے نظم ''آہ خاتون'' لکھی۔ یہ نظم بھی اردو اور فارسی الفاظ پر مشتمل ہے۔ شاعرہ نے خاتون اکرم مرحومہ کو علامہ راشد الخیری کے باغ کی رونق اور جناب رازق الخیری کی بزم کی زینت قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی کہ ان کو بنت رسول ﷺ کے پاس جگہ نصیب ہو:

جائے خاتون نزدِ بنتِ رسول
باد یارب کن این دُعا تو قبول![۹۱]

''تا ابد حاصل ہے تجھکو زندگی دائمی'' کے عنوان سے مسدس ہیئت میں نظم خورشید آرا بیگم نے لکھی اور خاتونِ اکرم کی وفات سے اردو ادب اور عصمت میں پیدا ہو جانے والے خلا کا ذکر کیا۔ شاعرہ نے اردو اور فارسی کی مشکل تشبیہات و استعارات سے مزین اس نظم میں مرحومہ خاتون اکرم کو آسمانِ ہند کا تابندہ ستارہ، گلشنِ نسواں کی بلبل اور ساقیٔ محفل ٹھہرایا اور ان کے مضامین اور افسانوں کو زندۂ جاوید قرار دیا:

خامہ اش جادو طراز طبع جدت زائے بود
نطق معنی آفرین فکرش سخن پیرائے بود[۹۲]

''خاتون اکرم کی خدمت میں''، نظم میں بلقیس جمال خاتون نے مرحومہ خاتونِ اکرم کو حسن شرافت، سرمایۂ راحت، افسانۂ عصمت، کاشانۂ حکمت، شمع سرِ محفل، موجِ لبِ ساحل، تسکینِ غمِ دل، مرہم ملت، جوہر عصمت، حورنسائیت، نورنسائیت، معمورنسائیت، راہبرنسواں اور تاجِ سرِ نسواں قرار دیا:

تو روح محبت تھی سرچشمۂ الفت تھی
تو مرہم ملت تھی تو جوہر عصمت تھی
تو شمع درخشاں تھی اس بزمِ پریشاں میں
سرمایۂ تسکیں تھی اِس گردشِ دوراں میں[۹۳]

عصمت کی معروف شاعرہ محترمہ رابعہ پنہاں صاحبہ نے نظم ''یادِ خاتون'' میں خاتونِ اکرم مرحومہ کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ ان کی یہ نظم مسدس ہیئت میں اور فارسی زبان میں ہے۔ انھوں نے خاتونِ اکرم کو مرجع علم وعمل، مخزنِ فہم وندرت، مرکزِ رحم والفت، کوکب برجِ شرافت، شاہدِ نازِ ادب، غنچۂ صدق وصفا قرار دیتے ہوئے باغِ رضوان میں مکین ہونے کی دعا دی:

آشیانِ تو بہ آن گلشنِ جنت بادا! جائے عالیِ تو در رفعت رحمت بادا!
عالمِ نورِ جنان مخزنِ راحت بادا! ہستیت درچمن خلد چو نکہت بادا!
قرب خاتونِ جناں بخش بہ باغِ رضواں
بشنو اے ربِ سماوات دُعائے پنہاں[۹۴]

''جامِ فنا''، نظم میں عبدالخالق خلیق دہلوی دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی چیز کو دوام حاصل نہیں ہے۔ ہر چیز نے ایک نہ ایک دن فنا ہو جانا ہے۔ لیکن ناگہانی موت کا زخم کبھی نہیں بھرتا۔ محترمہ خاتونِ اکرم مرحومہ بھی عین عالمِ جوانی میں اچانک داغ مفارقت دے گئیں اور ان کی وجہ سے ''عصمت'' میں پیدا ہونے والا خلا کبھی پُر نہیں ہو سکا:

زمانے سے مزا جاتا رہا مضمون نگاری کا
کہ باغِ علم میں جھونکا نہیں بادِ بہاری کا [۹۵]

''نومبر کی ایک صبح'' کے عنوان سے نظم میں تلوک چند محروم نے نومبر کی اس جاں گسل صبح کی منظر کشی کی ہے جس صبح خاتونِ اکرم قیدِ حیات سے آزاد ہوکر موت کی آغوش میں جا سوئیں۔ شاعر نے خاتونِ اکرم کی وفات کے سانحے پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے:

حیرت میں آج تک ہوں کہ کیوں زندہ رہ گیا
کس درجہ سخت جاں تھا کہ یہ صدمہ سہہ گیا [۹۶]

۱۳.۱۔ وصالِ علامہ راشد الخیری پر منظومات

بادشاہ نثر، مصوّرِ غم علامہ راشد الخیریؒ کی وفات پر نہ صرف طبقۂ نسواں ماتم کناں تھا بلکہ دنیائے ادب سے وابستہ ہر شخص غمگین و رنجیدہ تھا۔ خلیل الرحمٰن دانش دہلوی نے ان کی یاد میں نظم ''نسواں کے حقوق کے حامی! کہاں ہے تُو؟'' لکھی۔ شاعر نے علامہ راشد الخیری کو باغِ ادب کا باغباں قرار دیا جس کی غیر موجودگی میں پھولوں کی پتیاں ہر سمت بکھر گئیں، بلبل کی نغمہ سنجی نہ رہی، کوئل کی کوک درد سے بھری ہے، ہر درخت پر اداسی چھائی ہے۔ علامہ کی وفات پر زبانِ اردو نوحہ خواں ہے۔ شاعر علامہ کی ذات کی صفات بیان کرتے ہوئے ان کے بلند درجات کی دعا کرتا ہے:

شمعیں ہوں نور کی تری تربت پر جلوہ گر
ہو رحمتِ خدا تری تربت پہ ضوفشاں [۹۷]

رابعہ پنہاںؔ نظم ''اشکِ حسرت'' میں حضرت علامہ راشد الخیریؒ کی وفات پر اپنے غم کا اظہار کرتی ہیں۔ شاعرہ علامہ کو قوم کا گنجِ گراں، ادیبِ نکتہ سنج و نکتہ داں، خوش کلام و خوش بیاں اور محسنِ اعظم قرار دیتی ہیں اور ان کی وفات کو دنیائے ادب میں کبھی نہ پُر ہونے والا خلا قرار دیتی ہیں۔ شاعرہ کہتی ہیں کہ علامہ نے طبقۂ نسواں کو روشنی دکھائی، اپنی زندگی ان کے حقوق کی بحالی کے لیے وقف کر دی، اس راہ میں بہت سی تکالیف بھی برداشت کیں لیکن ان کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ آئی:

روح پر بارانِ رحمت کی بہار — حشر تک ہوتی رہے تسکین بار
ان کی تربت نور سے پُر نور ہو — اور سکوں دائمی ہو روح ہو
تاابد بادیدۂ خوننا بہ بار — قوم اس غم میں رہے گی سوگوار [۹۸]

نظم ''قطراتِ لہو'' میں تیمور جہاں بیگم حجابؔ دہلوی علامہ کی موت کے سانحے کو مال و منال

زندگی لٹنے سے تعبیر کرتی ہیں اوران کی موت کے غم کوتا ابدتازہ رہنے والاغم قرار دیتی ہیں۔شاعرہ علامہ کی وفات پران کے بیٹے علامہ رازق الخیری کی حالتِ زار بیان کرتی ہیں کہ ان کووالد کی وفات پر ایک پل بھی چین نہیں مل رہا، وہ جاں گسل صدمے کو برداشت نہیں کر پا رہے:

کیوں نہ تر آٹھوں پہر اشکوں سے ہو یہ آستیں
لاکھ کرتے صبر ہیں پر صبر آتا نہیں[99]

نظم ''سوزِ الم'' میں آمنہ خاتون عفتؔ علامہ راشد الخیری کی وفات کے بعد فضائے ادب پر چھا جانے والی وحشت ناک خاموشی کو بیان کرتی ہیں۔وہ افسوس کا اظہار کرتی ہیں کہ کاش آپؒ کچھ اور زندہ رہ لیتے اور طبقۂ نسواں کی ترقی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔وہ چمن جس کو خونِ دل سے آپ نے سینچا تھا اس چمن کی رنگین بہار کو آپ دیکھ لیتے مگر افسوس کہ فرشتۂ اجل آپؒ کو ہمیشہ کے لیے اس جہانِ فانی سے لے گیا:

یہ کہانی طول ہے کس کو سناؤں دردِ دل　　　آتشِ غم قلب کے پردوں میں ہے اُف مشتعل
غیب سے آتی ہے کیا آواز یہ سننا ذرا　　　اس قدر شورِ الم عفتؔ نے کیوں برپا کیا[100]

نظم ''اشکِ حسرت'' میں شاعرہ خورشید اقبال حیاؔ، علامہ راشد الخیری کی برسی کے موقع پر اسی صبح، انہی لمحات کو یاد کر کے ماتم کناں ہیں جن لمحات نے حضرت علامہ راشد الخیری کو عالمِ فنا سے عالمِ بقا میں پہنچا دیا۔بلاشبہ اردو اور طبقہ نسواں کے لیے ان کی خدمات رہتی دنیا تک یاد کی جاتی رہیں گی۔وہ اپنی تحریروں کی صورت میں جاوداں رہیں گے۔

جتنے مضمون ہیں تمہارے، ہیں نقوشِ نوربار　　　جن کو صدیوں بھی مٹا سکتا نہیں یہ آسماں
آج تم ہم میں نہیں ہو، یاد باقی ہے مگر　　　تم کو حاصل ہوگئی ہے اک حیاتِ جاوداں[101]

آغا شاعر قزلباش نظم ''اے بادشاہِ نثر!'' میں علامہ راشد الخیری کی خدمت میں سلام پیش کرتے ہیں اور انھیں ان کے وصال کے بعد صنفِ نازک کے حال سے آگاہ کرتے ہیں کہ وہ علامہ کی موت کے صدمے کو برداشت نہیں کر پا رہیں۔شاعر علامہ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ قدرت سے ایک اور زندگی لے کر وہ دوبارہ دنیا میں آئیں اور طبقۂ نسواں کے مردہ تن میں پھر سے روح پھونک دیں۔شاعر علامہ کو پیغمبرِ ادب اور تاجدارِ وقت کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

کوئی نہ مانے! تجھ سا قلم کار اب نہیں　　　اے تاجدارِ وقت! پیام و سلام لے

شاعر بھی، اب قریب ہے رفت و گذشت کے　　نزدیک ہے زمانہ، نہ پھر اُس کا نام لے [۱۰۲]

شاعرہ گوہر اقبال حوّر نے علامہ راشد الخیری کی وفات کے بعد طبقۂ نسواں کی حالت پر رنجیدہ خاطر ہو کر انہیں ان کا مقصد حیات یاد دلانے کے لیے علامہ کی طرف سے ان کے نام پیغام لکھا۔ نظم ''علامہ راشد الخیری کا پیغام بناتِ ہند کے نام'' میں بہت خوبصورت طویل تمہید باندھتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ شب کی تاریکی میں اچانک میں نے ایک آفتاب بلند ہوتے دیکھا، اس آفتاب کی شعاعوں نے مرے صفحۂ بصارت پر چند باتیں تحریر کیں۔ وہ آفتاب علامہ تھے جنھوں نے خواتین کو قومِ خفتہ کی فردِ غافل کہہ کر جنت سے سلام بھیجا۔ علامہ نے کہا کہ مجھے معلوم ہے میری جدائی سب کے لیے باعثِ غم بنی ہوئی ہے مگر میرے لیے جنت کی دنیا سراسر خوشی کا ساماں ہے۔ علامہ خواتین کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری موت سے میرا علم دنیا سے ختم نہیں ہو گیا۔ تم لوگ باہمی نفاق ختم کر کے دلوں میں محبت پیدا کر کے علم و عمل کے جذبے بڑھاؤ، مذہبی تعلیم حاصل کر کے جہالت کے اندھیرے ختم کرو اور جو راہِ عمل سے لوگ بھٹک گئے ہیں، تم ان کی راہبر بنو:

لکھی تھیں جو صفحۂ بصارت پہ اُس کی کرنوں نے چند باتیں
رہیں گی اک ''نقشِ نور'' بن کر محیطِ دل وہ بلند باتیں [۱۰۳]

۱۴.۱۔ متفرق منظومات

''مصرفِ دولت''، نظم میں ابوالاعجاز ازل نے دولت کو خرچ کرنے کے طریقے بتائے ہیں کہ اگر اللہ نے کسی کو دولت سے نواز رکھا ہے تو اسے غریبوں کا بھی کچھ خیال کرنا چاہیے۔ رنج و مصیبت میں دوسروں کے کام آنا چاہیے۔ کسی بیوہ، یتیم کی مالی امداد کر دے، بھوکے کو کھانا کھلا دے، عزیز رشتہ داروں کی مدد کرے، غریب پڑوسی سے لڑائی جھگڑا کرنے کی بجائے اس کی مالی امداد کر دے۔ ملک و قوم کی بھلائی اور بہتری کے لیے اپنا مال و دولت خرچ کرے تا کہ اللہ کی خوشنودی اسے حاصل ہو:

ازل ہے حدِ نظر فائدہ اگر اپنا
تو رکھ زمیں میں دبا کر نہ مال و زر اپنا [۱۰۴]

''مرغابیاں''، نظم میں جلال ملیح آبادی بچپن کی خوب صورت یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ جب مرغابیوں کی بولی سن کر وہ گھر کے آنگن میں ان کی نقّالی کرتے تھے۔ مرغابیاں پہاڑوں سے قطاروں

کی صورت میں شہر میں آتی تھیں اور سرد ہوائیں اپنے ساتھ لاتی تھیں۔ شاعر اور ان کے دوست جنگلوں میں اور ٹیلوں میں مرغابیوں کی سی آواز نکالتے، ان کی طرح فضا میں باز وکھول کر اڑنے کی کوشش کرتے اور انھی کی طرح باز و موڑ کر راہوں پر مڑتے۔ لیکن اب مرغابیوں کی صدائیں ان کے دل کو غمگین کر دیتی ہیں ان کے ساتھ گزارا ہوا بچپن شاعر کو ان کے دوستوں کی یاد میں اشکبار کر دیتا ہے:

جب ان کے ساتھ کے گزرے زمانے یاد آتے ہیں
ہم اپنے دوستوں کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں[۱۰۵]

نظم ''اے قوم!'' میں خورشید اقبال حیا میرٹھی ہندستانی قوم کی حالت پر افسوس کا اظہار کرتی ہیں کہ آج جو قوم غلامی کے اندھیروں میں گھری ہے، ماضی میں اس کی ہیبت سے آسمان کانپ اٹھتے تھے، بڑے بڑے عالم فاضل اس قوم کی پہچان تھے۔ لیکن آج روح کے گلکدے اور دل کے شورش کدے اس قوم میں سنسان پڑے ہیں۔ یہ قوم جذبات سے عاری ہوگئی ہے۔ شاعرہ اپنی قوم کے لیے دعا گو ہیں کہ کاش پروانہ سوز کی فطرت اس قوم میں پیدا ہو جائے جو خود جل کر ساری دنیا کو روشن کر دیتا ہے:

شمع کی طرح تجھے سوزِ محبت مل جائے
کاش! بھولی ہوئی پھر راہِ حقیقت مل جائے[۱۰۶]

''موٹر گاڑی'' کے عنوان سے نظم نواب بیگم آف سچین نے عصمت کی نذر کی۔ اس نظم میں انہوں نے بہلی، یکہ، سیج گاڑی، لینڈو، پالکی، سائیکل اور ریل کے ساتھ موٹر گاڑی کا موازنہ کیا ہے اور اس کی تیزی، بغیر گھوڑے، آدمی اور پروں کے ہزاروں میل کا سفر طے کرنے کی خوبیوں کو سراہا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ موٹر گاڑی کے تمام پرزوں کو تیل وغیرہ لگنا چاہیے تا کہ وہ لمبے عرصے تک کام آسکے۔ کیوں کہ اگر ایک دفعہ وہ خراب ہوگئی تو اس کا دوبارہ ٹھیک ہونا کافی مشکل ہوگا۔

اسکے اعضاء کی بھی مالش چاہیے ہونی ضرور — تا کہ چلتے چلتے آجائے نہ اُن میں کچھ فتور
گر ہوئی غفلت ذرا بھی اس میں آفت آگئی — راستے کے بیچ میں موٹر نے ہمت ہار دی[۱۰۷]

''مظلوم چڑیا'' کے عنوان سے نظم بالک رام شاد بجواڑیہ نے انگریزی سے ترجمہ کی۔ اس نظم

میں شاعر نے ایک ایسی مظلوم چڑیا کی حالتِ زار بیان کی ہے جو قید میں اپنی رہائی کے خوشگوار لمحات کو یاد کر رہی ہے۔ جب چڑیا آزاد تھی تو صحرا کا دانہ اس کی غذا تھی اور صبح کی شبنم سے وہ پیاس بجھاتی تھی۔ ڈالی ڈالی وہ چہچہاتی تھی اور جہاں دل ہوتا تھا بسیرا کر لیتی تھی۔ لیکن ظالم صیاد کے پنجرے میں قید ہونے کے بعد یہ سب اس کے لیے ایک خواب کی مانند ہو گیا ہے۔ چڑیا دہقاں (صیّاد) سے شکوہ کناں ہے کہ اس کے برے سلوک کی بدولت وہ مرنے کے قریب ہے اور عمر کی گھنٹی بس بجنے ہی کو ہے پھر وہ موت کی آغوش میں پناہ لے کر ہمیشہ کے لیے اس قید سے رہائی پا لے گی:

آتی ہے قافلۂ عُمر سے آوازِ جرس　　لے خدا حافظ! اب اے سایۂ دیوارِ قفس

مجھ پہ ہوتیں اگر اتنی نہ جفائیں تیری　　حوصلے دل کے بڑھاتیں جو وفائیں تیری

کوئی دن اور گرانبارِ سلاسل رہتی

تیرے پنجرے میں گرفتارِ سلاسل رہتی[۱۰۸]

''صدائے کبریٰ'' نظم میں شاعرہ ک خاتون اکبر آبادی مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتی ہیں اور انھیں اسلاف کی شجاعت و بہادری یاد دلا کر بے حسی کے خول سے باہر نکلنے پر اکساتی ہیں۔ شاعرہ نے امت مسلمہ کی زبوں حالی پر گہرے دکھ اور غم کا اظہار کیا ہے:

کر دیا سوزش صد رنج و الم نے مضطر　　خون روتے ہیں شب و روز میرے قلب وجگر[۱۰۹]

''نور جہاں'' نظم میں گوہر اقبال حوؔر ملکۂ ہندستان کو گنجینۂ صد افتخار، آسمانِ ہند کی مہر درخشاں اور خندان گلستانِ ہند کا ایک پھول قرار دیتی ہیں اور ان کا اوجِ وقار یاد کرتے ہوئے قبر کی وحشت ناک خاموشی سے اٹھ کر ان سے دوبارہ بزمِ عالم کی رونقیں بحال کرنے پر اصرار کرتی ہیں مگر افسوس اس فانی دنیا سے جانے والا کبھی لوٹ کر نہیں آ سکتا:

چھیڑ چھاڑ مضرابِ نو سے اپنا سازِ زندگی　　منتظر ہیں اہل دنیا، توڑ، قفلِ خامشی[۱۱۰]

نظم ''مؤذن سے خطاب'' میں شاعرہ زینب عثمانیہ لدھیانوی نہایت سادہ اور سلیس انداز میں مؤذن سے مخاطب ہوتی ہیں اور اس کے لبوں سے ادا ہونے والی اذان کی تعریف بیان کرتی ہیں کہ اذان کی صدا پر آنکھوں سے اشک بہنے لگتے ہیں اور خوفِ خدا اور یادِ خدا میں بہتے اشک ہی ایک

مسلمان کی خطاؤں کی بخشش کا سبب بن جاتے ہیں۔ بلاشبہ مسلمانوں کے نزدیک ان کا مذہب ہر چیز سے زیادہ اہم ہے اور اسی حوالے سے مؤذن کا بھی بہت بڑا رتبہ ہے۔صرف زمین ہی نہیں آسمان بھی مؤذن کے آگے ہیچ ہے۔شاعرہ مؤذن کو اپنے اندر جذبۂ ایمانی وآگہی تیز کرنے کا درس دیتی ہیں:

زخم کر اپنے جگر میں ناوک ایماں سے تُو
تندیٔ جذبہ سے تجھ کو آگہی بخشے خدا[۱۱]

''طلسمِ امید'' نظم میں آنسہ خورشید اقبال حیا میرٹھی بہت خوب انداز میں امید کی کرن روشن کرتی ہیں۔ایسے حالات میں جب مسلمان زوال و پستی کا شکار تھے۔امید کا دیا روشن رکھنا قابل فخر بات ہے۔شاعرہ کہتی ہیں کہ انھیں امید ہے کہ اس فانی دنیا میں جب ہر شے تغیر پذیر ہے، فنا ہو جانے والی ہے تو ضرور ایک دن ان کی زندگی سے بھی تاریکی اور غموں کا اندھیرا چھٹ جائے گا، خوشی کا چاند ان کے افق پر بھی چمکے گا۔ایک طویل تاریک شب کے بعد روشن صبح ضرور طلوع ہوگی جہاں ان کا دل بھی آسودۂ سکون ہوگا، اور تھکی ماندی روح پھر سے مسرور وشگفتہ ہو جائے گی:

تو رنج نہ کر، مغموم نہ ہو، امیدیں مجھ سے کہتی ہیں اِس یاس کے ریگستان سے پَرے تسکین کی لہریں بہتی ہیں
ہر غم کے بعد اک راحت ہے دنیا والے یوں کہتے ہیں آغاز میں رونا ہے جن کے، انجام میں ہنستے دیکھے ہیں[۱۲]

نظم ''امید'' میں آنسہ نصیرہ راز جذبۂ امید سے مخاطب ہوتی ہیں کہ جب انسان منزل سے بھٹک کر راہ بھول جاتا ہے تو امید ہی انسان کی رہبری اور رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ جب انسان مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اس وقت امید ہی انسان کی آس بندھاتی ہے۔ یہ دنیا امید ہی کے دم پر قائم ہے۔ بیمار، دم توڑتا مریض بھی زندگی کی امید پر جی رہا ہوتا ہے۔غرض یہ کہ اگر امید نہ ہوتی تو کوئی کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکتا:

تیری ہی پہلی ''کرن'' نے مجھ کو بخشی زندگی
ورنہ یوں رُوح فسردہ میں کہاں تابندگی[۱۳]

سید محمود حسن نظم ''ناکامی'' میں کامیابی اور ناکامی دونوں کا موازنہ کرتے ہیں۔ دنیا میں ہر چیز، ہر جذبے میں تضاد ساتھ ساتھ ہے۔اسی طرح کامیابی کے ساتھ ساتھ ناکامی کا بھی سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جہاں میں پھول اور خار، بلندی، پستی، تکلیف، راحت، بہار، خزاں سب

ساتھ ساتھ ہیں اور اسی تغیر سے کائنات حسین ہے:

سعیِ پیہم کا اشارہ ہے شکستِ آرزو جس سے ہرگز کم نہ ہونی چاہییں سرگرمیاں
ٹھوکریں کھا کر سنبھلنا چاہیے انسان کو کامیابی کی ہیں ضامن مستقل جولانیاں[۱۱۴]

نظم ''زندگی'' میں شاعر ابوالاعجاز ازلؔ زندگی کی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ جس انسان کو موت و حیات کا فلسفہ سمجھ آ جائے اس کے لیے زندگی کا ہر امتحان آسان ہو جاتا ہے۔ زندگی میں اگر خاکساری کو اپنا لیا جائے تو دنیا و دین دونوں میں سربلندی ملتی ہے۔ شاعر اپنے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہوئے موجودہ حالات پر افسوس کر رہے ہیں کہ وہ لوگ جو ماضی میں دوست تھے اب دشمن بن کر نقصان پہنچا رہے ہیں:

زندۂ جاوید رہنے کے لیے زیرِ فلک موت سے پہلے مٹا، نام و نشانِ زندگی
جان سی پڑنے لگی قومِ مردہ میں ازلؔ ہم پہ بھی ہونے لگا ہے پھر گمانِ زندگی[۱۱۵]

۲۔ رباعیات

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معانی چار کے ہیں۔ اصطلاح میں رباعی وہ مختصر نظم ہے جس کے چار مصرعے ہوتے ہیں، جن میں پہلا، دوسرا اور چوتھا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔ رباعی کے مخصوص اوزان اور بحریں ہوتی ہیں، اس لیے یہ ایک مشکل صنف تصور کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصمت کے دورِ اوّل (۱۹۴۷ء تا ۱۹۰۸ء) میں رباعیات بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہیں۔ اگرچہ رباعی کے لیے موضوع اور مضمون کی کوئی قید نہیں ہے، لیکن عام طور پر اس میں صوفیانہ اور اخلاقی مضامین قلم بند کیے جاتے ہیں۔

شاعرہ خیر النساء ناچیزؔ کی رباعیات میں تصوف کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ دنیا نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی کی طلب گار ہیں اور آخرت کے حصول کے لیے یادِ الٰہی کو ذریعہ بناتی ہیں:

دنیا میں نہیں زیست کی چاہت مجھ کو
عقبیٰ میں الٰہی ملے راحت مجھ کو
لب پر ترا ذکر دِل میں ہو یاد تری
اس دولتِ عظمیٰ کی ہے چاہت مجھ کو

بندۂ بشر خطا کا پتلا ہے۔ انسان خطائیں کرتا چلا جاتا ہے اور اس کا رحمان اور رحیم رب اسے معاف کرتا جاتا ہے۔ زندگی کی آخری سانس تک انسان کے پاس معافی مانگنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ شاعرہ بھی اللہ کی اسی رحمت کی طلب گار ہیں:

کچھ شک نہیں اِس میں کہ گنہگار ہوں میں
کیا ڈر ہے مجھے، بندۂ غفار ہوں میں
مانا کہ نہیں مجھ سا گنہگار کوئی
لیکن تری رحمت کی طلب گار ہوں میں

شاعرہ خیر النساء ناچیزؔ اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر بخشش کی طلب گار ہیں۔ انھیں اپنے رب کی رحمت پر پورا بھروسہ ہے کہ گناہوں میں لتھڑا ہونے کے باوجود ان کا رب انہیں معاف کر دے گا:

ہوں گرچہ میں آلودۂ عصیاں یا رب!
ہیں میرے گنہ مثل بیاباں یارب!
لیکن تری رحمت پہ بھروسا ہے مجھے
جاری ہے ترا چشمۂ فیضاں یارب!

شاعرہ گناہوں سے گریز کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے حصولِ دولتِ دنیا و آخرت حبِ نبوی ﷺ کو قرار دیتی ہیں:

عصیاں سے گریز کر کہ دولت ہے یہی
در علم و عمل کوش سعادت ہے یہی
گر چاہتی ہے دولتِ دنیا عقبیٰ
رکھ حب نبیؐ جادۂ راحت ہے یہی[۱۱۶]

شاعرہ قمر جہاں بیگم نے رباعیات میں اخلاقی موضوعات کو قلمبند کیا ہے۔ مغرب پرست خواتین کو دیکھ کر انہیں حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہو رہا ہے کہ مسلمان خواتین ''پردہ'' کو چھوڑ کر نمود و نمائش کی راہ پر چل پڑیں:

یہ ضد ہے کمسنی کی دُھن سمائی ہے لڑکپن میں
کہ دیکھیں مشرقی عورات کو یورپ کے فیشن میں

نہاں تھا حُسنِ دلکش پردۂ اسلام میں اَب تک
عجب کیا ہے جواب کی فرسٹ آئین اکزبیشن میں

تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار بھی دم توڑ رہی ہیں۔ لمبے بال خواتین کا حسن سمجھے جاتے تھے اور بال کٹوانا عزت دار گھرانوں میں ناک کٹنے سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن موجودہ تہذیب وتمدن میں بال کٹوانا فیشن کے زمرے میں آنے لگا:

یہی تہذیب کی گنگا جو الٹی اس زمانے میں
ہوئی ہیں بھینٹ اس کے دیویاں اکثر گھرانے میں
سلف میں چوٹی کٹنا ناک کٹنے سے کہیں کم تھا
بہت اعزاز ہے فی الحال چوٹی کے کٹانے میں[۱۷]

صادق اندوروی صاحب مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے انہیں زندگی کے مثبت اور منفی تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا مشورہ دیتے ہیں:

ہو دُور کہ نزدیک ہر اِک پہلو دیکھ　　　سادہ ہو کہ باریک ہر اِک پہلو دیکھ
انسان ہے تو اپنی زندگی سے غافل　　　روشن ہو کہ تاریک ہر اک پہلو دیکھ

شاعر مسلمانوں کو دنیا میں لاجواب اور مثلِ آفتاب بننے کے لئے قوتِ عمل پر اکساتے ہیں:

آسودۂ و کا میاب ہونا ہے تجھے　　　اس دہر میں لا جواب ہونا ہے تجھے
اے ذرّہ صفت خاک پہ سونے والے　　　بیدار! کہ آفتاب ہونا ہے تجھے

شاعر مسلمانوں کو وقت کی قدر کرنے کا درس دیتے ہوئے قول وفعل کی پابندی کو انسان ہونے کا معیار قرار دیتے ہیں:

ہر لمحے کو اپنے لئے فائدہ مند بنا　　　خورسند ہو زندگی کو خورسند بنا
انسان اگر بننا ہے دنیا میں تجھے　　　افعال کو اقوال کا پابند بنا

شاعر اپنے آپ سے استفسار کرتے ہیں کہ حصولِ کامیابی کے لئے کبھی راہ میں آنے والی مشکلات کے متعلق سوچا ہے؟ آغازِ سفر تو سب کو اچھا لگتا ہے لیکن انجام پر نظر رکھنی زیادہ ضروری ہے:

اس راہ کے فاصلہ کو ناپا ہے کبھی　　　آغاز کے جلوؤں کے فدائی صادق

منزل کا پتا تو نے لگا یا ہے کبھی انجام کے پرتَو کو دیکھا ہے کبھی [۱۱۸]

شاعر مسلمانوں کو مغربی کورانہ تقلید کرنے سے منع کرتے ہوئے اسے دُور کے سہانے ڈھول قرار دیتے ہیں اور سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانے کا کہتے ہیں:

کہتی ہے خرد مجھ سے زباں اپنی نہ کھول تقدیر کی میزان میں ہر چیز کو تول
جو دُور سے دیتے ہیں سنائی ہم کو کہتے ہیں کہ ہوتے ہیں سہانے وہ ڈھول [۱۱۹]

صفیہ شمیم ملیح آبادی ''رباعیات'' میں زندگی کی بے ثباتی کو موضوع بناتے ہوئے کہتی ہیں کہ زندگی کے گونا گوں مسائل انسان سے جینے کی امید اور حوصلہ بھی چھین لیتے ہیں اور انسان ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے:

تاریکیِ شام زندگانی دیکھو بجھتی ہوئی شمع شادمانی دیکھو
ہر آن لرز رہی ہے کشتی دل کی طوفانِ حوادث کی روانی دیکھو

شاعرہ اپنے آپ کو تلخ آواز، راز اور ٹوٹے ہوئے ساز سے تشبیہہ دیتی ہیں اور اپنی زندگی کو خوشیوں سے خالی اور غموں سے معمور قرار دیتی ہیں:

کربِ ہستی کی تلخ آواز ہوں میں کونین کے سینے کا عجب راز ہوں میں
جس میں کبھی گونجا نہ کوئی نغمۂ عیش صد حیف کہ ٹوٹا ہوا ساز ہوں میں [۱۲۰]

۳۔ غزلیات

لغت میں غزل کے معنی ''عورتوں سے باتیں کرنا (سخن بازنان گفتن) یا عورتوں کی باتیں کرنا (سخن ازنان گفتن) کے ہیں۔ اصطلاح میں غزل شاعری کی وہ قسم ہے جس میں حسن و عشق کے موضوعات اور تجربات پیش کئے جاتے ہیں۔ غزل میں حسن و عشق کے ساتھ ساتھ تصوف، اخلاق اور حیات و کائنات کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ باقی اشعار کے ہر دوسرے مصرعے میں قافیہ موجود ہوتا ہے۔ غزل کی ایک انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر شعر موضوع کے اعتبار سے مکمل ہوتا ہے۔ [۱۲۱]

جناب اثر میرٹھی بھی ''غزل'' کی ہئیت میں فخرِ کائنات کی بارگاہ میں عقیدت و محبت کے

پھول نچھاور کرتے ہیں۔شاعر کہتے ہیں کہ رہتی دنیا تک ہر زبان پر آپؐ کی تعریف رہے گی۔شاعر کے مطابق جس طرح کافور کی بُو کفن میں سرایت کر جاتی ہے۔اس طرح آپؐ کی خوشبو مٹی میں رچ بس گئی ہے اور ہمیشہ آپؐ کی الفت و محبت مخلوق خدا کے دل میں رہے گی:

زباں یہ مدح پنجتن رہے گی　　نبی کی رہے گی سدا دل میں الفت
آثر روح جب تک بدن میں رہے گی　　مٹے ہیں نہ دنیا کے یہ غم مٹیں گے [۱۲۲]

فراق دہلوی ''غزل'' کی ہیئت میں حضورؐ سے محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ کے وطن سے میری محبت کا وہی عالم ہے جو بلبل کی چمن سے محبت کا ہے۔شاعر مدینہ جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں اور آپؐ کے روضہ مبارک کی صفائی کرنے والے شخص کو پوری دنیا کے سلاطین سے عالی مرتبہ قرار دیتے ہیں۔شاعر اپنے شوق زیارت کا عالم بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس عالمِ شوق میں، میں ہرن سے بھی زیادہ چوکڑیاں بھرتے ہوئے جاتا ہوں تاکہ مجھے شہر مدینہ اور روضہ رسولؐ کا دیدار حاصل ہو جائے:

محشر میں جو منہ کھولیں گے ہم اپنا کفن سے　　سورج کے عوض دیکھیں گے دیدارِ محمدؐ
دہلی کی ہے توقیر بڑی چرخِ کہن سے　　ہے نقشِ قدم آپ کا اس میں جو درخشاں [۱۲۳]

۴۔ قطعات

قطعے کے لفظی معانی ٹکڑے کرنا کے ہیں۔اصطلاح میں قطعہ اس نظم کو کہا جاتا ہے، جس میں ایک شعر کا مفہوم دوسرے شعر سے وابستہ ہو اور اس کے مضمون میں تسلسل ہو۔قطعہ کم از کم دو اشعار پر مشتمل ہوتا ہے اور زیادہ کی کوئی پابندی نہیں نہ ہی موضوع کی کوئی قید ہے۔ [۱۲۴]

ساجدہ بنت دانش ''قطعات'' میں وطن سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے وطن کے لئے ہر وقت جان قربان کرنے کا عزم کرتی ہیں، اور وطن سے دوری کو روح کے جلنے کا سبب بتاتی ہیں:

جب وطن کو چھوڑ کر پردیس کو جاتی ہوں میں
روح کو صرفِ تپش اُف دیکھتی ہوں بیشتر
ساجدہ! وہ غالباً حسن ازل کی یاد میں

ہر قدم پر جان دیتی ہے وطن کے نام پر

شاعرہ جسم میں روح کی بندش کو ایسے پرندے سے تشبیہہ دیتی ہیں جو خوبصورت پنجرے میں قید اور اداس ہو۔ روح بھی اس پرندے کی ہی مانند ہے جسے جسم کی آرائش اور چمک دمک متاثر نہیں کرتی۔ شاعرہ روح کی تقدیر پر چمکنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہیں:

گو قفس کی تیلیوں پر تھی چمک با آب و رنگ
طوطی شیریں ادا تھا مضمحل اور سر نگوں
یہ چمک اے کاش ملتی روح کی تقدیر کو
خواہرِ من! جسم کے پنجرے کی آرائش زبوں ۱۲۵

۵۔ سانیٹ

سانیٹ چودہ مصرعوں پر مشتمل ایک مغربی صنفِ سخن ہے۔ اطالوی شاعر پیٹرارک (Petrarch) نے اس صنف شعر کو تکمیل بخشی اور اسے رواج دیا۔ سانیٹ میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور چودہ مصرعوں کو ایسے دو بندوں میں تقسیم کیا جاتا ہے کہ پہلے آٹھ مصرعوں میں خیال کا پھیلاؤ اور بعد کے چھ مصرعوں میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ۱۲۶

شاعر جناب اختر شیرانی صاحب ''سانیٹ'' کی ہیئت میں مسلمانوں کو ان کی ''عشرت رفتہ'' کی یاد دلاتے ہیں اور اپنے نادان دل کو سمجھاتے ہیں کہ ماضی کے پرانے قصے دہرانے سے اب کچھ حاصل نہیں ہوگا:

تجھے کیوں عشرتِ رفتہ کی یاد آتی ہے رہ رہ کر؟
مرے ناداں دل، مجھ سے بھی کہہ یہ ماجرا کیا ہے؟
پرانے قصے دہرانے سے آخر فائدہ کیا ہے؟
بتا ماضی کی دھن، کیوں اتنا تڑپاتی ہے رہ رہ کر؟

شاعر مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عروج وزوال قوموں کی زندگی میں آتا ہی رہتا ہے۔ اگر تغیر نہ ہو تو زندگی جمود کا شکار ہو جاتی ہے:

کسی کا حال دنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا!
جہاں دیکھو، تغیر ہی تغیر کی حکومت ہے
تغیر اصل ہستی ہے، تغیر اصل فطرت ہے
تغیر ہو نہ جس انساں میں، وہ انساں نہیں رہتا!

شاعر مسلمانوں کی عشرتِ رفتہ کو فصلِ بہار سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بہار کے بعد اب خزاں کا موسم آیا ہے۔ جس کا اس وقت مسلمان شکار ہیں۔ شادی و ماتم، رنج و راحت سب سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے لیکن کسی بھی کیفیت کو دوام حاصل نہیں:

خزاں کے بعد آتی ہیں بہاریں باغِ عالم میں!
بہاریں ختم ہونے پر خزاں کا دور آتا ہے
چمن روتا ہے اِک دن، دوسرے دن مسکراتا ہے
غرض عمریں گزر جاتی ہیں یوں شادی و ماتم میں !
تو اپنے رنج کو راحت بنا سکتا نہیں، اے۔۔۔
عدم سے عشرتِ رفتہ کو لا سکتا نہیں، اے۔۔۔ [۱۲۷]

ماہنامہ عصمت کی شعری تخلیقات کا مجموعی جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اس ماہنامے میں زیادہ تر منظومات تحریر کی گئیں۔ غزلیات، رباعیات، سانیٹ اور قطعات ملتے ہیں مگر نہ ہونے کے برابر۔ منظومات کا نمایاں موضوع عورت رہی۔ کبھی نیک اور بدعورت کو موضوع بنایا گیا، کبھی عورت کے حقوق کی پامالی کو اور کبھی طبقۂ نسواں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لیے الفاظ کو شاعری کی صورت عملی جامہ پہنایا گیا۔ کچھ ایسے مرد شاعر حضرات بھی سامنے آئے جنھوں نے عورت کو اس کی اہمیت کا احساس دلا کر سر اٹھا کر جینے کا حق دیا۔ خواتین میں اعلیٰ اقدار کی ترویج کے لیے بھی منظومات لکھی گئیں، مغربی کورانہ تقلید کی بھی ممانعت کی گئی اور بحیثیت ماں بچے کی تربیت کے حوالے سے بھی خواتین کی رہنمائی کی گئی۔ الختصر یہ کہ طبقۂ نسواں کی زندگی سے متعلق ہر موضوع کو شاعری میں زیرِ بحث لایا گیا۔

یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ ماہنامہ عصمت کی نثری تخلیقات کے برعکس شعری تخلیقات میں

زبان کی سادگی کوملحوظ نہیں رکھا گیا۔اکثر شاعرات نے اردو اور فارسی زبانوں پر مشتمل منظومات لکھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ماہنامہ عصمت کی شاعرات اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتی تھیں۔منظومات میں نادر تشبیہات واستعارات کا استعمال ان کی زبان دانی کی مہارت کا عکاس ہے۔منظر کشی اور جزئیات نگاری میں وہ کسی بھی طرح مرد شعرا سے کم نہیں۔ ان کا کلام پختگی، صفائی، بلند پروازی کا اچھا نمونہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ عصمت کی شاعری عامیانہ و سوقیانہ پن سے پاک، مقصدیت کی حامل تھی۔ مجموعی طور پر ماہنامہ عصمت کے شعرا کا مقصد معاشرے میں خواتین کی مسلمہ اہمیت کو منوانا اور شعورِ بیداری و آگہی نسواں پیدا کرنا تھا جس میں وہ مکمل طور پر کامیاب ہوئے اور ان کے کلام سے اس امر کا پوری طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی حد تک اردو کی اور طبقۂ نسواں کی خدمت کا حق پوری طرح ادا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شیخ محمد اکرام، ''عصمت میں نظمیں کیسی ہوں گی'' عصمت (جون ۱۹۰۸ء): ص ۵۱۔۵۲۔

۲۔ ڈاکٹر سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۱۶۔

۳۔ سید غلام مصطفےٰ ذہین، ''حمدِ خدا'' عصمت (دسمبر ۱۹۰۸ء): ص ۳۲۔

۴۔ زہرہ نقی الحسن، ''نعتیہ سلام'' عصمت (دسمبر ۱۹۲۷ء): ص ۴۲۵۔

۵۔ قاضی احمد میاں صاحب اختر، ''نغمۂ توحید'' عصمت (فروری ۱۹۱۵ء): ص ۷۔

۶۔ رابعہ خاتون پنہاں، ''ھدیۂ نعت'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۲ء): ص ۲۹۲۔

۷۔ جام نوائی بدایونی، ''یتیموں کا والی'' عصمت (دسمبر ۱۹۳۸ء): ص ۴۵۲۔۴۵۳۔

۸۔ علامہ راشد الخیری، ''ولادتِ نبویؐ'' عصمت (مئی ۱۹۳۸ء): ص ۳۲۸۔

۹۔ حمیرا ثاقب، ''عرضداشت'' عصمت (نومبر ۱۹۴۵ء): ص ۳۲۱۔

۱۰۔ زینب عثمانیہ لدھیانوی، ''کسان اور برسات'' عصمت (جولائی ۱۹۳۸ء): ص ۹۷۔

۱۱۔ سیّدہ، ''ساون'' عصمت (اگست ۱۹۰۸ء): ص ۲۲۔

۱۲۔ جوش ہزار داستان ''سحر کی آمد آمد'' عصمت (جنوری ۱۹۲۳ء): ص ۸۔

۱۳۔ سید راحت حسین بی اے، بی۔ ایل، ''ندی کا راگ'' عصمت (اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۲۳ء): ص ۲۰۔

۱۴۔ بلقیس جمال خاتون، ''برسات کی ایک شام'' عصمت (ستمبر ۱۹۲۷ء): ص ۲۲۰۔۲۲۱۔

۱۵۔ مسعودہ بیگم ادا، ''چاند سے خطاب'' عصمت (ستمبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۱۱۔

۱۶۔ آغا شاعر دہلوی، ''تاروں بھری رات'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۶ء): ص ۳۱۵۔

۱۷۔ صفیہ شمیم ملیح آبادی، ''بارش کے مہینے'' عصمت (اگست ۱۹۳۸ء): ص ۲۲۴۔

۱۸۔ کافی بیگم صاحبہ ناموس، ''آیا ہے ماہِ ساون'' عصمت (اگست ۱۹۳۱ء): ص ۱۵۱۔

۱۹۔ اختر جہاں بیگم اختر، ''باغ کی بہار'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۱ء): ص ۳۲۲۔

۲۰۔ صفیہ بیگم شیم ملیح آبادی، ''مالن سے'' عصمت (جنوری ۱۹۴۰ء): ص ۳۶۔
۲۱۔ صفیہ بیگم شیم ملیح آبادی، ''گرمی کی ایک دوپہر'' عصمت (جون ۱۹۳۸ء): ص ۴۴۴۔
۲۲۔ انور جہاں، ''پس منظر'' عصمت (نومبر ۱۹۳۸ء): ص ۴۲۲۔
۲۳۔ مسز ممتاز علی، ''شمع اور پروانہ'' عصمت (جون ۱۹۰۸ء): ص ۵۴۔۵۵۔
۲۴۔ بیگم دعاڈبائیوی، ''راستی'' عصمت (جون ۱۹۳۶ء): ص ۴۶۵۔
۲۵۔ ام زہرہ ہاشمی، ''خواتین سلف کا رمضان'' عصمت (اکتوبر ۱۹۴۰ء): ص ۲۹۴۔
۲۶۔ غلام مصطفیٰ ذہین، ''مچھر اور شہد کی مکھی'' عصمت (ستمبر و اکتوبر ۱۹۲۴ء): ص ۶۱۔
۲۷۔ عابدہ بیگم، ''مساوات'' عصمت (اکتوبر ۱۹۲۶ء): ص ۲۶۳۔
۲۸۔ صغرا بیگم، ''دعوت عبادت'' عصمت (اکتوبر ۱۹۲۶ء): ص ۲۲۹۔
۲۹۔ ناصر نذیر فراق دہلوی، ''صبر و تحمل'' عصمت (نومبر ۱۹۲۶ء): ص ۳۲۳۔۳۲۴۔
۳۰۔ بالک رام شاد، ''کیڑا'' عصمت (جون ۱۹۰۸ء): ص ۵۵۔۵۶۔
۳۱۔ اکبری بیگم، ''ادب'' عصمت (ستمبر ۱۹۰۸ء): ص ۴۵۔
۳۲۔ ظہور بانو، ''ادب'' عصمت (ستمبر ۱۹۰۸ء): ص ۴۵۔۴۶۔
۳۳۔ جناب اشک بلند شہری، ''ادب'' عصمت (نومبر ۱۹۰۸ء): ص ۵۵۔
۳۴۔ روح گیاوی، ''ایثار فاطمہؓ'' عصمت (جون ۱۹۲۳ء): ص ۲۴۔
۳۵۔ منظر عباس، ''خاتونِ مشرق'' عصمت (مارچ ۱۹۳۵ء): ص ۲۰۸۔
۳۶۔ ام زہرہ ہاشمی بدایونی، ''بیٹی'' عصمت (مارچ ۱۹۳۸ء): ص ۱۹۱۔
۳۷۔ ام زہرہ ہاشمی بدایونی، ''بیوی'' عصمت (اپریل ۱۹۳۸ء): ص ۲۵۰۔
۳۸۔ صفیہ بیگم قمر، ''عورت'' عصمت (جولائی و اگست ۱۹۳۰ء): ص ۱۵۵۔
۳۹۔ محشر عابدی، ایک کمسن بچّی سے خطاب'' عصمت (جولائی و اگست ۱۹۳۰ء): ص ۱۵۹۔
۴۰۔ مولانا الطاف حسین حالی، ''چُپ کی داد'' عصمت (ستمبر ۱۹۰۸ء): ص ۳۱۔
۴۱۔ منشی درگا سہائے صاحب سرور جہاں آبادی، ''پیاری بہنو'' عصمت (جون ۱۹۰۸ء): ص ۵۴۔۵۵۔

۴۲۔ خلیق برہان پوری، ''خواتینِ ہند سے'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۹ء): ص ۳۳۴۔

۴۳۔ خورشید آرا بیگم، ''عورت'' عصمت (فروری ۱۹۳۴ء): ص ۱۱۳۔

۴۴۔ تلوک چند محرومؔ، ''خواتین ہند'' عصمت (جنوری ۱۹۳۴ء): ص ۱۵۔

۴۵۔ انور جہاں سراج، ''عورت'' عصمت (فروری ۱۹۳۸ء): ص ۹۹۔

۴۶۔ اہلیہ محمد حسن خاں، ''اخلاقی غزل''، عصمت (دسمبر ۱۹۲۷ء): ص ۴۴۹۔

۴۷۔ سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ، ''نیک وبد'' عصمت (نومبر ۱۹۰۸ء): ص ۵۴۔

۴۸۔ زہرہ اختر الوری، ''حقوق شوہر'' عصمت (اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۲۳ء): ص ۱۳۔

۴۹۔ مسز انعام الحق، ''شوہر کے موہنے کا منتر'' عصمت (جنوری و فروری ۱۹۲۴ء): ص ۱۳۔۱۴۔

۵۰۔ مسز انعام الحق، ''میٹھا بول'' عصمت (اپریل ۱۹۲۴ء): ص ۲۵۔۲۶۔

۵۱۔ سید غلام مصطفیٰ ذہینؔ، ''نیک بیوی'' عصمت (اگست ۱۹۲۷ء): ص ۱۶۴۔

۵۲۔ سید محمود حسن کیتھل، ''عورت'' عصمت (فروری ۱۹۳۶ء): ص ۱۴۱۔

۵۳۔ محمود اسرائیلی، ''داستانِ جفا'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۹ء): ص ۳۱۰۔

۵۴۔ محوی صدیقی لکھنوی، ''پامالی حقوق'' عصمت (اگست ۱۹۳۹ء): ص ۱۶۱۔۱۶۲۔

۵۵۔ صفیہ بیگم شمیم، ''دختر ہند'' عصمت (اپریل ۱۹۳۸ء): ص ۲۶۰۔

۵۶۔ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، ''عقد بیوہ'' عصمت (مارچ ۱۹۳۴ء): ص ۱۷۱۔

۵۷۔ ثاقب کانپوری، ''خاتونِ مشرق سے'' عصمت (اپریل ۱۹۴۰ء): ص ۲۶۵۔

۵۸۔ محمود اسرائیلی، ''خواتین سلف'' عصمت (مارچ ۱۹۳۸ء): ص ۲۰۱۔

۵۹۔ خورشید اقبال حیاؔ میرٹھی، ''خواتین ملت سے'' عصمت (جنوری ۱۹۳۸ء): ص ۲۹۔

۶۰۔ خورشید آرا بیگم، ''حالتِ نسواں'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۹۷۔

۶۱۔ بلقیس جمال بریلوی، ''پیاری بہنوں سے'' عصمت، (فروری ۱۹۳۰ء): ص ۱۲۹۔۱۳۰۔

۶۲۔ سید عنایت حسین امدادؔ عظیم آبادی، ''تعلیم کے فوائد'' عصمت (اگست ۱۹۰۸ء): ص ۴۹۔۵۰۔

۶۳۔ حامد حسن قادری، ''کتابیں'' عصمت (دسمبر ۱۹۰۸ء): ص ۳۳۔۳۴۔
۶۴۔ گوہر اقبال حور، ''خواہران خفتہ کو پیامِ بیداری'' عصمت (ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۶ء): ص ۲۸۸۔
۶۵۔ آغا شاعر قزلباش، ''خواتین ہند سے'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۴ء): ص ۳۱۳۔
۶۶۔ خورشید اقبال حیا، ''مسلمان خاتون سے'' عصمت (جولائی ۱۹۳۹ء): ص ۳۱۔
۶۷۔ خورشید آرا بیگم، ''اے محترم خواتین'' عصمت (مئی ۱۹۳۱ء): ص ۳۴۸۔
۶۸۔ خورشید آرا بیگم، ''نوائے بیداری'' عصمت (جون ۱۹۳۱ء): ص ۴۳۵۔
۶۹۔ نواب قمر جہاں بیگم، ''محترم بہنوں سے'' عصمت (جولائی ۱۹۳۸ء): ص ۲۷۔
۷۰۔ نوشابہ خاتون قریشی، ''درسِ عمل'' عصمت (جولائی ۱۹۳۸ء): ص ۸۸۔۸۶۔
۷۱۔ گوہر اقبال حور زبیری، ''نوائے عمل'' عصمت (اگست ۱۹۳۹ء): ص ۲۰۵۔
۷۲۔ خورشید آرا بیگم، ''خواتین بنگال سے'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۸ء): ص ۳۲۴۔
۷۳۔ عاصیہ رابعہ پنہاں، ''صنف نازک سے'' عصمت (ستمبر ۱۹۲۷ء): ۲۰۷۔۲۰۹۔
۷۴۔ کیف مرادآبادی، ''صنف نازک سے'' عصمت (ستمبر ۱۹۲۸ء): ص ۳۲۰۔
۷۵۔ تلوک چند محروم ''تربیت اولاد میں عورتوں کا فرض'' عصمت (اپریل ۱۹۳۹ء): ص ۲۸۳۔۲۸۴۔
۷۶۔ اندر جیت شرما، ''بچہ کا پہلا مکتب ماں کی گود ہے'' عصمت (جون ۱۹۳۸ء): ص ۴۴۴۔
۷۷۔ ام زہرہ ہاشمی بدایونی، ''ماں (نسوانیت کی آخری منزل)'' عصمت (جون ۱۹۳۸ء): ص ۴۵۰۔
۷۸۔ خواجہ دل محمد صاحب ایم اے، ''بچے کے آسماں'' عصمت (نومبر ۱۹۰۸ء): ص ۵۶۔
۷۹۔ ڈاکٹر سعید احمد، ''اے کاش میں ماں ہوتی'' عصمت (جولائی و اگست ۱۹۳۰ء): ص ۱۵۰۔
۸۰۔ عنایت حسین عظیم آبادی، ''آغوشِ مادر'' عصمت (اپریل ۱۹۳۸ء): ص ۲۸۱۔

۸۱۔ محوی صدیقی لکھنوی، ''خاتونِ ہندی سے'' عصمت (جون ۱۹۳۷ء): ص ۴۴۱۔

۸۲۔ محوی صدیقی لکھنوی، ''شریف بی بی'' عصمت (دسمبر ۱۹۴۰ء): ص ۴۷۲۔

۸۳۔ محوی صدیقی لکھنوی، ''تعلیم نسواں میں لغزش'' عصمت (جنوری ۱۹۳۵ء): ص ۳۳۔۳۴۔

۸۴۔ مسز محمد یوسف، ''پردہ'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۷۲۔

۸۵۔ ذ۔ فتحپوری، ''پردہ'' عصمت (نومبر، دسمبر ۱۹۲۳ء): ص ۲۷۔

۸۶۔ امداد عظیم آبادی، ''عصمت کے کارنامے'' عصمت (جولائی ۱۹۳۸ء): ص ۶۔

۸۷۔ بلقیس جمالؔ، ''نویدِ سالگرہ''، مشمولہ عصمت (جولائی ۱۹۲۷ء): ص ۲۴۔۲۵۔

۸۸۔ خورشید آرا بیگم، ''سالگرۂ عصمت'' عصمت (جولائی ۱۹۲۷ء): ص ۲۳۔۲۴۔

۸۹۔ بلقیس جمال، ''نغمۂ عصمت'' عصمت (جولائی واگست ۱۳۰ء): ص ۱۵۱۔

۹۰۔ خورشید آرا بیگم، ''خاتون اکرم مرحومہ'' عصمت (نومبر ۱۹۲۶ء): ص ۲۸۲۔۲۸۳۔

۹۱۔ عابدہ بیگم، ''آن خاتون'' عصمت (نومبر ۱۹۲۶ء): ص ۲۸۴۔

۹۲۔ خورشید آرا بیگم، ''تا ابد حاصل ہے تجھکو زندگی دائمی'' عصمت (نومبر ۱۹۲۷ء): ص ۳۳۷۔۳۳۹۔

۹۳۔ بلقیس جمال خاتون، ''خاتونِ اکرم کی خدمت میں'' عصمت (نومبر ۱۹۲۷ء): ص ۳۴۰۔۳۴۲۔

۹۴۔ رابعہ پنہاں، ''یادِ خاتون'' عصمت (نومبر ۱۹۲۷ء): ص ۳۴۳۔۳۴۴۔

۹۵۔ عبدالخالق خلیق دہلویؔ، ''جامِ فنا'' عصمت (نومبر ۱۹۲۷ء): ۳۴۵۔۳۴۶۔

۹۶۔ تلوک چند محرومؔ، ''نومبر کی ایک صبح'' عصمت (نومبر ۱۹۲۷ء): ص ۳۴۷۔۳۴۸۔

۹۷۔ خلیل الرحمن دانش دہلوی، ''تعلیمِ نسواں کے حقوق کے حامی! کہاں ہے تُو؟'' عصمت (جون ۱۹۳۶ء): ص ۴۵۲۔

۹۸۔ رابعہ پنہاںؔ، ''اشک حسرت'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص ۲۲۳۔۲۲۴۔

۹۹۔ تیمور جہاں بیگم حجابؔ دہلوی، ''قطراتِ لہو'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص ۲۲۵۔

۱۰۰۔ آمنہ خاتون عفتؔ، ''سوزِ الم'' عصمت (مارچ ۱۹۳۶ء): ص ۲۲۴۔۲۲۵۔

۱۰۱۔ خورشید اقبال حیا، ''اشک حسرت'' عصمت (فروری ۱۹۳۸ء): ص ۹۱۔

۱۰۲۔ آغا شاعرؔ قزلباش، ''اے بادشاہ نثر!'' عصمت (فروری ۱۹۳۸ء): ص ۹۰۔

۱۰۳۔ گوہر اقبال حورؔ، ''علامہ راشد الخیری کا پیغام بناتِ ہند کے نام'' عصمت (فروری ۱۹۳۸ء): ص ۸۸۔۹۰۔

۱۰۴۔ ابوالاعجاز زاز لؔ، ''مصرفِ دولت'' عصمت (جولائی ۱۹۳۸ء): ص ۴۰۔

۱۰۵۔ جلال ملیح آبادی، ''مرغابیاں'' عصمت (۱۹۳۹ء): ص ۲۶۷۔

۱۰۶۔ خورشید اقبال حیاؔ میرٹھی، ''اے قوم'' عصمت (اگست ۱۹۳۸ء): ص ۱۸۹۔

۱۰۷۔ نواب بیگم آف سچّین، ''موٹر گاڑی'' عصمت (جولائی ۱۹۰۸ء،): ص ۴۵۔

۱۰۸۔ بالک رام شاد بجواڑیہ، ''مظلوم چڑیا'' عصمت (جولائی ۱۹۰۸ء): ص ۴۶۔

۱۰۹۔ ک خاتون اکبر آبادی، ''صدائے کبریٰ'' عصمت (اگست ۱۹۲۷ء): ص ۱۴۶۔

۱۱۰۔ گوہر اقبال حورؔ، ''نور جہاں'' عصمت (دسمبر ۱۹۲۸ء): ص ۵۰۳۔

۱۱۱۔ زینب عثمانیہ لدھیانوی، ''مؤذن سے خطاب'' عصمت (نومبر ۱۹۳۸ء): ص ۴۰۰۔

۱۱۲۔ خورشید اقبال حیاؔ میرٹھی، ''طلسم امید'' عصمت (جون ۱۹۳۹ء): ص ۴۵۳۔

۱۱۳۔ نصیرہ رازؔ، ''امید'' عصمت (اکتوبر ۱۹۳۸ء): ص ۳۱۶۔

۱۱۴۔ سید محمود حسن، ''ناکامی'' عصمت (نومبر ۱۹۳۷ء): ص ۳۶۸۔

۱۱۵۔ ابوالاعجاز ازلؔ، ''زندگی'' عصمت (نومبر ۱۹۳۷ء): ص ۳۸۶۔

۱۱۶۔ خیر النساء ناچیزؔ، ''رباعیات'' عصمت (اپریل ۱۹۳۰ء): ص ۲۵۶۔

۱۱۷۔ قمر جہاں بیگم، ''رباعیات'' عصمت (جنوری ۱۹۳۰ء): ص ۵۹۔

۱۱۸۔ صادق اندوروی، ''رباعیات'' عصمت (اکتوبر ۱۹۴۳ء): ص ۳۱۷۔

۱۱۹۔ ایضاً (اگست ۱۹۴۵ء): ص ۱۵۷۔

۱۲۰۔ صفیہ شمیم ملیح آبادی، ''رباعیات'' عصمت (مئی ۱۹۴۷ء): ص ۲۴۷۔

۱۲۱۔ ڈاکٹر سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۰۔

۱۲۲۔ آثر میرٹھی، ''غزل'' عصمت (فروری ۱۹۱۵ء): ص ۴۰۔

۱۲۳۔ فراق دہلوی، ''غزل'' عصمت (فروری ۱۹۱۵ء): ص ۶۔

۱۲۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ''قطعہ'' اردو شاعری کا فنی ارتقا مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء): ص ۴۱۰۔

۱۲۵۔ ساجدہ بنت دانش، ''قطعات'' عصمت (دسمبر ۱۹۴۱ء): ص ۴۴۳۔

۱۲۶۔ پروفیسر سید احتشام حسین، ''سانیٹ کیا ہے؟'' اردو شاعری کا فنی ارتقا مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء): ص ۵۰۷۔

۱۲۷۔ اختر شیرانی، ''عشرتِ رفتہ'' عصمت (دسمبر ۱۹۴۵ء): ص ۴۱۰۔

باب پنجم

متفرق مشمولات کا تنقیدی مطالعہ

باب پنجم

متفرق مشمولات کا تنقیدی مطالعہ

ا۔ سیر بین

رسالہ عصمت کے اجرا کے وقت جہاں اور مقاصد کو مدنظر رکھا گیا وہاں معلومات عامہ و خاصّہ سے خواتین کو روشناس کرانا بھی لازم ٹھہرایا گیا۔ ابتدائی چند سالوں میں تو اس حوالے سے کوئی خاص پیش رفت نظر نہیں آتی تاہم بعد میں ''مولوی محمد ظفر صاحب ایم اے ایل ایل بی'' نے ''نظرے خوش گزرے'' کے عنوان سے ایک دلچسپ سلسلہ شروع کیا جو بعد میں نام کی تبدیلی کے ساتھ ''سیر بین'' کے عنوان سے عصمت کا ایک مستقل سلسلہ بن گیا۔ ابتدا میں اس سلسلے کو رسالے کے ابتدائی صفحات کی زینت بنایا گیا۔ رسالے کا پہلا مضمون ہی ''نظرے خوش گزرے'' ہوتا تھا لیکن جب یہ سلسلہ ''سیر بین'' کے نام سے آنے لگا تو رسالے کے آخری صفحات کا یہ مستقل حصہ بن گیا۔

''سیر بین'' کے عنوان کے تحت دنیا بھر کی انوکھی اور عجیب وغریب خبریں اور معلومات عصمت کی زینت بنتی تھی۔ اور گھروں میں بیٹھی خواتین کے لیے بیش بہا دلچسپی کا باعث تھیں۔ یہ معلومات دنیا کے مختلف ممالک، اقوام، ان کی تہذیب اور رسوم و رواج کے متعلق ہوتی تھیں اس کے ساتھ ساتھ دوسرے سیاروں سے متعلق دلچسپ حقائق اور معلومات سے بھی قارئین کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ ''سیر بین'' کا سلسلہ ''مولوی محمد ظفر صاحب ایم اے ایل ایل بی'' نے شروع کیا تھا اور تاحیات وہ اس سلسلے کو عصمت کی زینت بناتے رہے لیکن ۱۹۶۰ء میں ان کی وفات کے ساتھ ہی یہ دلچسپ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ سید رضا احمد جعفری نے کچھ عرصہ باقاعدگی سے یہ سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔[۱]

سیر بین کے سلسلے میں شائع ہونے والی معلومات کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ سائنسی موضوعات

''نظرے خوش گزرے''میں سائنسی تجربات سے بھی آگاہ کیا جاتا رہا۔ چند تجربات کے حوالے سے بتایا گیا کہ ایک مرغی کا بچہ خاص طریقوں سے ساڑھے آٹھ برس تک بند کر کے رکھا گیا۔ پھر دیکھا گیا کہ اس میں زندگی کے آثار ہیں اور وہ بڑھتا رہا ہے۔ اس سے سائنس دانوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسانی پٹھے غیر فانی ہیں اور بڑھاپا صرف ایک بیماری ہے جو چند اعضا میں پیدا ہو کر سارے بدن کو کمزور کر دیتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب علم اس درجہ تک پہنچے گا کہ یہ معلوم کر سکے کہ کس طرح ہر عضو کو درست اور قوت کو بحال رکھا جا سکتا ہے تو پھر انسان کا ہمیشہ زندہ رہنا نہ صرف ممکن بلکہ مسلمہ ہو جائے گا۔ [۲]

نت نئے سائنسی تجربات کے حوالے سے بتایا گیا کہ بمبئی کے ایک ہسپتال میں ایک تندرست آدمی کا خون ایک بیمار آدمی کے جسم میں داخل کر کے اسے تندرست کیا گیا۔ ایک رجمنٹ کا سپاہی سخت بخار میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر نے صرف ایک علاج بتایا تھا کہ اگر کسی تندرست آدمی کا خون اس کے جسم میں داخل کیا جائے تو یہ بچ سکتا ہے۔ چنانچہ خون کا عطیہ دینے والوں میں سے طبی معائنے کے ذریعے دو آدمیوں کا انتخاب کیا گیا جن میں ایک شخص کے جسم میں ۲/۱-۸ چھٹانک خون اس بیمار شخص کے جسم میں داخل کیا گیا جو خون کی منتقلی کے فوراً بعد تندرست ہونے لگا۔ [۳]

دنیا بھر میں ہونے والے سائنسی تجربات اور معلومات سے بھی ''سیر بین'' کے ذریعے عصمت کے قارئین کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاتا رہا۔ امریکہ کے ایک طبیعیات دان کے حوالے سے بتایا گیا کہ اس نے تجربات سے اس بات کو ثابت کیا کہ وہ صرف آواز کے ذریعے آگ بجھا سکتا ہے۔ مثلاً وہ کمرے میں چراغ سے دور بیٹھا ہے اور اسے روشنی گل کرنے کی ضرورت ہے تو وہ صرف دور ہی سے آواز نکالے گا جس سے چراغ فوراً گل ہو جائے۔ جبکہ دوسرے طبعیات دان معمولی چراغ کے گل ہو جانے کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن بڑی آگ کے بجھنے کے حوالے سے وہ دلائل سے اس امکان کی تردید کرتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں امریکہ کے ایک اور طبیعیات دان نے رقص و سرود کی ایک محفل میں شعلوں میں

آواز سے متاثر ہونے کی اہلیت کا مشاہدہ کیا۔ باجہ بجنے پر ہرتال کی آواز پر چراغوں کی لو تھرتھراتی تھی۔ ان سائنسی معلومات کے حوالے سے مصنف مولوی محمد ظفر صاحب کا کہنا تھا کہ جدید دنیا میں تو یہ باتیں اب سامنے آئی ہیں جبکہ ہندستان میں پرانے زمانے میں آواز کے اثر سے آگ لگ جاتی اور اسی آواز سے آگ بجھ جاتی تھی۔ دیپک راگ سے ایک گویا جل بھن گیا تھا۔ یہی بات ققنس جانور کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تنکوں میں بیٹھ کے مختلف راگنیوں کی آوازیں نکالتا ہے اور جب وہ دیپک راگ پر پہنچتا ہے تو ان تنکوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ جانور وہیں جل کے راکھ ہو جاتا ہے۔ [۴]

خواتین کی ہمیشہ سے کمزوری رہی ہے کہ وہ ہر عمر میں خوبصوت اور جوان نظر آنا چاہتی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ورناف کی تحقیقات کا جائزہ پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر ورناف نے ۱۳۰۰ عمل جراحی کیے۔ وہ بندروں کے غدود پرانے غدودوں کی جگہ لگا کے بوڑھوں کو جوان کر دیتے ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے عورتوں پر بھی عمل جراحی کر کے نئے غدود لگائے اور وہ جوان ہو گئیں۔ جوانی کی سی بشاشت اور باریک تنی ہوئی کھال ان میں پھر سے پیدا ہوگئی۔ ڈاکٹر ورناف کا کہنا ہے کہ ایسی عورتوں کے بچے بھی پیدا ہوسکیں گے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بیماریوں سے بچنے اور کند ذہن لڑکوں کو ذہین بنانے کے لیے بھی کامیابی سے غدود لگانے کا دعویٰ کیا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ہونے والے انہی سائنسی تجربات کا نتیجہ تھا کہ آج جگر کی ٹرانسپلانٹیشن کامیابی سے جاری ہے۔ [۵]

کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے اور حقائق سامنے لانے کی جستجو ہمیشہ سے انسان کو رہی ہے۔ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے زمین، سورج اور چاند وغیرہ کے متعلق خیالات و نظریات سامنے آتے رہے۔ کسی نے سورج کو متحرک اور کسی نے سورج کو ساکن اور زمین کو متحرک قرار دیا۔ ''سیر بین'' میں اس حوالے سے جو رپورٹ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ آج کل طبیعیات والوں نے زمین کو گول اور سورج کے گرد گھومنے والا سیارہ قرار دیا ہے۔ لیکن اب انگلستان سے ایک نئی آواز اٹھ رہی ہے کہ زمین ہرگز نہیں گھومتی گویا پرانا نظریہ پھر زندہ کر دیا گیا ہے۔ ولیم ایڈیگل ساکن ریڈسٹاک گلوسٹر شائر نے ۳۰ برس اس نظریہ کے قائم کرنے میں صرف کیے ہیں اور وہ دنیا بھر کے ہیئت دانوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ آ کر ان سے بحث کریں وہ ثابت کر دیں گے کہ زمین ساکن ہے اور سورج گھومتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قطب تارہ میرے ایک پہلو پر ہے۔ میں نے اپنے باغ میں ایک نلکی اس کی طرف

رخ کر کے دو سال تک گاڑے رکھی۔ تارہ اسی جگہ قائم ہے۔ ذرا نہیں ہلا۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمین بھی معلق نہیں ہوگی۔ ہر رات اور ہر روز دونوں اپنی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر زمین چلتی تو سورج کو پشت پر کرنے کے لیے زمین کو ۱۸ کروڑ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا۔ اگر زمین چلتی تو مختلف جھٹکوں اور زاویوں کے وقت میرا گھر اچھلتا رہتا۔ اس کے برعکس میرا گھر اسی طرح مضبوطی سے ایک ہی جگہ قائم ہے جس طرح شروع میں شاقول اور سطح مسطح کے قواعد سے بنایا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ زمین گول ہے نہ یہ گھومتی ہے۔ [۶]

جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق انسانی جسم آہستہ آہستہ مردہ ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر نے ۱۸ مرتے ہوئے آدمیوں پر اس کا تجربہ ایک ایسے آلہ سے کیا جو خفیف ترین حرکت کو بھی ظاہر کرسکتا ہے۔ بجلی کے اس آلے سے پتہ چلا کہ مرنے کی علامت پیدا ہونے کے کئی منٹ بعد تک بہت سے دل زندہ رہتے ہیں۔ ان ۱۸ آدمیوں کے مرنے کے بعد دلوں کے زندہ رہنے کی اوسط ۲/۳-۹ منٹ نکلی۔ دل کے بعض پٹھے اس سے بھی زیادہ زندہ رہے۔ جیسے جیسے ہوا اور آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے یہ آہستہ آہستہ مردہ ہوتے جاتے ہیں۔ اسی تجربے کے بعد بعض ڈاکٹروں نے بعض مرنے والوں کے دلوں میں حرکت پیدا کر کے انہیں دوبارہ زندہ کر دیا۔ یہ حرکت دل میں کسی تیز دوا کی پچکاری لگانے سے پیدا کی گئی۔ چنانچہ دل حرکت میں آ کر خون کو پھر گردش دینے لگا۔ ۱۹۲۸ء میں ہونے والے انہی تجربات کی بدولت آج بائی پاس اور ہارٹ سرجری اور الیکٹرک شاکس کے ذریعے دل کو دوبارہ حرکت کے قابل بنانا ممکن ہوا ہے۔ [۷]

آج جو باتیں حقیقت بن گئی ہیں کسی زمانے میں صرف ان کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔ چاند پر جانا بھی محض خواب تھا۔ ''سیر بین'' میں اسی حوالے سے بتایا گیا کہ پندرہ سال کے عرصہ میں آدمی چاند پر پہنچ جانے کے قابل ہو جائے گا۔ جرمنی میں تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ ایسی ہوائیاں (خلائی جہاز) بنائی جارہی ہیں جو دو تین میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گیس خارج کر سکیں گی۔ ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن گیس کو ملایا جائے گا جو اس جہاز کو تیز رفتار سے خلا میں لے جاسکیں گی۔ زمین سے چاند ۲۴۰۰۰۰ میل دور ہے۔ پہلے اس جہاز کو ڈیڑھ دو لاکھ کی بلندی تک لے جایا جائے گا پھر کامیابی ملنے پر اس کا رخ چاند کی طرف کر دیا جائے گا۔ اپنی تیز رفتاری کے باعث یہ جہاز پیرس سے نیویارک ۲۵

منٹ میں اور دنیا کے گرد آدھے گھنٹے میں گھوم آئے گا۔ چاند تک پہنچنے کے لیے جہاز ۴۵۰۰۰۰ پونڈ کی لاگت میں بنے گا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک تنظیم بنائی گئی ہے جو ستاروں پر آمدورفت کے وسائل پر غور کرے گی تا کہ لوگ دوسری دنیاؤں کا سفر کر سکیں۔ یہ انجمن مہینہ میں دو مرتبہ اجلاس بلاتی ہے۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ اگر ہم نہیں تو ہماری اولاد چاند کے سفر کے واقعات دلچسپی سے پڑھا کرے گی۔ ۱۹۳۰ء میں جو بات صرف خیالات تک محدود تھی وہ اب حقیقت کا روپ دھار چکی ہے اور انسان کائنات کی تسخیر کرتا ہوا چاند کے علاوہ باقی سیاروں تک بھی پہنچ چکا ہے۔ [۸]

سائنس وقت کے ساتھ ترقی کرتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک صحیح طور پر یہ نہیں پتہ چلایا جا سکا کہ دنیا کی ابتدا کس طرح سے ہوئی۔ ایک پروفیسر ای کریو نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلی جاندار چیز پانی میں پیدا ہوئی جسے کروڑوں برس ہوئے۔ ترقی کرتے کرتے یہ جاندار چیز سمندر سے خشکی پر آ گئی۔ پروفیسر کے خیال میں زندگی کا کسی شہاب ثاقب کے ذریعہ یا کسی غیر معلوم جگہ سے اس دنیا میں اڑ کے آنا قابل قبول نہیں۔ البتہ وہ یہ بات ماننے کے تیار ہیں کہ زندگی ستاروں، چٹانوں اور بادلوں کی طرح قدرتی طاقتوں کے باہم ملنے سے وجود میں آئی ہے۔ پروفیسر ای کریو کا کہنا ہے کہ ہم زندگی اور موت میں ہی تمیز نہیں کر سکتے۔ ایک کیڑا خشک ہو کے بے جان ہو جاتا ہے۔ بارش کا پانی پڑتے ہی وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ کیا وہ خشک حالت میں مردہ تھا؟ دریائے نیل کی مٹی سے چھوٹی چھوٹی چوہیاں پیدا ہو کے فصلوں کو خراب کرتی ہیں۔ موسمِ برسات میں چھوٹے چھوٹے مینڈک پیدا ہو جاتے ہیں۔ بیر بہوٹیاں جانے کہاں سے آ جاتی ہیں۔ کیچوے زمین سے ابل پڑتے ہیں۔ زمین کی ابتدائی حالت میں زندگی ناممکن تھی کیونکہ زمین شروع میں پگھلا ہوا سیال مادہ تھی جو بعد میں ٹھنڈا ہو کے سخت ہو گیا۔ یہ بات خارج از امکان نہیں کہ سورج کی شعاعوں کے اثر سے پانی میں ایک ذرہ حرکت کرنے لگا اور اس نے ترقی کرتے کرتے کوئی خاص شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ بعد کی خاص جاندار شکلیں پانی میں رہنے کے قابل نہ رہیں اور وہ خشکی پر آ گئیں۔ [۹]

۲۔ معاشرتی حالات/رسم و رواج

ڈاک کی ٹکٹوں کے حوالے سے دارالعوام انگلستان میں ایک عجیب سوال یہ کیا گیا کہ ڈاک کی ٹکٹوں کی پشت پر جو گوند لگایا جاتا ہے اس میں شراب کی قلیل مقدار موجود ہوتی ہے۔ یہ بات شراب

نوشی کے مخالفین کے لیے قابلِ قبول نہ تھی کیونکہ ٹکٹ زبان سے گیلے کر کے چپکانے کے عمل میں اس ناپاک چیز کا ذائقہ ان کے منہ میں جانے کا احتمال تھا۔ یہ اعتراض اس وقت رفع ہوا جب پوسٹ ماسٹر جنرل نے قطعی طور پر اعلان کر دیا کہ گوند میں کوئی ایسی چیز نہیں ملائی جاتی جس میں شراب کا ذرا سا بھی جزو ہو۔ اگر اس طرح کی چہ میگوئیاں انگلستان سے ہوتی ہوئی ہندستان کا رخ کرتیں تو مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ اس لیے ''سیر بین'' کے ذریعے اس طرح کی معلومات کی بروقت فراہمی سے ان مسائل کا تدارک ہو جاتا۔ [۱۰]

ہر ملک اور علاقے کے اپنے رسم ورواج ہوتے ہیں جو کبھی تو بہت دلچسپ اور کبھی بہت عجیب وغریب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ نیپال میں بھی شادی بیاہ کی عجیب وغریب رسمیں سامنے آئیں۔ مشرقی نیپال میں صرف گویّا ہی شادی کے لائق سمجھا جاتا ہے۔ کمبو قوم میں لڑکا لڑکی فی البدیہہ اشعار گاتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر شعر پہلے شعر سے معنی اور بلند خیالی میں بڑا ہونا چاہیے۔ اگر لڑکا یہ مقابلہ جیت کر لڑکی کو خاموش کرادے تو لڑکی اس کی ہو جاتی ہے۔ ورنہ اسے شکست کھا کر بھاگ جانا پڑتا ہے۔ جیت جانے والا لڑکا اپنے خُسر کو ایک سؤر کی لاش تحفے کے طور پر دیتا ہے۔

لڑکی کے باپ کو شادی کی خبر بھی نہیں ہوتی اور لڑکی شرماتی ہوئی دلھن کے روپ میں آتی ہے۔ دولھا ڈھول بجاتا ہے اور دلھن ناچتی ہے اور دوسرے باراتی بھی وقتاً فوقتاً ناچتے گاتے ہیں۔ دولھا نے اپنے چہرے پر رنگ ملا ہوتا ہے۔ ایک منادی کرنے والا چند روز بعد ایک سؤر کی لاش، ایک روپے اور ایک شراب کی بوتل کے ساتھ لڑکی کے والدین کو شادی کی خبر سناتا ہے جسے چاروناچار انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ [۱۱]

سائنس میں اتنی ترقی کے باوجود یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ مصری کس طرح اپنے مردوں کی ممیاں تیار کرتے تھے جس سے لاش پانچ چھ ہزار سال تک جوں کی توں رہتی ہے۔ لیکن ایک امریکی سائنس دان نے دعویٰ کیا ہے کہ اسے سالہا سال کی محنت کے بعد یہ طریقہ معلوم ہو گیا ہے۔ اس سائنس دان کے مطابق بڑے امیر آدمی اور بادشاہ ہی اس کا خرچ برداشت کر سکتے تھے۔ بادشاہ اپنی زندگی میں غلاموں سے اپنے مقبرے تیار کروا لیتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد مصالحے لگانے والے

بلوائے جاتے تھے جو اس کام کو مقدس مذہبی فریضہ کی طرح انجام دیتے تھے۔ ایسے مواقع پر دھات کے چاقو کا استعمال مذہبی جرم سمجھا جاتا تھا۔ غالباً اس کی وجہ دھات کا کھال پر اثر پڑنا ہوگا۔ پتھر کے چاقو سے پیٹ میں شگاف کر کے آنتیں نکال لی جاتی تھیں، دماغ بھی نکال لیا جاتا تھا۔ سب کو علیحدہ مصالحوں میں ڈبویا جاتا تھا اور ان کو چار مرتبانوں میں رکھ کے مقبرہ میں لاش کے ساتھ دفن کیا جاتا تھا۔ ان مرتبانوں کے ڈھکن پر انسانی سروں اور جانوروں کی شکلیں بنانا مردہ کا حق سمجھا جاتا تھا۔ مرتبانوں میں رکھنے کے بعد مصالحے کے پانی ان پر ڈالے جاتے تھے۔ ۷۰ دن تک لاش تیزابی چونے (نیٹرن) میں ڈبوئی جاتی پھر خوب دھو کے، نہایت باریک مومی کپڑے میں، مضبوط گوند سے کئی تہوں میں لپیٹی جاتی تھی۔ لاش ایک لکڑی کے صندوق میں وہ ایک اور صندوق میں اور پھر ایک تیسرے صندوق میں رکھی جاتی تھی۔ ان کے عقائد کے مطابق اب مردہ کی روح تین سے دس ہزار سال تک عالم ارواح میں گشت کرنے کے بعد اپنے جسم میں حلول کرنے واپس آئے گی۔ بشرطیکہ لاش گل نہ گئی ہو یا کسی نے اسے چھیڑا نہ ہو۔[۱۲]

۳۔ سیاسی موضوعات

ترکی کی جانب سے ایک سولہ سالہ حسین ترین لڑکی مبدجل یورپ کے مقابلۂ حسن میں امیدوار کے طور پر بھیجی گئی۔ مگر براعظم یورپ کی جانب سے ہسپانیہ کی ایک لڑکی ملکۂ حسن (مس ورلڈ) قرار دے دی گئی۔ ترکوں نے اپنے معیارِ حسن کے مطابق ایک فربہ اندام لڑکی کو منتخب کیا تھا جبکہ یورپ چھریرے بدن کو لوازمہ حسن قرار دیتا ہے۔ ترکی کی حسین ترین لڑکی کو مصطفیٰ کمال نے خود مبارکباد دی اس کے والدین کو دعوت دی اور اسے یلوا کے مقام پر اپنا مہمان ٹھہرایا۔ مصطفیٰ کمال اگرچہ ترکی کا بادشاہ نہیں تھا لیکن اس کی دعوت حکم سمجھی جاتی تھی اور کسی میں اس سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ انقرہ میں دوسرے ممالک کے وزراء کے اعزاز میں دعوت دی گئی جس میں ایک رقاصہ کے رقص سے متاثر ہو کر مصطفیٰ کمال نے نہ صرف اسے مبارکباد دی بلکہ اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گیا اور کسی سے رخصت بھی نہ چاہی۔ مصطفیٰ کمال کی حسن پرستی کے اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں لیکن ان واقعات سے لوگ اس وجہ سے صرفِ نظر کر جاتے ہیں کہ ترکی کو غیر ملکی تسلط اور استعمار سے نجات دلانے اور ایک مضبوط ملک بنانے میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مشہور شخصیات گزری ہیں جن کی نجی زندگی کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ان کے قومی کارناموں نے پردہ ڈال دیا اور وہ قوم کے ہیرو بن کے سامنے آئے۔ [۱۳]

جنگِ عظیم اوّل اور دوم کے بعد پوری دنیا ہی تباہی کے دھانے پر کھڑی تھی ایسے میں جرمنی کے ایک اخبار نے جرمنی، فرانس اور انگلستان کی گزشتہ تاریخ پر نظر ڈال کر یہ تجزیہ کرنے کی کوشش کی کہ ان تینوں ممالک میں سے کون جنگ کا زیادہ خواہش مند ہے۔ اس اخبار نے ۱۶۱۸ء سے ۱۹۱۸ء تک تین سو برس کا زمانہ لیا۔ فرانس نے اس عرصے میں ۸۹ باقاعدہ لڑائیاں کیں۔ ان میں نو آبادیات کی جنگیں شامل ہیں۔ مختلف قوموں سے ایک ہی وقت میں جو جنگیں کی گئیں ان کے برسوں کا الگ الگ حساب کرنے پر ۴۸۰ جنگ کے سال بنتے ہیں۔ انگلستان نے ان تین صوبوں میں ۵۲ جنگیں کیں۔ نو آبادیات کی جنگیں اس کے علاوہ ہیں۔ برسوں کی تعداد بلحاظ جنگ ۲۳۷ ہے۔ جرمنی نے ۳۱ لڑائیاں کیں اور ۹۲ جنگی سال بنے، اس تجزیے سے جرمنی پر لگا یہ الزام غلط ثابت ہو گیا کہ جرمنی جنگ پسند ہے۔ [۱۴]

بہت سے تاریخی واقعات بھی ''سیر بین'' کی زینت بنے۔ میسور کے آخری بادشاہ سلطان حیدر علی کے بیٹے سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے مغلوب کر کے دو کروڑ تیس لاکھ روپے کی رقم قبضے میں لی۔ اس میں سونے چاندی کے سکے، ہر طرح کے قیمتی پتھر، جواہرات، زیوارت، غلے، قیمتی کپڑے اور فوجی ہتھیار شامل تھے۔ سلطان ٹیپو کا ''شیر تخت بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اس تخت پر خالص سونے کے پترے چڑھائے گئے تھے اور یہ تخت ہیروں اور قیمتی پتھروں سے مرصع تھا۔ راجہ صاحب میسور کے لندن جانے کے بعد یہ تخت میسور کو واپس کیے جانے کا اعلان کیا گیا۔ [۱۵]

۴۔ خواتین کی اصلاح و تربیت

''نظرے خوش گزرے'' میں مولوی محمد ظفر صاحب ایم اے ایل ایل بی نے عورتوں کی مخصوص عادت بد کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ بچوں کی پیدائش کے بعد مائیں اتنی چڑ چڑی ہو جاتی ہیں کہ کوسنا ان کی نوک زبان ہو جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بچوں کو ڈھائی گھڑی کی موت کے حوالے کیا جاتا ہے۔ ان کو بے دردی سے پیٹا جاتا ہے۔ ان کو اتنی بری طرح مائیں کوستی ہیں کہ سننے

والے کا دل پگھل جاتا ہے لیکن اس کے برعکس کچھ عورتیں کثیر الاولاد ہونے کے باوجود بغیر ماتھے پر کوئی شکن لائے اپنی اولاد کی پرورش وتربیت میں مشغول رہتی ہیں۔ ولایت کی ایسی ہی ایک خاتون کے حوالے سے انہوں نے بتایا کہ بچوں کی نمائش کے موقع پر اس عورت نے اپنا اٹھارہواں بچہ پیش کیا۔ مجلس نے اس عورت کے لیے انعام تجویز کیا اور اسے ایک بہت بڑی گاڑی دی گئی۔ ان اٹھارہ بچوں میں سے پندرہ لڑکیاں ہیں اور سب بچے نہایت محبت اور پیار سے رہتے ہیں۔ اس طرح کی معلومات کی فراہمی کا مقصد برصغیر کی خواتین کو نہ صرف تربیت اطفال سے روشناس کرانا تھا بلکہ اولاد کی تربیت میں لڑکا اور لڑکی کی تفریق کیے بغیر دونوں کو یکساں سہولیات فراہم کرنا تھا۔ [۱۶]

میک اپ کے بے جا استعمال کے نقصانات سے آگاہی کے لیے ایک ولایتی نامہ نگار کی رپورٹ پیش کی گئی کہ اس نے یہ سوال اٹھایا کہ کیا وجہ ہے کہ عورتیں مردوں سے جلدی بوڑھی ہوجاتی ہیں۔ اس سوال کا جواب ایک ڈاکٹر نے یہ دیا کہ ایک وجہ تو ان کا باقاعدگی سے ورزش نہ کرنا ہے اور دوسری وجہ پاؤڈر اور رنگ وروغن (میک اپ) کے استعمال کی بیماری ہے۔ جب وہ میک اپ کرنا چھوڑ دیتی ہیں تو بوڑھی لگنے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ پاؤڈر جسم میں زہر (کیمیکل) سرایت کردیتے ہیں جس سے ہاضمہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ اس لیے حسن وآرائش کے گھریلو اور دیسی ٹوٹکوں سے فائدہ اٹھانے کا کہا گیا جو کسی بھی طرح کے مضر اثرات سے پاک ہوتے ہیں۔ [۱۷]

سادہ لوح اور معصوم خواتین کو ہر زمانے میں بیوقوف بنایا جاتا رہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ کوئی بھی ہو خواتین اور ان کی عادات ایک سی ہوتی ہیں۔ ''سیر بین'' کے ذریعے جہاں سائنسی ایجادات اور دنیا کے مختلف خطوں کے حوالے سے حیرت انگیز معلومات فراہم کی جاتی تھیں وہاں صرف گھر کی چار دیواری تک محدود خواتین کو کسی بھی قسم کے دھوکے اور فراڈ کا شکار ہونے سے خبردار کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں ہونے والی وارداتوں سے متعلق بھی آگاہ کیا جاتا تھا۔ مدراس میں ہونے والے ایک مقدمے کے حوالے سے بتایا گیا کہ مستغیث/استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ ملزم مسمریزم (ہپناٹزم) کرتا ہے اور روحانی قوت کے دعوے کرتا ہے۔ استغاثہ ملزم سے اپنے کاروبار کے مستقبل کے حوالے سے مشورہ کیا کرتا تھا۔ ایک روز ملزم نے اسے کہا کہ وہ اپنی روحانی قوت کے بل پر سو روپیہ کے ہزار روپے کرسکتا ہے۔ چنانچہ استغاثہ نے اس دعویٰ سے متاثر ہوکر اور لالچ میں آکر ۲۴ جون کو

۷۰۰ روپیہ کے نوٹ ملزم کو دیے تا کہ وہ انہیں دس گنا کر دے۔ ملزم نے ان نوٹوں کا ایک پیکٹ بنا کے اسے دیا اور کہا کہ اس میں تمہارے ۷۰۰ کے نوٹ ہیں۔ اس نے اس پیکٹ پر کچھ پڑھ کے اور پھونک کے استغاثہ کے حوالے کیا اور ہدایت کی کہ ۲۰ روز تک اسے کسی پوشیدہ جگہ رکھنا، میں خود کسی اچھے وقت میں آ کے اسے کھولوں گا تو اس میں ۷۰۰۰ روپے ہوں گے۔ ۲۰ دن گزرنے کے بعد استغاثہ نے ملزم سے اصرار کیا کہ اب وہ چل کر اس پیکٹ کو کھولے مگر ملزم نے کچھ اور صبر کرنے کا مشورہ دیا۔ استغاثہ نے چونکہ یہ روپیہ قرض لیا تھا اور قرض خواہ اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا کر رہے تھے اس لیے اس نے ملزم سے اس پیکٹ کو کھولنے کی اجازت چاہی جس پر ملزم نے اسے ۴۰۰ میل دور جا کے کھولنے کا مشورہ دیا۔ استغاثہ کے جانے کے بعد ملزم نے اس کے بھائیوں سے ۱۵۰ روپے پڑھ کے پھونکنے اور نیاز دلانے کے بہانے مانگے کہ نیاز کے بعد ملزم کا ٹونا (جادو) اس پیکٹ پر اثر کرے گا۔ استغاثہ نے ملزم پر یہ الزام لگایا ہے کہ ملزم نے دھوکا دے کر اس کا روپیہ ہتھیایا ہے۔ [۱۸]

لوگوں کی معصومت سے فائدہ اٹھانے کا اسی طرح کا ایک واقعہ گڑ گانوہ میں بھی پیش آیا۔ ایک شخص ایک سادھو سے بہت متاثر تھا۔ سادھو نے اسے کہا کہ میں چاندی کے زیور کو سونے کے زیور میں تبدیل کر سکتا ہوں اور تمہاری بیمار لڑکی پر کچھ پڑھ کر پھونکوں گا تو وہ تندرست ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک مٹی کے لوٹے میں زیور رکھ کر اس پر کچھ گارا (کیچڑ) لیپ دیا گیا۔ سادھو کے کہنے کے مطابق اسے ۲۴ گھنٹے تک زمین میں دبائے رکھنے کے بعد کھولنا تھا۔ سادھو خود چلا گیا۔ مقررہ مدت کے بعد جب لوٹا کھولا گیا تو اس کے اندر کچھ بھی نہ تھا۔ عـصـمت میں ''سیر بین'' کے ذریعے اس طرح کے واقعات پڑھ کر معصوم اور سادہ لوح خواتین کو گھر سے باہر کی دنیا کی چالاکیوں اور عیاریوں سے آگاہی ہوتی تھی اور اس قسم کے واقعات سے سبق حاصل ہوتا تھا کہ وہ کہیں لالچ میں آ کر اس طرح کی دھوکہ دہی کا شکار نہ ہو جائیں۔ [۱۹]

گجراتی عورتوں کا شراب کا انگریزی چولھا کثرت سے استعمال کرنے کے نقصانات کے حوالے سے بمبئی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ''سیر بین'' میں پیش کی گئی۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ گجراتی عورتیں انگریزی چولھے سے بہت زیادہ جلتی ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شراب اس کٹوری میں بوتل سے ڈالی جاتی ہے۔ اکثر شراب اس کٹوری سے نکل کر باہر پھیل جاتی ہے۔ شراب

میں آگ لگتے ہی آگ چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ گجراتی عورتیں چونکہ ساڑھی باندھتی ہیں اس لیے آگ ساڑھی میں لگنے سے وہ جل جاتی ہیں اور اکثر مر جاتی ہیں اور جو بچ جاتی ہیں ان کے جسم پر اس قدر آبلے پڑ جاتے ہیں کہ مدتوں بعد ٹھیک ہوتی ہیں۔ بعض اوقات صورت، شکل اور جسم بگڑ جاتے ہیں۔ آگ سے بچنے کے حوالے سے یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا کہا گیا کہ کٹوری میں شراب بوتل سے نہ ڈالی جائے۔ چولھے سے بچ کر بیٹھا جائے۔ اگر چولھا نہ جلے تو جب تک کٹوری ٹھنڈی نہ ہو جائے دوبارہ شراب نہ ڈالی جائے اور بوتل سے ڈالنے کی بجائے کسی دستہ دار (ہینڈل والی) چیز سے ڈالی جائے۔ اس رپورٹ کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں انگریزی چولھے کے نقائص سامنے آئے وہاں ساڑھی کو بھی پاجامہ کے مقابلہ میں خطرناک قرار دیا۔ اس طرح کی خبروں سے خواتین کو ہر قسم کی صورتحال اور خطرات سے نمٹنا آجاتا تھا۔ [20]

معصوم اور بھولی بھالی صنف نازک ہر دور میں عیار مردوں کے ہاتھوں کھلونا بنتی رہی ہیں۔ امریکہ میں پیش آنے والے ایک ایسے ہی واقعے کو ''سیر بین'' کے ذریعے عصمت کی معصوم خواتین قارئین تک پہنچایا گیا۔ کارل فشر نامی شخص امریکی پولیس کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس نے عورتوں کو دھوکے دے کر شادی کرنے میں کمال کر دیا۔ صرف امریکہ میں ہی اس کی ۵۳ بیویاں دریافت ہوئی ہیں اور ۲۰ شادیوں کا پتہ یورپ میں ملا ہے۔ سراغرساں مزید بیویوں کی دریافت کے لیے تفتیش کر رہے ہیں۔ فشر کا کہنا ہے کہ عورتوں کو دھوکہ دینے اور قابو میں لانے کا موثر ذریعہ یہ تھا کہ وہ ان کے سامنے اپنے نام کے ساتھ ایک خطاب کا ہونا ظاہر کرتا۔ واشنگٹن میں اس نے اپنا نام بیرن اینجل ہنگری اور بعد میں لارڈ ایڈورڈ فشر اختیار کیا۔ عورتوں کو اپنے دام میں پھنسانے کے لیے وہ اکیلی بیٹھی عورت کے پاس جا کر اس انداز سے گفتگو کرتا گویا کوئی پرانی شناسا ہو۔ اور پھر اپنی چکنی چپڑی باتوں اور امارت کے جھوٹے قصوں سے مرعوب کر کے عورتوں کو اپنا اسیر بنالیتا۔ بعض دفعہ تو کئی شادی شدہ عورتیں بھی اپنے شوہروں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ اس قسم کے واقعات سے بچاؤ کے لیے ہی اسلام خواتین کو پردے کا حکم دیتا ہے اور نام نہاد آزادی جو مغرب میں خواتین نے اختیار کی ہوئی ہے اس سے روکتا ہے۔ [21]

''سیر بین'' میں عورتوں اور مردوں کی ہنسی کا موازنہ کرتے ہوئے بہت ہی دلچسپ معلومات

پیش کی گئیں کہ مرد عورتوں کے مقابلہ میں بہت زور وشور سے ہنستے ہیں ان کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں جبکہ خواتین کی تربیت اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ اپنے جذبات کو مردوں کے مقابلے میں دبائے رکھیں۔ کم ہنسنے کی وجہ سے عورتیں اعصابی تکالیف میں زیادہ مبتلا رہتی ہیں۔ جبکہ ہنسی کی وجہ سے آدمی کے پیٹ میں بل پڑنے سے ہوا کے بڑے بڑے جھونکے پھیپھڑوں میں داخل ہو کے زور سے باہر نکلتے ہیں۔ اسی طرح قہقہہ لگانے سے گلے کی ہر آواز کے ساتھ ہوا کو زیادہ جگہ ملتی ہے اور پھیپھڑے کی خوب صفائی ہو جاتی ہے۔ اندر سانس کھینچنے کی مکمل سے مکمل ورزش بھی ایسے اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی جتنے اچھے نتائج اچھی ہنسی پیدا کر سکتی ہے۔ دل کھول کر زور سے ہنسنے سے جسم میں چستی اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور سارے خون مین تازہ ہوا بھر کے جسم کے گوشہ گوشہ میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ مفید معلومات یقیناً خواتین کے لیے لمحہ فکر یہ تھیں کہ انہیں بھی اپنی تربیت کے برعکس کھل کر ہنسنا چاہیے جو ان کی صحت کے لیے مفید ہے۔ [۲۲]

زمانۂ جاہلیت سے لے کر آج تک بہت سے مذاہب میں خواتین کو ناپاک سمجھا جاتا ہے اور انہیں عبادت گاہوں میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پہلے جاپان میں بھی کوہ کوبا پر عورتوں کو نہیں جانے دیا جاتا تھا لیکن اب اجازت دے دی گئی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جاپان میں اب کوئی ایسا مقدس مقام نہیں جہاں عورتوں کے داخلے پر پابندی ہو۔ لیکن کوہ رومائن کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہاں کے پجاری نے عورتوں کے وہاں داخلے کے لیے وہاں کے متولیوں سے بھی منظوری لے لی ہے مگر اس کے باوجود وہاں کے مرید ان مقدس حدود میں عورتوں کے داخلے کو سخت مذہبی گناہ شمار کر رہے ہیں۔ انہی فرسودہ رسوم سے آگہی دینے کے لیے عصمت کے ذریعے خواتین میں اپنے حقوق کا شعور بیدار کیا جاتا رہا۔ [۲۳]

ایشیا میں یورپ کی نقالی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ مشرقی خواتین، یورپی خواتین کی تقلید میں پیش پیش رہتی ہیں۔ انگریزی زنانہ جوتوں کی ایڑی اونچی ہونے کی وجہ سے پاؤں کا سارا وزن پنجہ پر پڑتا ہے جس سے چلتے وقت رفتار میں لچک پیدا ہوتی ہے۔ انگریزوں کی تقلید میں اونچی ایڑی کا رواج ہندستانی خواتین میں بھی پروان چڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ اونچی ایڑی کے جوتے زنانہ خوبصورتی کے لیے نہایت مضر ہیں۔

شفیلڈ میں ڈاکٹر فارمن نے لیکچر دیتے ہوئے بتایا کہ اونچی ایڑی کے جوتے ترقی کے اصولوں کے خلاف ہیں۔ ان جوتوں کی بدولت عورتوں کا سارا وزن پاؤں کے پنجوں پر آپڑتا ہے اور بہت سی خرابیوں کا باعث بنتا ہے۔ اس وزن کی وجہ سے پاؤں پھیل جاتا ہے۔ انگوٹھے کے سوا باقی پاؤں کی انگلیاں غائب ہوتی جارہی ہیں۔ ایک ہزار برس بعد امکان ہے کہ پاؤں کی انگلیاں محض نشان کی حد تک رہ جائیں گی اور پاؤں کا اگلا حصہ چوڑا ہو کر ہڈیوں کا مجموعہ رہ جائے گا۔[۲۴]

ہندستانی خواتین بچوں کے رونے اور گھریلو کام کاج میں مخل ہونے کی بنا پر بچوں کو افیم گھول کر دے دیتی ہیں تاکہ بچہ بے ہوش پڑا رہے اور وہ آرام سے اپنے سب کاموں سے فارغ ہو جایا کریں۔ اس عمل سے بچے اتفاقیہ افیم کی زیادتی سے مر جاتے ہیں۔ اکثر بچے افیم کے اثر سے طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ جنیوا میں عورتوں کی انجمن امن و آزادی کا جلسہ ہوا۔ اس میں ہندستان کی نمائندہ بی بی نے بتایا کہ ہندستان میں ہر ہزار بچوں میں ۴۴۶ بچے پہلے سال ہی اپنی ماؤں کی افیم دینے کی بدعادت کی وجہ سے لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔[۲۵]

''سیر بین'' میں ہندستان میں غربت زیادہ ہونے کی وجہ عورتوں کا مردوں کے کام میں ہاتھ نہ بٹانا بتائی گئی۔ اس وجہ کو دور کرنے کے لیے پنجاب میں عورتوں کو صنعتی تعلیم دینے کے لیے بارہ مدارس کھولے گئے جہاں سے ۲۱۲ طالبات فارغ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر گھر والوں کی بھی کفالت کر رہی ہیں۔ ان سرکاری مدارس کے نام بھی بتائے گئے تاکہ جو خواتین وہاں سے تعلیم حاصل کرنا چاہیں انہیں مشکل پیش نہ آئے۔ ان مدارس کے نام یہ تھے۔

۱۔ گورنمنٹ زنانہ انڈسٹریل سکول، لاہور
۲۔ لیڈی مینار انڈسٹریل سکول، لاہور
۳۔ مارگریٹ اردنگ انڈسٹریل سکول، انبالہ
۴۔ میونسپل انڈسٹریل سکول فار گرلز، لدھیانہ
۵۔ سرسوتی گرلز انڈسٹریل سکول، امرتسر
۶۔ دار الخواتین انڈسٹریل سکول، امرتسر
۷۔ آریہ سماج انڈسٹریل سکول، ملتان

۸۔ مجلس امداد نسواں صنعتی سکول، لائلپور
۹۔ سی ایم ایس انڈسٹریل ہوم، لاہور
۱۰۔ گورونانک انڈسٹریل سکول، جیٹھووالی
۱۱۔ مسلم گرلز انڈسٹریل سکول، پانی پت
۱۲۔ سناتن دھرم انڈسٹریل سکول، لاہور

ان مدارس میں سکھائے جانے والے کورسز کی تفصیل بھی ''سیر بین'' میں بتائی گئی۔[۲۶]

آزادی کی جنگ اور حقوق کے حصول کی دوڑ میں خواتین نے بہت کچھ کھو بھی دیا ہے۔ محترمہ فاطمہ بیگم منشی فاضل نے ترکی کی سیاحت کے دوران خواتین کو اپنی موجودہ زندگی سے ناخوش پایا۔ وہ اپنی اس سابقہ زندگی کو حسرت سے یاد کرتی ہیں جب وہ گھر کے سیاہ وسفید کی مالک بن کر راج کرتی تھیں اور مرد کما کر لا کر ان کے سپرد کرتا تھا۔ اب مرد وخواتین دونوں کے کمانے کے باوجود گزر بسر محال ہے۔[۲۷]

۵۔ خواتین کے نمایاں معاشرتی کردار کا اعتراف

خواتین میں تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کے لیے مختلف ممالک کی تعلیم یافتہ خواتین کی نمایاں خدمات کو ''سیر بین'' کی زینت بنایا جاتا رہا۔ ایسی ہی ایک خبر نیوزی لینڈ کے حوالے سے دی گئی جہاں نابیناؤں کے مدرسہ سے ایک نابینا لڑکی نے ایم اے کے امتحان میں دوسرے درجے میں کامیابی حاصل کی۔ اور وہ پہلی نابینا لڑکی تھی جس نے اس ملک میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔[۲۸]

''سیر بین'' ہندستانی خواتین کی نہ صرف تفریحِ طبع کا ذریعہ تھا بلکہ یورپین خواتین کے حیرت انگیز کارناموں اور جرأت مندانہ اقدامات سے ہندستانی خواتین میں بھی کچھ کر گزرنے کا شوق اور تحریک پیدا ہوتی تھی۔ ایسی ہی ایک خبر لندن کے حوالے سے دی گئی کہ لندن میں اس وقت ایک ہزار عورتیں ایسی ہیں جن کی سالانہ آمدنی ایک ہزار پونڈ سے زیادہ ہے۔ حوصلہ مند خواتین ترقی کر کے مردوں کے میدان پر بھی طبع آزمائی کر رہی ہیں۔ صرف ٹائپسٹ یا کسی دکان کی ملازمہ بننے تک اب خواتین محدود نہیں رہیں۔ پہلے خواتین خاموش فلموں اور ڈراموں میں بڑی بڑی تنخواہیں لے رہی تھیں

لیکن اب وہ بڑے بڑے کارخانوں میں اعلیٰ عہدوں پر اپنی ذمہ داریاں سرانجام دے کر ہزار ہزار مارک تک معاوضہ وصول کر رہی ہیں۔ اوران میں سے بیشتر خواتین ایسی ہیں جو آہستہ آہستہ ترقی کے مدارج طے کر کے موجودہ مقام تک پہنچی ہیں۔ ایک کارخانے کی مالکائیں ایسی دو خواتین ہیں جو پہلے ادنیٰ خادمائیں تھیں۔ یورپ میں اب آدھے سے زیادہ ہوٹلوں کا انتظام عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ تعمیر، پیمائش، ریاست کے کاموں کے ساتھ ساتھ زیب و زینت کی ایجنسیاں بھی عورتیں، مردوں کی نسبت زیادہ کامیابی سے چلا رہی ہیں کیونکہ انہیں یہ معلوم ہے کہ کونسی چیزیں کمروں کی زیادہ زیبائش کا باعث ہیں۔ (۱۰۰) سو عورتیں تجارت کے کاروبار کے لیے سفر کا کام انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹری کے پیشہ میں بھی آمدنی زیادہ ہونے کے باعث بہت سی عورتیں اس میں بھی شریک ہوگئی ہیں۔ لیکن اس ضمن میں خواتین کو بڑی دقت یہ محسوس ہو رہی ہے کہ ڈگری لینے کے لیے پانچ سال خرچ اور سالانہ سینکڑوں مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

مویشی شفاخانوں میں بھی عورتیں بڑی بڑی تنخواہیں حاصل کر رہی ہیں کیونکہ اس کی تعلیم میں صرف ۳۰ پونڈ سالانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ کتوں اور دیگر مویشیوں کی نسل کشی میں بھی عورتیں حصہ لے رہی ہیں اور اخبار نویسی اور اشتہار بازی میں بھی عورتیں مردوں پر سبقت لے رہی ہیں۔ یورپی خواتین کی اس حوالے سے ترقی دیکھ کر ہندستانی خواتین بھی زندگی کی شاہراہ پر مردوں کے مدمقابل آنے کی جسارت کرنے کے قابل ہوئیں اور صرف گھریلو زندگی گزارنے کی بجائے انہیں زندگی کے اور مصارف بھی نظر آنے لگے تھے۔ [۲۹]

ارل آف سٹیفورڈ کی بہن لیڈی ریچل کو خرگوشوں کا باڑہ بنانے کا شوق تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ملک میں ایک نیا معاش متعارف ہو جائے گا۔ چنانچہ جگہ جگہ ایسے باڑے بن گئے جن سے لوگ ہزار ہا روپیہ ہر سال کماتے ہیں۔ ان کی یہ تجویز بڑی بیش قیمت اور کارآمد ثابت ہوئی۔ شہزادی میری کی نند مسز ایڈورڈ نے بھی ایک ایسا ہی اعلیٰ قسم کا باڑہ قائم کیا ہوا ہے۔ سر برنسبی کو بھی ساری عمر جنگی جہازوں کے نقشے بنانے کا خبط رہا۔

ہمت مرداں مدد خدا کا قول اس وقت سچ معلوم ہوتا ہے جب عورت جیسی صنف نازک بھی اپنی ہمت کے بل بوتے پر ساری دنیا کے سامنے ڈٹ کر فاتح ٹھہرے۔ مسز کیمبل کناڈا کی رہائشی

تھیں۔ باپ کے فوت ہونے کے بعد ماں کی دماغی حالت خراب ہونے کی وجہ سے جائیداد ایک انجمن کے سپرد ہوئی جو ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۲ء تک اس کا انتظام سنبھالتی رہی۔ منیجر نے حساب کتاب کے متعلق کچھ کاغذات عدالت میں منظوری کے لیے پیش کئے لیکن مسز کیمبل نے ان کی مخالفت کی۔ عدالت نے انہیں صرف ۲۰۰ پونڈ معاوضہ دیا لیکن انہوں نے یہ معاوضہ قبول نہیں کیا اور کناڈا کی ساری عدالتوں میں ہارتی چلی گئی۔ صنف نازک ہونے کے باوجود بڑی بہادر خاتون تھیں کہ سلطنتِ انگریزی کی سب سے بڑی عدالت پریوری کونسل میں اپیل دائر کر دی۔ اس کا مقدمہ سات دن تک چلتا رہا جس میں سے تین دن سے زیادہ تو وہ خود اپنے دعوے کے حق میں بحث کرتی رہیں۔ مقدمہ کے خاتمہ پر پریوری کونسل کے فاضل جج صاحبان نے ان کی تعریف کی کہ وہ پہلی عورت ہے جو اس کونسل کے سامنے پیش ہوئی اور اپنا مقدمہ جیت گئی۔ [۳۰]

زمانۂ جاہلیت سے لے کر آج کے انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی خواتین کو مردوں سے کمتر ہی سمجھا جاتا رہا ہے اور ہر دور میں خواتین اپنے حقوق کی جنگ لڑتی رہی ہیں۔ حق رائے دہی کے لیے ووٹ دینے کا حق بھی خواتین کے پاس نہیں تھا۔ ۱۹۳۲ء میں پارلیمنٹ کے انتخاب کے موقع پر ترکی حکومت نے خواتین سے وعدہ کیا کہ انہیں رائے دینے کا حق حاصل ہوگا اور یہ حق بعد میں بھی قائم رہے گا۔ قانونی مدرسہ (وکالت) میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات نے ایک درخواست دائر کی ہے جس میں انہوں نے مؤقف پیش کیا ہے کہ وہ محض وکیل بننے پر قانع نہیں رہ سکتیں انہیں جج کے عہدے بھی ملنے چاہئیں۔ یہ درخواست وزارتِ قانون کے پاس رائے کے لیے بھیج دی گئی ہے۔ ترکی میں خواتین کی مجلس میں یہ طے پایا ہے کہ خواتین اس وقت تک اپنے حقوق کی جنگ لڑتی رہیں گی جب تک انہیں ان کے حقوق اور مطلوبہ عہدے حاصل نہ ہو جائیں جو مردوں نے صرف اپنے لیے مختص کر رکھے ہیں۔ [۳۱]

''سیر بین'' میں یورپی خواتین کے حوالے سے معلومات ہندستان کی خواتین میں بھی زندگی کے ہر شعبے میں آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا کرتی تھیں۔ ایک ۱۹ سالہ انگریز لڑکی راس گرسنیز نے رات ۱۰ بج کر ۳۵ منٹ پر تیرنا شروع کیا۔ وہ رودبار انگریزی (دریا) کو تیر کر پار کرنا چاہتی تھی۔ نو گھنٹے تیرنے کے بعد وہ ساحل انگلستان سے ۲/۱-۶ میل آ پہنچی۔ ساحل تین میل کی مسافت تک رہ گیا تھا کہ دھند

آ گئی اورلڑکی کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ وہ ۱۲ گھنٹے پانی میں رہی اگر دھند اس کا راستہ نہ روکتی تو وہ مس ایڈرلی کا ریکارڈ توڑ دیتی جو دو بار اس دریا کو عبور کرنے کا اعزاز حاصل کر چکی ہیں۔ [۳۲]

عموماً عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے اور مرد کے مقابلے میں کمتر اور کمزور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ جب عورتوں نے مردوں کا روپ دھار کر بڑے بڑے کام کیے اور مرتے دم تک ان کی اصلیت کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ ایک انگریز خاتون نے مردانہ بھیس بدل کر اتنی ترقی کی کہ وہ فوج کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچ گئی۔ مردانہ ہاسپٹل اسسٹنٹ کے طور پر وہ فوج میں بھرتی ہوئی۔ ۱۸۱۸ء میں اسسٹنٹ سرجن ۱۸۲۷ء میں سرجن میجر ۱۸۵۱ء میں ڈپٹی اسسٹنٹ جنرل اور ۱۸۵۸ء میں انسپکٹر جنرل ہو گئی اور ۱۸۵۹ء میں نصف تنخواہ پر پنشن ہو گئی۔ وہ جمس میری کے مردانہ نام سے مشہور تھی۔ سرکاری کاغذات میں اسے نہایت لائق آدمی قرار دیا گیا ہے۔ آواز میں کچھ نسوانیت پائی جاتی تھی۔ بال سرخ تھے، رخسار کی ہڈی اٹھی ہوئی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں جب وہ فوت ہوئی تو اس نے وصیت کی کہ اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم نہ کیا جائے جب تجسس بڑھا تو تفتیش سے پتہ چلا کہ وہ خاتون تھیں۔ اس کے صرف ایک حبشی ملازم کو اس کے عورت ہونے کا راز معلوم تھا۔ [۳۳]

خواتین ہر زمانے میں معاشی طور پر مردوں کا ہاتھ بٹاتی رہی ہیں اور اس دوران انہیں چاہے کیسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مردانہ وار حالات کا سامنا کرتی رہی ہیں۔ قدیم زمانے سے اپورٹو (پرتغال) کی خواتین صنوبر کی شاخوں کے بڑے بڑے گٹھے کشتیوں سے مال گودام تک اپنے سروں پر لاد کے لے جاتی تھیں۔ وہاں کے حاکم نے خواتین کے لیے یہ کام مناسب نہ سمجھ کر اس پر پابندی عائد کر دی۔ مگر عورتوں کے اصرار پر کہ ان کا ذریعہ معاش ان سے نہ چھینا جائے مجبوراً دوبارہ اس شرط پر کام کرنے کی اجازت دی کہ زنانہ کاروبار کی صورت پیدا ہوتے ہی وہ یہ کام چھوڑ دیں گی۔ [۳۴]

مدرسہ دار التجارت آکسفورڈ میں مسٹر بیسٹ نے بتایا کہ بیس سال کے عرصے میں خواتین نے اپنے حقوق حاصل کر لیے ہیں۔ جن محکموں میں صرف مرد چھائے ہوئے تھے اب وہاں عورتیں حکمرانی کر رہی ہیں اور ان بیس سالوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں نے زیادہ مہارت اور قابلیت کا

ثبوت دیا ہے۔ ایک طالبہ کے پوچھنے پر کہ ممتاز عہدے خواتین کے حوالے کیے جانے پر تجارت کو کتنا فائدہ ہوگا؟ مسٹر بیسٹ نے بتایا کہ تجارت میں عورتوں کی انتظامی قابلیت عروج پر ہے اور میں ایک درجن انتظامی بڑے عہدوں والی خواتین کے نام گنوا سکتا ہوں۔

فرانس میں بیرسٹر عورتیں اتنی کثیر تعداد میں ہیں جو کسی اور ملک میں نظر نہیں آتیں۔ ان میں زیادہ تر کم سن لڑکیاں ہیں لیکن ان کی قابلیت مقدمہ کے دوران سامنے آتی ہے جب وہ اپنے حریف وکیل سے جرح کرتی ہیں اور انہیں لاجواب کرتی ہیں۔ قانونی نکات نکالنے اور بال کی کھال کھینچنے میں وہ کسی سے کم نہیں عوام میں بھی یہ خواتین بہت مقبول ہیں اسی لیے ان کے پاس مقدمات کی کثرت ہوتی ہے۔ ''سیر بین'' میں مغربی ممالک کی خواتین کی کامیابی کے قصے عصمت کی قاری خواتین کے لیے کمک کا کام کرتے تھے اور ان میں بھی کچھ کر دکھانے کی تحریک پیدا ہوتی تھی۔ [۳۵]

خواتین ہر محکمہ میں ہی نام کماتی رہی ہیں۔ قراقرم کی مہم میں بھی ایک خاتون سٹیل ڈبرنغرتھ شامل تھی۔ پہاڑ پر ۲۲ ہزار فٹ کی بلندی تک وہ مردوں کے شانہ بشانہ گئی۔ اس سے پہلے کوئی خاتون اتنی بلندی تک نہیں گئی۔ [۳۶]

جیسے جیسے خواتین میں شعور بیدار ہوتا گیا وہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں اپنی خدمات سرانجام دینے لگیں۔ ترکی کے شہروں استنبول اور انقرہ میں ۱۵ عورتیں مجسٹریٹ، ۱۲ وکیل، ۸ ڈاکٹر، ۵ کیمیادان، ۴ میونسپل کمشنر، ۲۰ یونیورسٹی پروفیسر، ۸۰۰ مختصر نویس اور ٹائپ نویس سرکاری محکموں میں کام کر رہی ہیں۔ ۲۰ ہزار سے زیادہ خواتین ان دونوں شہروں کے کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ سمرنا، ادانہ، ریبیزند اور سمسون میں خشک میوہ وغیرہ کے کارخانوں میں کام کرنے والی خواتین کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ''سیر بین'' میں شائع ہونے والے دنیا کے مختلف ممالک کی خواتین کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں خدمات کے واقعات ہندستانی خواتین میں بھی کچھ کر دکھانے کا جذبہ پیدا کرتے اور ان میں یہ احساس پیدا کرتے کہ وہ بھی مردوں سے کسی طرح کم نہیں اور ان کے شانہ بشانہ کام کر سکتی ہیں۔ [۳۷]

مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین نے سیاست میں بھی قدم

رکھنے شروع کر دیئے۔ ٹرکی دارالشوریٰ میں ۳۹۹ نمائندے ہیں۔ اس مرتبہ ان میں ۱۷ خواتین بھی منتخب ہوئی ہیں سب سے چھوٹی ۳۱ سالہ اور سب سے بڑی ۵۰ سالہ ہے۔ پانچ یا چھ خواتین ۳۳ اور ۳۸ سال کے درمیان میں ہیں۔ ۵۰ سالہ خاتون نے ۳۰ سال تعلیم کے شعبے میں خدمات سرانجام دی ہیں۔ ۳۱ سالہ خاتون ڈاکٹر ہے۔ یہ سب خواتین مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں۔ بارہ خواتین اساتذہ ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹرکی کی خواتین عرصہ دراز سے شعبۂ تعلیم میں کام کر رہی ہیں۔ ان خواتین میں سے زیادہ تر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ کچھ نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اور چند نے پیرس یونیورسٹی اور کچھ نے استنبول کے گرلز امریکی کالج میں تعلیم حاصل کی ہے۔ بعض خواتین غیر ملکی زبانیں سکھاتی ہیں۔ عــصــمــت کی قاری خواتین کے لیے یہ معلومات یقیناً کچھ کر دکھانے کی تحریک دینے کا باعث بنتی تھیں۔ [۳۸]

خواتین کو روس نے دورانِ جنگ مردوں کے برابر حقوق دیئے۔ ۱۹۳۴ء میں ۲۰ ہزار خواتین فوجی تربیت کے لیے گئیں۔ ۴ لاکھ ۶۰ ہزار بندوقوں کی نشانہ بازی میں ماہر بنائی گئیں۔ پچاس ہزار کو ہوائی جہازوں کے پرزے بنانے اور درست کرنے کی تربیت دی گئی۔ سینکڑوں کو ہوائی جہاز چلانا سکھایا گیا۔ ۲۳۸۳ خواتین کیمیائی طریقوں سے ملک کی حفاظت پر تعینات کی گئیں۔ [۳۹]

خواتین جہاں باقی تمام شعبہ جات میں کام کر رہی ہیں وہاں انہوں نے ڈاکٹری کے میدان کو بھی پیچھے نہیں چھوڑا۔ برطانیہ میں ڈاکٹروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں ۵۷۴۹۶ ڈاکٹر رجسٹر تھے۔ اس سے اگلے سال ان میں ۱۶۶۴ ڈاکٹروں کا اضافہ ہوا۔ ان میں دس فی صد ڈاکٹر خواتین ہیں اور لوگ خواتین ڈاکٹرز کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ [۴۰]

یوگوسلاویہ کے دارالسلطنت بلغراد میں گزشتہ ۱۴ سال میں خواتین ۲/۵ حصہ جائیداد کی مالک ہو گئیں۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی ملکیت صرف ۶ فی صد تھی۔ اب ۴۰ فی صد سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خواتین کے حقوق تسلیم کر لیے گئے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جائیداد بیویوں کے نام منتقل کر کے شوہر حضرات نہ صرف ٹیکس سے محفوظ رہتے ہیں بلکہ کسی جائیداد کا مالک نہ ہونے کے باعث انہیں تنخواہ بھی زیادہ ملتی ہے۔ [۴۱]

پولینڈ میں زنانہ پولیس کا ایک دستہ تیار کیا گیا ہے جس میں وہی لڑکیاں بھرتی کی جاتی ہیں جو گریجویشن کر چکی ہوں۔ یہ لڑکیاں بھرتی ہونے کے بعد سات سال تک شادی نہیں کر سکتیں ورنہ افسر کے رینک سے محروم ہو جائیں گی اور پنشن بھی نہیں ملے گی۔ یہ خواتین مشہور جاپانی ورزش جیوجستو میں ماہر ہوتی ہیں۔

روس میں بھی خواتین روز بروز ترقی کر رہی ہیں۔ وہاں پہلی دفعہ ایک بحری جہاز کی کپتان ایک خاتون انا شیطینیہ ہے جو اوڑیسہ سے مال واسباب لے کر ۵۸ دن کے سفر پر کیمسکٹیکا (بحیرہ اسود سے بحرالکاہل) گئی ہے۔ یہ جہاز چند ماہ پہلے جرمنی سے خریدا گیا اور اسی وقت اس خاتون کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ اس جہاز میں تیس مرد اور کچھ خواتین مسافر سوار ہیں۔

ہنگری میں ایک ۲۱ سالہ لڑکی پادری مقرر ہوئی ہے۔ عیسائیت کی تاریخ میں پہلی لڑکی ہے جسے یہ مقدس کام سونپا گیا ہے۔ ''سیر بین'' میں خواتین کے ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے یہ واقعات ہندستانی خواتین کے لیے بھی مشعلِ راہ ثابت ہو رہے تھے اور خانگی معاملات کے ساتھ ساتھ ملکی امور اور معاملات میں بھی انہیں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔[۴۲]

۱۹۳۵-۱۹۳۴ء کی تعلیمی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ صوبہ سرحد میں ۱۵۵ زنانہ مدارس ہیں جن میں سے ۸۴ مدارس میں اردو، ۳۸ میں ہندی، ۲۰ میں گورمکھی اور ۱۳ میں متعدد زبانوں کے ذریعے درسی تعلیم دی جاتی ہے۔ سرکاری ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹیوں کے مدارس میں زیادہ تر اردو کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے گویا ۵۹۴۸ لڑکیاں اردو میں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ لڑکوں کے مدارس میں بھی ذریعۂ تعلیم اردو ہی ہے گویا ۹۰ فی صد طلباء کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے جو ایک خوش آئند بات ہے۔[۴۳]

چوتھائی صدی قبل انگلستان میں خواتین کو حقِ رائے دہی حاصل نہیں تھا۔ مس پنکھرسٹ نامی ایک نوجوان دوشیزہ نے ۱۹۰۳ء میں اپنی ماں اور بہنوں کو ابھار کے اس حق کے لیے جدوجہد شروع کی۔ گرفتار ہوئی، قید ہوئی، کھانا پینا چھوڑ دیا جب مرنے کے قریب پہنچنے لگی تو اسے رہا کیا گیا لیکن اس طرح وہ اپنے ملک کے حکمرانوں سے جنگ میں مصروف ہوگئی، بارہا گرفتار ہوئی۔ آخر جنگ عظیم کی وجہ سے تمام خواتین سب بھول کر ملک وقوم کی خدمت میں مصروف ہوگئیں۔ آخر جنگ میں ان کی قربانیاں دیکھ کر انہیں رائے دینے کا حق دینے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے حقوق دے دیئے

گئیے۔[44]

حقوق نسواں کے ساتھ ساتھ مختلف ممالک میں تعلیم نسواں کی شرح بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ بنگالہ میں کل زنانہ آبادی میں ۲۷ فیصد عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔۳۴-۱۹۳۳ء میں ۶۹ زنانہ ہائی سکول تھے جن میں ۱۸۰۰۰ لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور ۱۵۲ مردانہ مدارس میں ۲ لاکھ ۴۷ ہزار لڑکے پڑھتے تھے۔لڑکیوں کے ۸۷ اور لڑکوں کے ۱۸۱۷ مڈل سکول تھے۔اگرچہ یہ اعداد وشمار خوشگوار نہیں مگر خواتین کا تعلیم کی طرف مائل ہونا ہی ایک بڑی کامیابی کا آغاز تھا۔[45]

ہسپانوی خواتین نے بھی زمانے کے ساتھ کافی ترقی کر لی ہے۔میڈرڈ کی خواتین دفاتر میں ملازمت کر رہی ہیں۔ڈاکٹری، وکالت اور انجینئرنگ کے شعبہ جات میں کام کر رہی ہیں۔پارلیمنٹ میں ۱۹۳۱ء میں صرف تین خواتین امیدوار تھیں اب ان کی تعداد پانچ ہوگئی ہے۔اس کے ساتھ میڈرڈ میں خواتین اب بہت سے کھیلوں کے مقابلوں میں بھی شریک ہونے لگی ہیں۔سینکڑوں لڑکیاں گرمی میں تیراکی اور سردیوں میں برف پر اسکیٹنگ کرتی ہیں۔۲۵ سال پہلے تعلیمی اداروں میں موجود خواتین کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی جبکہ اب فلسفہ وعلم وادب کے شعبوں میں ان کی تعداد مردوں سے بھی زیادہ ہے۔اب خواتین کو حق رائے دہی بھی حاصل ہو گیا ہے اور صرف میڈرڈ میں ہی خواتین رائے دہندگان کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔پہلے کوئی ایک دو خواتین کسی علمی شعبے میں ماہر نظر آتی تھیں۔اب تو ہسپانیہ کے طول وعرض میں ایسی خواتین بھری پڑی ہیں۔یہ خواتین یقیناً ہندستانی خواتین کے لیے بھی ایک مثال تھیں۔[46]

زار کے زمانۂ حکومت میں روسی عورت کو لونڈی کا درجہ دیا جاتا تھا۔انہیں کسی قسم کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔مالدار خواتین پھر کچھ وقعت رکھتی تھیں مگر عام طبقے کی خواتین بری طرح پس رہی تھیں۔کسانوں میں ایک عام کہاوت تھی کہ انہیں شراب پی کر بدمست ہو جانے اور اپنی بیوی کی خوب پٹائی کرنے کے حقوق حاصل ہیں۔نہ وہ شادی کی زنجیر توڑ سکتی تھیں نہ کسی قسم کے کھیل میں شریک ہوسکتی تھیں لیکن اشتراکی نظام آنے سے ان خواتین کی حالت یکسر بدل گئی ہے۔لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر تعلیم دی جاتی ہے۔وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوگئی ہیں۔

طلاق کے برابر مواقع حاصل ہیں اور تمام قسم کے کھیلوں میں حصہ لیتی ہیں۔ یہ سب یقیناً ان کی برسوں کی جدو جہد کا حاصل ہے۔ [۴۷]

جرمنی کی خواتین کے حوالے سے یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ وہ غلامانہ زندگی بسر کر رہی ہیں۔ درحقیقت انہوں نے اپنا اصلی مقام پہچان لیا ہے کہ وہ قدرت کی طرف سے مخصوص کردہ اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی سے ادا کر کے اپنے ملک وقوم کی خدمت کر سکتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے قومی ماؤں کی تحریک شروع کی ہے۔ ہر شہر میں ایسے مدارس قائم کیے گئے ہیں جن میں ہر اٹھارہ سال سے زائد عمر کی خاتون کو حاضر ہونا پڑتا ہے۔ گاؤں میں معلمات جا کر خواتین کو بچوں کی پرورش، تعلیم اور امور خانہ داری کے حوالے سے تربیت دیتی ہیں۔ جرمنی خواتین کاروبار، ریڈیو، فلم، اقتصادیات، طبابت اور تعلیم تمام شعبوں میں برابر کی شریک ہیں البتہ یونیورسٹی میں موزوں لڑکیوں کے علاوہ اندھا دھند داخلے ممنوع ہیں کہ اس سے خانہ داری کو نقصان پہنچتا ہے اور ایسی خواتین تعلیم حاصل کر کے ملک وقوم کے لیے بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوتیں۔ [۴۸]

تاریخ میں بعض خواتین نے بادشاہوں تک پر اپنا اقتدار قائم کر کے اپنا نام سنہری حروف میں لکھوایا ہے۔ آج بھی یورپ میں بعض خواتین مردوں کو اپنے قابو میں کیے ہوئے ہیں۔ جرمنی میں سکولٹز کلنک دو کروڑ ۳۰ لاکھ خواتین کو تربیت دیتی ہے۔ ہٹلر تک کو اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔
فرانس میں میڈم پول ڈوپائی کے تسلط میں بارہ اخبار ایک ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اس کے ایک اخبار کی اشاعت کروڑوں میں ہے۔ اخبارات کے کالموں اور ریڈیو اسٹیشن کے ذریعے وہ فرانسیسیوں کے خیالات اپنی سوچ کے مطابق ڈھالتی ہے اور یہ سب کچھ وہ ایک ایسے ملک میں کر رہی ہے جہاں ایک سال پہلے تک خواتین ووٹ دینے کے حق سے بھی محروم تھیں۔ [۴۹]

۶۔ محیر العقول واقعات کا بیان

جہاں دنیا ترقی کر رہی تھی اور نت نئی حیرت انگیز ایجادات سامنے آ رہی تھیں وہاں روحانیت اور توہم پرستی کا شکار لوگ اپنے عقائد پر پختہ تھے۔ میجر پرٹیسٹ جو کہ ایک قید خانہ کا منتظم تھا اس نے یقینی طور پر خود سے وابستہ دو واقعات بتائے کہ روحیں آئیں اور انہوں نے مادی جسم اختیار کر کے اپنے

آپ کو ظاہر کیا۔ ایک قیدی کا باپ دوسری دنیا سے آیا اور مادی جسم میں اپنے بیٹے کے سامنے ظاہر ہوا اسی طرح ایک شوہر اپنی بیوی کے سامنے ظاہر ہوا اور اس نے اس کے دونوں گالوں کو چوما۔ ایک روح ریل کے ملازموں کا لباس پہنے ہوئے تھی کیوں کہ وہ شخص اپنی زندگی میں ریلوے میں ملازم تھا۔ [۵۰]

''سیر بین'' میں جہاں زمین پر موجود مخلوقات کے حوالے سے معلومات دی جاتی تھیں۔ وہاں سطح سمندر کے نیچے موجود مخلوقات کا ذکر بھی ''سیر بین'' کا حصہ بنتا رہا۔ سمندر میں موجود عجیب و غریب مخلوق کے حوالے سے بتایا گیا کہ سمندر میں بھی زمین کی طرح کی مخلوق رہتی ہے۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ اس مخلوق کو مرد ماہی اور نار ماہی کا نام دیا گیا۔ مرد ماہی کے حوالے سے بتایا گیا کہ وہ کم نظر آتا ہے کیونکہ وہ گھبراتا بہت ہے جبکہ اس کی مادہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے اور ایک وقت میں ایک ہی بچہ ہوتا ہے۔ مادہ اپنے بچہ کو گلپھڑوں کے نیچے اٹھائے اٹھائے پھرتی ہے اس مخلوق کے چہروں پر بالکل انسانی جھلک پائی جاتی ہے۔ سمندر کے اندر کی سبزی یعنی بحری گھاس ان کی خوراک ہے۔ ان کا طول ۸ اور ۲۰ فٹ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس قسم کی ایک مچھلی چند ماہ ہوئے جزیرہ زیفنیہ سے پرے پکڑی گئی تھی۔ [۵۱]

اسی عرصہ میں ایک نار ماہی (بنت البحر) بھی سمندر سے پکڑی گئی اس کی ناک حبشیوں کی طرح چپٹی تھی اس کی نہ زبان تھی نہ دانت۔ سر پر بالوں کے گچھے تھے۔ آنکھیں بالکل انسانی تھیں۔ ٹھوڑی بڑی اور بھاری تھی، بازو پھیلے ہوئے اور چپٹے تھے۔ انگلیوں میں جھلی تھی اور ٹانگوں کی بجائے ایک لمبی چوڑی دم تھی۔ یہ نار ماہی گیارہ فٹ لمبی اور دس من وزنی تھی۔ اس کی کھال موٹی اور بھوری اور نیچے کا حصہ سرخ و سفید تھا اور اس کے باطنی اعضا انسانی تھے، خون انسان کی طرح گرم تھا۔ جب اسے پکڑا گیا تو وہ چیخ چیخ کے روئی اور تین گھنٹے بعد مر گئی۔ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی انسانوں کی عبرت کے لیے اس طرح کی مخلوقات کے ذریعے اپنی قدرت کے جلوے دکھاتا ہے تاکہ انسان جو زمین پر خدا بننے کی کوشش کرتا ہے اس سے کچھ سبق سیکھے۔ [۵۲]

مختلف ممالک کے اپنے اپنے نظریات اور عجیب و غریب عقائد اور توہمات ہوتے ہیں۔ جاپان میں یہ عقیدہ ہے کہ سارس ہزار برس کی عمر تک زندہ رہتا ہے اور کسی کے باغ میں اس کی سکونت

باغ والے کی خوش نصیبی کی ضامن سمجھی جاتی ہے اور جس کے باغ میں سارس انڈے دے اور ان میں سے بچے نکل آئیں تو اس کی خوش قسمتی میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔ کچھ ایسی ہی خوش نصیبی شاہِ جاپان کے حصے میں آئی۔ شاہِ جاپان کے باغ میں بیریوں کے کنج میں ایک سارس کے جوڑے نے دو انڈے دیئے۔ سپاہیوں نے ان انڈوں کی بڑی حفاظت کی۔ آخر ان میں سے دو بچے نکل آئے۔ جاپان کے عقائد کے مطابق اس طرح شاہِ جاپان ہیرو ہیٹو کی طویل اور کامیاب خوش وخرم زندگی کی ضمانت مل گئی۔ یہ خوشخبری ملنے پر بادشاہ اپنی ملکہ اور ننھی بچی کے ساتھ اس کنج میں آیا اور اس سارس کے جوڑے کے سامنے سب دست بستہ جھک کر کھڑے ہو گئے۔ [۵۳]

اللہ تعالیٰ بھی اپنی قدرت کے کیا کیا رنگ دکھاتا ہے تا کہ انسان خود کو خدا سمجھنا چھوڑ دے۔ ایک حبشی لڑکی کی نظر عجیب قسم کی ہے۔ اسے ہر چیز الٹی دکھائی دیتی ہے۔ کتاب الٹی رکھنے پر لفظ سیدھے نظر آتے ہیں۔ فرش چھت اور چھت فرش دکھائی دیتا ہے۔ انسان بھی الٹے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹرز کی رائے کے مطابق اس لڑکی کی آنکھوں کے لینز الٹے لگے ہوئے ہیں۔

ایک اور لڑکی کو اللہ تعالیٰ نے شاید اس اصول پر تخلیق کیا ہے کہ جب وہ ہنسنا چاہے تو روتی ہے اور جب رونا چاہے تو ہنستی ہے۔ جب اس کے چہرہ پر آنسوؤں کے نشان ہوتے ہیں تو اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ جھلکتی ہے اور جب وہ ہنستی ہے تو اس کی آنکھیں گہرے دکھ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ ڈاکٹرز نے اس لڑکی کو لاعلاج قرار دیا ہے۔ [۵۴]

آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیرت انگیز چیز منظرِ عام پر آتی رہی ہے۔ اٹلی کے پایۂ تخت رومۃ الکبریٰ میں وہالیا اپیانامی مقام پر ایک قبر کی کھدائی کے دوران ایک عورت کی لاش برآمد ہوئی جو ڈیڑھ ہزار سال پرانی تھی۔ اس لاش کے بال سنہری ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ اور اس کے ساتھ ایک روشن چراغ تھا۔ لاش باہر نکالنے پر راکھ میں تبدیل ہو گئی اور جلتا ہوا چراغ بھی خود بخود بجھ گیا۔

لال قلعہ میں ایک حمام کا پانی ہمیشہ گرم رہتا تھا۔ اس حمام کی کھدائی پر بھی وہاں ایک جلتا ہوا چراغ ملا جو باہر نکالنے پر فوراً بجھ گیا۔ اور بعد ازاں جلانے پر بھی نہ جلا۔ اس قسم کے چراغ اطالیہ سے برآمد ہونے پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ضرور شاہجہاں کی عمارتوں کی تعمیر میں کوئی اطالوی معمار شریک تھا

جو اطالیہ سے اپنے ہمراہ یہ فن لایا تھا۔ [۵۵]

۷۔ معلومات عامہ

''سیر بین'' کے عنوان کے تحت دی جانے والی دلچسپ معلومات اور خبروں کو موضوعات کے اعتبار سے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں تقریباً ہر شعبۂ زندگی سے متعلق خبریں اور دلچسپ معلومات عصمت کی زینت بنتی تھیں۔

دنیا میں بولی جانے والی زبانوں سے متعلق اعداد و شمار دیتے ہوئے بتایا گیا کہ اس وقت دنیا میں ۲۴۲۴ زبانیں رائج ہیں۔ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان انگریزی ہے۔ پندرہ کروڑ آدمی یہ زبان بولتے ہیں۔ روسی زبان ۹ کروڑ، جرمنی زبان ۷ کروڑ، فرانسیسی زبان ۶ کروڑ، ہسپانوی ۲/۱ کروڑ، اور پرتغالی زبان ۳ کروڑ لوگ بولتے ہیں۔ اسی طرح مختلف زبانوں کے الفاظ کی تعداد بھی بتائی گئی کہ انگریزی لغت میں ۴ لاکھ ۳۰ ہزار، جرمنی لغت میں ایک لاکھ ۶۰ ہزار، فرانسیسی لغت میں ۳ لاکھ ۱۰ ہزار، روسی لغت میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار، ہسپانوی لغت میں ایک لاکھ ۴۰ ہزار اور اطالوی لغت میں بھی اسی قدر الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مشرقی زبانوں میں سب سے زیادہ وسیع زبان چینی زبان کو قرار دیا گیا۔ اس کے بعد اردو اور پھر عربی زبان کا نمبر آتا ہے۔ اردو زبان بولنے والے افراد ۹ کروڑ اور عربی زبان بولنے والوں کی تعداد ۵ کروڑ بتائی گئی۔ [۵۶]

چینی (کھانڈ) کی افادیت کے حوالے سے حیرت انگیز معلومات دی گئی ہیں۔ دنیا کے ایک مشہور پہلوان ہیکنشمٹ کا کہنا ہے کہ: ''مجھے جتنی طاقت کھانڈ کی چند ڈلیوں سے حاصل ہوتی ہے اور کسی چیز سے میسر نہیں آتی کھانڈ کے ذریعے ہی میں بڑی سے بڑی کشتی کے لیے تیار ہوا کرتا ہوں۔'' [۵۷]

امریکہ کے ڈاکٹر کھانڈ کی افادیت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ جسم میں زور پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ زود اثر کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ اسی افادیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیمبرج وغیرہ میں چپّو چلانے والے دوڑ سے پہلے کھانڈ کھا لیا کرتے ہیں۔

ماضی کے مقابلے میں لوگوں میں پس انداز کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس

بات سے لگایا گیا کہ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیانی عرصہ میں ڈاک خانوں میں سابقہ ۹ کروڑ ۶۵ لاکھ روپیہ کے مقابلے میں ۲۵ کروڑ ۶۴ لاکھ روپیہ جمع کیا گیا اور جب امپیریل بنک نے جنوری ۱۹۲۱ء سے سیونگ بنک جاری کیا اس میں بھی روپیہ ۴ کروڑ ۱۲ لاکھ سے ۱۰۷۹ کروڑ بڑھ گیا۔ [۵۸]

یورپی ممالک میں ذرائع آمدورفت خصوصاً وہاں کی ریلوں میں ہونے والی نت نئی حیرت انگیز تبدیلیوں سے بھی ''سیر بین'' کے قارئین کو آگاہ کیا جاتا رہا۔ امریکہ کی ریلوں (ٹرینوں) میں تالابوں اور ورزش خانوں کا انتظام کیا جارہا ہے۔ ایک اور ریل کے حوالے سے خبر دی گئی کہ اس میں سونے کے لیے بستر تیار ہورہے ہیں اور نہانے کے لیے فوّاروں کا بھی انتظام کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ریل کی کمپنی عورتوں کے لیے ایک مشاطہ (بیوٹیشن) اور مردوں کے لیے پانی چھڑکنے کا انتظام کر رہی ہے۔ اس ریل میں درزی بھی موجود ہوگا۔ لکھنے کی میز، ٹیلیفون، اخبار، رسالے اور کتب خانے (لائبریری) بھی رکھیں جائیں گے۔ ایک اور کمپنی نے ایسے آلے گاڑیوں میں رکھے ہیں کہ اس کے ذریعے ریل میں بیٹھے بیٹھے تھیٹروں کے گانے اور کسی مقرر کی تقاریر سنی جاسکتی ہیں۔ اس طرح کی معلومات کی فراہمی سے خواتین اس دور میں ہونے والی جدید ایجادات سے آگہی حاصل کرتی تھیں۔ [۵۹]

غیر معمولی افلاس، عورتوں کو مناسب خوراک نہ ملنے، تنگ و تاریک مکانات میں رہائش جہالت، کم عمری میں شادی، پردے اور بیماریوں کے سبب شرح اموات میں اضافہ کا اندازہ کلکتہ کے متعلق ۱۹۲۴ء کی بیماریوں کی سالانہ رپورٹ سے ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں شرحِ اموات بچگان فی ہزار ۳۸۶، ۱۹۲۱ء میں ۳۳۰، ۱۹۲۲ء میں ۲۸۷، ۱۹۲۳ء میں ۲۹۴ اور ۱۹۲۴ء میں ۲۹۴ رہی۔ ان میں سے کل تعدادِ امواتِ بچگان کا ۳/۱ حصہ اموات پیدائش کے چند گھنٹوں یا دنوں میں واقع ہوتی ہیں۔

''سیر بین'' میں اندھیرے میں دیکھنے میں مدد دینے والے ایک حیرت انگیز آلے کے متعلق معلومات دی گئیں۔ اس آلے کی مدد سے رات کے اندھیرے میں ہوائی جہاز کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جاسکے گی۔ خصوصاً لڑائی میں اس آلے سے بڑی مدد ملے گی۔ دشمن اندھیرے کا فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ اس آلے کی کرنیں کہر اور دھند میں خوب کام کرتی ہیں۔ بڑے بڑے برف کے تودے جن سے ٹکرا کر جہاز تباہ ہوجاتے ہیں۔ اس آلے کی مدد سے دور سے نظر آجایا کریں گے۔ رات کو جن جانوروں کو نظر

آتا ہے ان کی عادات و خصائل کا مشاہدہ بھی اس آلے کی مدد سے اس خوبی سے کیا جا سکے گا کہ جانوروں کو ذرا بھی پتہ نہیں چل سکے گا کہ انہیں دیکھا جا رہا ہے۔[۶۰]

انگریز ہندستان آئے تو ساتھ چائے جیسی مضرِ صحت چیز بھی لے آئے۔ اور اب حالات یہ ہیں کہ روٹی سے زیادہ لوگوں کو چائے کی طلب ہوتی ہے۔ چائے نوشی کے نقصانات کے حوالے سے انگلستان کے ایک ڈاکٹر نے یہ تشویش ظاہر کی کہ چائے صحت کے لحاظ سے نہایت مُضر ہے اس سے اعصاب کمزور پڑ جاتے ہیں۔ چائے کا متبادل انہوں نے قہوہ تجویز کیا کہ اس میں زیادہ دودھ کا استعمال قوم کی صحت کے لیے فائدہ بخش ہوگا۔ ''سیر بین'' میں اس رپورٹ کو شائع کرنے کا مقصد ہندستان میں چائے نوشی کے مضرِ صحت ہونے کے حوالے سے شعور بیدار کرنا تھا۔[۶۱]

۱۹۶۸ء کے زمانے میں ریل گاڑی ایک نئی، عجیب و غریب اور حیرت انگیز ایجاد تھی۔ جس کا تصور بھی ہندستانیوں کے لیے محال تھا۔ ''سیر بین'' میں ریل گاڑی کی ایجاد کے حوالے سے معلومات فراہم کر کے لوگوں کو اس سے آگاہ کیا گیا۔ پہلے پہل اونٹ کو صحرا کا جہاز کہا جاتا تھا لیکن اب ایک ایسی گاڑی ایجاد ہوئی ہے جو چار منزلہ ہے اور موٹر کی طرح چلے گی۔

''سیر بین'' کے عنوان کے تحت نہ صرف دلچسپ اور عجیب و غریب خبریں عصمت کی زینت بنتی تھیں بلکہ پوری دنیا سے معلومات کا ذخیرہ عصمت کے قارئین کی نذر کیا جاتا تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے پلیٹ فارم کے حوالے سے بتایا گیا کہ دنیا میں سب سے بڑا پلیٹ فارم سون پور کا ہے۔ جو ہندستان کے بنگال نارتھ ویسٹرن ریلوے پر واقع ہے۔ اس کی لمبائی ۲۴۵۰ فٹ ہے۔ اس کے بعد یورپ میں مانچسٹر کا پلیٹ فارم ہے جس کی لمبائی ۲۱۷۵ فٹ ہے۔ پھر اسی بنگال ریلوے کا گورکھ پور کا پلیٹ فارم ہے جو ۲۱۱۲ فٹ لمبا ہے۔ چوتھے نمبر پر میلبورن (آسٹریلیا) کا ریلوے سٹیشن ہے جو ۲۰۰۶ فٹ لمبا ہے۔[۶۲]

مشاغل کے حوالے سے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ عجیب و غریب مشاغل روزمرہ کے مشاغل کے بالکل الٹ ہوتے ہیں لیکن یہ خیال بھی غلط ثابت ہوگیا کیونکہ مسٹر براملے (جو ریلوے کے ملازم تھے) ساری زندگی کوہ ہمالیہ کے اوپر اور دنیا کے ناقابلِ گزر مقامات پر ریلوے لائن بچھانے

کے شوق میں مبتلا رہے۔ بادشاہ جارج سلامت کو ڈاک خانہ کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عمدہ عمدہ گھڑیاں جمع کرنے کا شوق بھی پال رکھا ہے جن میں سے بعض گھڑیوں کو وہ خود چابی دیتے ہیں۔ ملکہ کا شوق عظیم الشان گڑیا خانہ کی شکل میں ویمبلی کی نمائش میں سامنے آیا۔ ولی عہد پرانے جہازوں کی تصاویر جمع کرنے کے خبط میں مبتلا ہیں اور ہر قوم اور ملک کے بحری و تجارتی جہازوں کے نقشے جمع کرتے ہیں۔

دنیا کے مشہور ڈراما نویس جارج برنارڈ شاہ لکڑیاں چیرنے کا شوق رکھتے تھے۔ انگلستان کے سابق پوسٹ ماسٹر جنرل کی بیوی لیڈی مچل کو بالیاں جمع کرنے کا شوق تھا اور ان کے پاس ۲۲۰ قسم کی بالیاں تھیں۔ مسٹر گریہم کے پاس تمام دنیا کی ریلوں کے چودہ ہزار ٹکٹ تھے جو ان کے شوق کے غماز ہیں۔ [۶۳]

سائنسدان پہلے تاروں کے ٹوٹنے پر یقین نہیں رکھتے تھے حالانکہ گریٹ نما کوالینڈ میں ایسے تاروں (شہاب ثاقب) کی بارش ہوئی تھی اور وہاں کے لوگ اس کے ہتھیار بنا کر رکھتے تھے۔ دس سال پہلے ڈمارالینڈ میں ایک بڑا تارا (شہابِ ثاقب) ٹوٹ کر گرا۔ یہ مقام جنوب مغربی افریقہ میں گروٹ فونٹین سے ۱۲ میل مغرب میں ہے اور اس کا وزن ۵۰ سے ۷۰ ٹن ہے اور اس کی ہموار سطح پر چاروں طرف بارہ آدمی ایک ساتھ چل پھر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے جو تارا ملبورن کے نزدیک ۱۸۵۴ء میں گرا تھا اس کا وزن ۲/۱-۳ ٹن تھا۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۹۵ء میں شکار پور کے نزدیک ۲۸ سیر وزنی تارا گرا جو عجائب گھر میں رکھ لیا گیا وہاں وہ تارے (جو انگلستان میں ۱۸۳۰ء، ۱۸۳۵ء، ۱۹۰۲ء، ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۳ء میں گرے) بھی رکھے گئے ہیں۔ بعض اوقات ان تاروں کی بیک وقت بارش ہوتی ہے۔ ۳۰ جنوری ۱۸۶۸ء کو ایک لاکھ پتھر (جو وزن میں ۱۰ سیر تک کے تھے) پولینڈ میں پل لسٹک کے قریب پانچ مربع میل کے رقبہ پر گرے اور ۱۹ جولائی ۱۹۱۲ء کو ۱۴ ہزار تارے اری زونہ میں گرے جن میں سے بعض انگور کے بیج کے برابر تھے۔ اری زونہ امریکہ میں میکسیکو کے اوپر واقع ہے۔ [۶۴]

انسانوں کا روزہ رکھنا تو سمجھ میں آتا ہے جانوروں کا روزے کی حالت میں رہنا کافی حیرت انگیز انکشاف ہے جو ''سیر بین'' میں کیا گیا۔ کیکاڈا (جھینگر کی قسم کا ایک ٹڈا) جھلی میں لپٹا ہوا سات سال تک پڑا رہتا ہے اور بعد میں کرم بن کے باہر نکلتا ہے۔ اس دوران اسے کسی قسم کی کوئی خوراک

نہیں ملتی۔ سانپ اور اس کی قسم کے زہریلے رینگنے والے کیڑے خوراک نہ ملنے کی وجہ سے بھوکے رہتے ہیں۔ پیرس کے چڑیا گھر میں ایک بڑے سانپ نے ۱۸ مہینے تک فاقہ کیا آخر مزاج درست ہونے پر کھانا شروع کر دیا۔ اس سانپ کی لمبائی ۲۷ فٹ ہے۔ جانوروں کی طرح انسان کی جلد کے نیچے پٹھوں میں، جگر میں اور اور آنتوں میں چربی ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی فاقہ سے نہیں مرسکتا۔ اسی طرح اونٹ اپنی کوہان کی بدولت زندہ رہتا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کی ایک چھپکلی کی دم میں بہت چربی ہوتی ہے اور چربی کے پگھلنے تک وہ زندہ رہتی ہے۔ صحرائی چوہوں کی دم میں بھی چربی ہوتی ہے جس کے پگھلنے پر ان کی غبارے میں سے ہوا نکلنے جیسی کیفیت ہو جاتی ہے۔ [۶۵]

ادیب حضرات ہر دور میں زمانے کے ہاتھوں ستائے گئے اور مفلسی کا شکار رہے۔ اس حوالے سے مشہور مصنفین اور ڈرامہ نویسوں کے حوالے سے حیرت انگیز انکشافات ''سیر بین'' کے ذریعے عصمت کے قارئین تک پہنچے۔ ''لارنس'' اپنی زندگی میں ۳۳۳۳اروپیہ سالانہ سے زیادہ نہ کما سکا مگر مرنے کے بعد اس کی کتابوں کی سالانہ آمدنی تاجروں کو ۱۳۳۳۳۳ ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو سال بعد حقِ تصنیف ختم ہو جانے سے کتاب طابع (ناشر) کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ ڈکنز کی کتابیں اس کے مرنے کے بعد خوب بک رہی ہیں۔ مرتے وقت اس نے ۱۰۶۶۶۶ روپیہ چھوڑے اس کی صرف ایک کتاب ''ہمارے خداوند کی زندگی'' کی آمدنی اس کے چھوڑے ہوئے ترکہ کے برابر ہے۔ شیکسپیئر کو زندگی میں کبھی ۲۶۶۶ روپیہ سالانہ سے زیادہ آمدنی نہیں ہوئی۔ اگر اسے آج کل کی فروخت کا مقررہ حصہ ملتا تو دنیا کا سب سے مالدار انسان ہوتا۔ جارج برنارڈ شاہ کی آمدنی سب سے زیادہ ہے۔ وہ ۳۳۳۳۳۳ روپے سالانہ کما رہا ہے۔ اتنی زیادہ آمدنی کبھی کسی مصنف کی نہیں ہوئی۔ موجودہ زمانے میں بھی ادب سے وابستہ لوگ اس مفلوک الحالی کا شکار ہیں۔ [۶۶]

مشہور مصنفین کے کام کرنے کے طریقے الگ الگ رہے ہیں۔ اس حوالے سے اردو کے مصنفین کے حالات بہت کم معلوم ہیں کہ وہ کس طرح لکھتے ہیں اور ان کے انداز کیسے تھے؟ البتہ یورپ کے مصنفین کے حوالے سے بڑی دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ گسٹو فلابرٹ ایک فرانسیسی مصنف اپنے لکھے ہوئے کو بار بار پڑھتا، کاٹتا اور درست کرتا رہتا تھا۔ اس فکر میں وہ بیمار پڑ جاتا تھا۔ والٹر سکاٹ آسانی سے اپنا زیادہ کام اپنے گھر میں بچوں کے شور وغل وغیرہ میں ہی کر لیتا تھا۔ جارج ایلیٹ

بڑی مشکل سے لکھا کرتی تھی۔ کئی کئی دن میز پر بیٹھی رہتی اور ایک سطر نہ لکھ پاتی۔ جین آسٹن اور مس ایجورتھ بھی لوگوں کے درمیان میں کام انجام دے لیتی تھیں۔ جبکہ انتھونی ٹرولوپ نے اپنے چند ناول ڈاک خانہ کی نوکری کے سلسلے میں ریل کے سفر کے دوران تصنیف کیے۔ [۶۷]

۲۔ دوربین

ماہنامہ عصمت میں ''سیر بین'' کے مستقل سلسلے کے بعد ''دوربین'' کے عنوان سے ایک نیا مستقل سلسلہ ماہنامے کا حصہ بنایا گیا۔ ''سیر بین'' میں جہاں بین الاقوامی، اہم اور دلچسپ معلومات عصمت '' کی زینت بنتی تھیں وہاں ''دوربین'' میں بین الاقوامی معلومات کے ساتھ ساتھ قومی معلومات و واقعات پیش کیے جانے لگے۔ ''دوربین'' میں عصمت کے ادارے کی طرف سے معلومات دی جاتی تھیں۔ عصمت کے دستیاب شماروں میں ۱۹۳۰ء سے پہلے تک اس سلسلے کے آثار نہیں ملتے۔ جنوری ۱۹۳۰ء کے شمارے سے اس سلسلے کا آغاز ہوا جو قیام پاکستان کے بعد بھی کچھ عرصہ جاری رہا اور پھر ختم کر دیا گیا۔ ''دوربین'' کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ نہیں شائع ہوا بلکہ گاہے بگاہے کسی شمارے کی زینت بنتا رہا۔ دُوربین کے سلسلے میں شائع ہونے والی معلومات موضوعاتی اعتبار سے درج ذیل حصّوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں:

۲.۱۔ معاشرتی حالات

۱۹۳۰ء کی دہائی میں ہندستان اپنے نازک ترین دور سے گزر رہا تھا۔ ملکی سیاست روزانہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ انگریزوں سے اپنے مطالبات منوانے اور ان کے سامنے اپنا مؤقف پیش کرنے کے لیے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے قائدِ اعظم، مہاتما گاندھی اور دیگر سرکردہ سیاسی رہنما لندن گئے۔ پوری قوم کی نظریں اس کانفرنس کے نتائج پر تھیں۔ ''دوربین'' میں بھی اسی حوالے سے بغیر کسی تعصب کے تجزیہ کیا گیا کہ تمام فرقے صرف اپنے مفادات کے حصول کے خواہشمند ہیں دوسرے طبقات کی انہیں کوئی پرواہ نہیں اس لیے یہ دوسری گول میز کانفرنس بھی کسی حتمی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہوگئی۔ [۶۸]

جنگ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوم کی ہولناک تباہ کاریوں کے باجود دنیا میں ایک اور جنگ

کے آثار نظر آرہے تھے۔ عہد نامہ لوکارنو کی رو سے برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں یہ طے پایا تھا کہ کسی بھی بیرونی حملہ آور کی صورت میں باقی دوممالک اس ملک کی مدد کریں گے جس پر حملہ ہوا۔ روس اور فرانس میں بھی طے پایا کہ حملے کی صورت میں دونوں ممالک ایک دورے کی مدد کریں گے۔ جرمنی کے لیے یہ بات کافی تشویشناک ہے۔ جرمنی روس پر حملہ کر کے اس کا قصہ ختم کرنے کے بعد فرانس سے دودو ہاتھ کرنا چاہتا ہے اور پھر برطانیہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے۔ جرمنی کے نزدیک فرانسیسی روسی معاہدہ لوکارنو کی صلح کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ دوسری طرف جاپان میں بھی فوج نے بغاوت کردی ہے اور کئی فوجی افسران نے حکومتی اقدام سے نالاں ہو کر خودکشی کرلی ہے۔ روس جاپان پر حملہ کے لیے تیار بیٹھا ہے ادھر جاپان، جرمنی اور پولینڈ میں روس کے خلاف معاہدہ طے پا گیا ہے۔ ''دوربین'' کے توسط سے بین الاقوامی اور مقامی خبروں کے ذریعے عصمت کے قارئین نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا بھر میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی آگاہ رہتے تھے جو ان حالات میں بہت ضروری تھا جب پوری دنیا پر ایک اور جنگِ عظیم کے سائے منڈلا رہے تھے۔ [۶۹]

تیس کی دہائی میں ''دوربین'' میں پوری دنیا کے سیاسی افق کا جائزہ پیش کیا جاتا رہا۔ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلنے کی فکر میں تھی۔ جاپان نے بھی اپنی طاقت اتنی بڑھالی کہ روس اور برطانیہ اس سے نالاں نظر آتے تھے، تجارت میں بھی وہ یورپی ممالک سے بہت آگے بڑھ گیا۔ تجارتی جہازوں کا بحری بیڑا اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے شاید اس طرح وہ ہندستان کی تجارت پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف فرانس اور انگلستان کی طرف سے حبش میں قونصل خانے قائم کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اطالیہ کی فتح تسلیم کرلی ہے۔ بحیرہ روم کے متعلق اطالیہ اور انگلستان میں مفاہمانہ گفتگو ہوئی ہے اور دونوں ممالک کے بحیرہ روم میں حقوق کے حوالے سے عہد نامہ مرتب ہو گیا ہے۔ بحیرہ روم پر انگلستان کی زندگی کا دارومدار ہے اس لیے اسے مجبوراً ہی سہی مگر اطالیہ سے مصالحانہ رویہ رکھنا پڑے گا۔ [۷۰]

جرمنی کے دو نئے ہتھیاروں وی ون اور وی ٹو نے شمالی اور جنوبی انگلستان کو کافی نقصان پہنچایا۔ تاریخ میں یہ ہتھیار بدترین وحشیانہ اور سفاکانہ ہتھیار کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔ [۷۱]

خوفناک اور تباہ کن ہتھیاروں کے باوجود جرمنی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ہٹلر برلن کی مدافعت میں روسی افواج کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہٹلر کے جانشین امیر البحر ڈونٹز نے انگریزوں اور امریکیوں سے گفت وشنید کے بعد بلاشرط ہتھیار ڈال دیئے چنانچہ ایک دن میں ۱۰ لاکھ جرمن سپاہیوں نے ہتھیار ڈالے۔ دوسری طرف ناروے کی ۳ لاکھ جرمن فوج نے بھی چپ چاپ ہتھیار ڈال دیئے۔ خیال ہے کہ جرمنی کے خفیہ ہتھیار اور بحری بیڑہ اتحادی جاپان کے خلاف استعمال میں لائیں گے۔[۲۷]

۲.۲۔ سیاسی موضوعات

۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ جس کی وجہِ بنیاد کانگریس کا صرف ہندوؤں کے مفادات کا حصول بنی۔ لیکن اب بھی بہت سے مسلمان ایسے تھے جو مذہب کی بجائے قومیت کے قائل تھے اس لیے قوم پرور مسلم پارٹی وجود میں لائی گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری اس پارٹی کے سرکردہ رہنما تھے۔ ہندستان پر کسی اسلامی سلطنت کے حملے کی صورت میں اس پارٹی نے ملک کی آزادی کی حفاظت کے لیے ہندوؤں کے شانہ بشانہ لڑنے کے عزم کا اظہار کیا۔ اس پارٹی نے دعویٰ کیا کہ کانپوری مسجد کے متعلق ایجی ٹیشن میں، خلافت کی ایجی ٹیشن میں، تحریک عدم تعاون کے دوران اور تحریک خلافت شروع کرنے میں اس پارٹی کا ہاتھ رہا ہے۔ اس لیے قوم پرست مسلمان ہی مسلمانوں کے حقیقی نمائندے ہیں۔[۳۷]

پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کے بعد جرمنی کو معاہدہ صلح کی رُو سے آبدوزیں بنانے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس نے معاہدے کے برخلاف ۷ ہزار من کی ۱۲ آبدوزیں بنانا شروع کر دی ہیں۔ برطانیہ کے پاس ۴۲، امریکہ کے پاس ۵۰، فرانس کے پاس ۱۳۹، اطالیہ کے پاس ۸۸ اور جاپان کے پاس ۳۶ آبدوزیں ہیں۔ اطالیہ اور فرانس نے اپنی فضائی حدود میں جرمن ہوائی جہازوں کی نقل وحرکت پر تشویش ظاہر کی ہے جبکہ انگریزوں نے بھی جرمنی کو دھمکی دی ہے کہ اگر جرمنی نے عہدنامے کی رو سے ممنوعہ علاقے میں قدم رکھا تو برطانیہ اس کے خلاف پوری قوت سے فرانس کی مدد کرے گا۔[۴۷]

''دوربین'' میں بتایا گیا کہ اطالیہ کی حبش پر چڑھائی کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ صوبہ تیجری میں سونے کی کانیں ہیں۔ صوبہ جوجام کے مغربی علاقوں میں دریا کی ریت سے سونا نکلتا ہے۔ چنانچہ ۱۸من ریت سے ۱۸ گرین سونا نکلا۔ علاقہ موفین میں ۵۰ میل تک سونے کی ۱۸ کانیں ہیں۔ برنیتو اور اریٹیریا میں ۵۷ میل تک سونے کی کانیں موجود ہیں۔ اطالیہ ان علاقوں سے سونے کی برآمدگی میں ان ۵۰ ہزار غلاموں سے کام لے گا جنہیں صوبہ تیجری میں اطالویوں نے آزادی دلائی تھی۔ دوسری طرف حبش نے تجاویز صلح مسترد کر دی ہیں۔ اطالوی اور حبشی فوجوں میں دوروز کے زبردست معرکے کے بعد اطالویوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اطالویوں کے ۱۵۰ گورے اور ۲۰۰ کالے سپاہی مارے گئے۔ شمالی محاذ پر حبشیوں نے اطالویوں سے ۴۰ ٹینک، ۵۰ مشین گنیں چھین کر ۲۰۰ اطالوی قیدی بنا لیے۔ اطالیہ نے سویڈن کے شفاخانہ وکیمپ پر بم گرا کر ۲۸۰ زخمی اور ۵۰ ملازم قتل کر دیے اس نے مصری شفاخانہ پر بم گرا کر بھی بڑا نقصان کیا خود اطالوی سپاہیوں نے میدان جنگ میں جانے سے انکار کر دیا۔ اس بغاوت کا اثر باقی فوج پر بھی پڑ رہا ہے۔ [۵]

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے حوالے سے بتایا گیا کہ انہوں نے لاہور جا کر مسلمانوں کی بے چینی ختم کرادی ہے چنانچہ حکومتِ پنجاب نے تحریک کے سلسلے میں قید کیے گئے سب مسلمانوں کو رہا کرادیا ہے اور ایسی کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں ہندو، سکھ اور مسلمان ممتاز لیڈر شریک ہوں اور اجلاس کے ذریعے ایسی صورتحال پیدا کریں جو دونوں قوموں کو منظور ہو۔ [۶]

دنیا میں سیاسی حالات لحہ بہ لحہ کروٹ لے رہے تھے۔ فلسطین جو تیرہ سو سال سے مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا۔ وہاں عیسائی، مسلمان اور یہودی امن اور چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ ۱۸۴۵ء تک اس ملک میں ۱۲ ہزار سے زیادہ یہودی نہیں تھے۔ مگر جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ نے عربوں کو خود مختاری کے سبز باغ دکھا کر ترکوں کے خلاف برسرِ پیکار کر دیا جس کا نتیجہ ترکوں کی شکست کی صورت میں سامنے آیا۔ دوسری طرف برطانیہ نے یہودیوں سے فلسطین میں ان کا قومی وطن بنانے کا وعدہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ عظیم کے خاتمے پر عرب ۹ لاکھ اور یہودی ۴ لاکھ ہو گئے۔ یہودی روپے کے بل بوتے پر عربوں سے اچھی اچھی زمینیں خریدتے چلے گئے۔ برطانوی کمیشن نے فلسطین میں قیام امن کے سلسلے میں تحقیقات کے بعد جو رپورٹ شائع کی اس میں فلسطین کے تین حصوں میں سے

بہترین حصے میں یہودی ریاست کے قیام کی تجویز دی گئی جو عربوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ اس طرح مسلمانوں کا قبلہ اوّل اور دیگر مقدس مقامات یہودوں کے ہاتھ میں جانے کا اندیشہ ہے۔[۷۷]

ہندستان کی آزادی کے حوالے سے ۱۹۴۰ء میں جو قراردادِ پاکستان پیش کی گئی اس کے تناظر میں ۲۳ مارچ کو ہندستان میں یومِ پاکستان منایا گیا۔ تمام بڑے شہروں میں جلسے ہوئے اور قراردادیں منظور کی گئیں کہ ہندستان کے جھگڑوں کا واحد حل قیامِ پاکستان ہے۔ پاکستان کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے ہر گلی کوچے میں فروخت کیے گئے پاکستان کے قیام کا مقصد اور ضرورت بتائی گئی۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی کوشش ہے کہ پنجاب کی وزارت اپنے آپ کو مسلم لیگ وزارت قرار دے مگر تا حال اس مقصد میں کوئی کامیابی نظر نہیں آتی۔[۷۸]

دنیا کے سیاسی حالات کے تناظر میں جاپان کی شکست صاف نظر آ رہی ہے۔ ٹوکیو اور جاپان کے دیگر اہم شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکی ہوائی جہاز گولے برساتے رہے۔ چین میں بھی جاپانی پیرہ دستی رک گئی ہے، ترکی نے بھی جاپان سے سیاسی تعلقات منقطع کر کے اس کے سیاسی مدبروں کو نظرانداز کر دیا ہے۔[۷۹]

۲.۳۔ خواتین کی تربیت/اصلاح

ہندستانی مردوں کے ساتھ ساتھ ہندستانی خواتین میں بھی بیداری کی لہر پیدا ہو رہی تھی۔ ٹراون کور کی ریاست میں خواتین کے جلسہ میں صدرِ مجلس خاتون نے خرابیٔ صحت اور بچوں کی پرورش بخوبی نہ کر سکنے والی خواتین کو افزائش نسل سے بچنے کا مشورہ دیا مگر اس کے ساتھ ہی ضبطِ تولید کو مضر قرار دیتے ہوئے خواتین کی صحت اور جوانی کی بربادی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ انہوں نے مردوں کے برابر تمدنی و سیاسی حقوق کے حصول کے ساتھ ساتھ خانگی امور میں انہیں حصہ لینے کا کہا اور سب فرقوں کی خواتین کے اجلاس پر بھی زور دیا تا کہ انفرادی فوائد کی بجائے ملکی بھلائی اور سلامتی کے لیے مل کر کام کیا جائے۔[۸۰]

کانگرس کے اجلاس کے سلسلے میں مسز نائیڈو کی زیرِ صدارت خواتین کا ایک جلسہ ہوا جس میں ہندستان کی جنگ آزادی میں خواتین کے کردار کے حوالے سے بحث کی گئی۔ مسز مالی بن کارا مولو جی

نے کہا کہ خواتین صرف بچے پیدا کرنے کی مشین نہیں ہیں بلکہ ہمیں اس سے زیادہ مفید کام ہندستان کی حصول آزادی میں اپنا کردار ادا کر کے کرنا ہے کیونکہ تحریک آزادی کی تہہ میں اصل طاقت خواتین ہی ہیں۔[۸۱]

خواتین کے حوالے سے حوصلہ افزا بات یہ سننے کو ملی کہ پٹنہ میں مسز دھرم شیلا لال نے بیرسٹری شروع کر دی ہے۔ ان سے پہلے مس ہاجرہ بھی پٹنہ میں یہ کام کر رہی ہیں۔ دوسری طرف پنجاب یونیورسٹی کسی لڑکی کو میٹریکیولیشن کے امتحان میں تب تک نہیں بیٹھنے دے گی جب تک امتحان کے آغاز کے پہلے دن تک اس کی عمر پوری ۱۴ سال نہ ہو گئی ہو۔[۸۲]

۴.۲۔ خواتین کے نمایاں معاشرتی کردار کا اعتراف

''دور بین'' میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء کے حوالے سے خبر دی گئی کہ قسطنطنیہ (ترکی) ترکی میں خواتین کی آزادی کا اندازہ بلقان کانفرنس میں ان کی شرکت سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کانفرنس کا انعقاد نیم سرکاری طور پر کیا گیا تا کہ اس میں ممالک بلقان کے سیاسی مسائل کا جائزہ لیا جا سکے۔ تاریخ میں یہ پہلے دفعہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس قسم کی کانفرنس میں ترکی خواتین کو بھی شرکت کا موقع دی گیا ہے جو کہ یقیناً باقی دنیا کی خواتین کے لیے بھی ایک حوصلہ افزا بات ہے کہ ان کی جدوجہد رنگ لا رہی ہے۔[۸۳]

ہندستانی خواتین میں زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کا حوصلہ اور ہمت پیدا کرنے کے لیے ''دور بین'' میں یورپی خواتین کے حوالے سے اہم معلومات بھی شامل کی جاتی تھیں۔ یورپی خواتین نے ہوائی جہاز اڑانے کے کئی مقابلوں میں مردوں کو شکست دی۔ ان کی پیروی میں اب ہندستانی خواتین سے بھی اس بات کی توقع ہے کیونکہ کلکتہ کے ایک کالج کی طالب مس اشوک رائیکت بی اے کو ایک ہزار روپیہ وظیفہ اور ایک اور کالج کی طالبہ مس انجلی داس ایم اے کو پانچ سو وظیفہ دینے کے ساتھ ساتھ ڈم ڈم کے ہوائی مستقر میں ان کی جہاز رانی کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا گیا ہے جو کہ ہندستانی خواتین کے لیے ایک خوش آئند بات ہے۔[۸۴]

''دور بین'' میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بیوی کے انتقال کی خبر کے ساتھ ساتھ مدارس کے

حوالے سے ایک خوش آئند خبر یہ دی گئی حکومت نے خواتین کو تنخواہ دار مجسٹریٹ مقرر کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اہلیت پر پورا اترنے والی خواتین کو ڈپٹی بنایا جاسکتا ہے جو کہ ہندستانی خواتین کے لیے یقیناً ان کی صلاحیتوں کو آزمانے کا ایک نادر موقع ہے۔ [۸۵]

خواتین میں شعور بیدار کرنے والے رسائل کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور ہندستانی خواتین گھریلو مسائل سے نکل کر ملکی سیاست میں بھی اہم کردار ادا کرنے لگیں۔ حیدرآباد کی خواتین کانفرنس کی دسویں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے شہزادی درِّشہوار نے کہا کہ عورتیں اب مرد کے کندھوں کا بوجھ نہیں رہیں وہ بھی اب مردوں کی طرح خود کو زمین کا باشندہ اور اپنی ذمہ داریوں کا بآسانی بوجھ اٹھانے والی ثابت کر رہی ہیں۔ حیدرآباد میں ان کی تعلیم کے حوالے سے کافی اصلاحات کی گئی ہیں اور آئندہ بھی بہت کچھ کیے جانے کی امید ہے۔ خواتین کو بوقت ضرورت کسب معاش کی طاقت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔ حیدرآباد کے مختلف مذاہب کی خواتین میں بے مثل اتفاق پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اچھی بات کہیں سے بھی حاصل کرنے میں ذرّہ برابر بھی تامل نہیں کرنا چاہیے مگر اندھا دھند تقلید سے گریز کرنا چاہیے۔ [۸۶]

تعلیمِ نسواں کے لیے خواتین کی کوششیں بارآور ثابت ہونا شروع ہوگئیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے مڈل کے نتائج کے مطابق ۵۷۹۹ خواتین امتحان میں شریک ہوئیں جن میں سے ۴۲۵۹ پاس ہوئیں اس طرح نتیجہ ۷۳ فیصد رہا جو قابلِ تعریف ہے۔ طالبات کی تعداد میں ہر سال ریکارڈ اضافہ یقیناً عصمت کی کوششوں کا بھی ثمر ہے۔ [۸۷]

خواتین کو ملازمت کے مواقع مہیا کرنے کے لیے ہیلتھ وزیٹری کے مدرسے دہلی، بمبئی، پونا، لاہور، کلکتہ، مدراس اور ناگپور میں قائم کیے گئے ہیں اور ۸ سے ۹ ماہ تک اس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کی تنخواہ شمالی ہند میں ۷۰ سے ۷۵ روپیہ ماہوار اور جنوبی ہند میں ۵۵ سے ۶۰ روپیہ ماہوار ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی خواہش مند خواتین کے لیے یہ میدان نہایت وسیع ہے ہر جگہ ہیلتھ وزیٹروں کی مانگ ہے۔ [۸۸]

خواتین زندگی کے ہر میدان میں مردوں کا ساتھ نبھا رہی ہیں، چین اور جاپان کی جنگ میں

چینی خواتین چینی صدر چیا نگ کائی شیک کی امریکن تعلیم یافتہ خوبصورت بیوی کی رہنمائی میں اپنے وطن کے لیے ہر طرح کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ناچنے گانے والی خواتین اپنی آمدنی سے نہ صرف شفا خانے چلا رہی ہیں بلکہ یہ سب خواتین زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی ہیں۔ ان کے کپڑے دھوتی ہیں۔ جنگ کی ترغیب کے اشتہارات دیواروں پر لگا کر جگہ جگہ ملک کے لیے جنگی چرچا کرتی ہیں اور میدان سے پیچھے ہٹنے والے سپاہیوں کو اپنی اداؤں سے دوبارہ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔ جاپان اس جنگ سے بڑی مصیبت میں پھنس چکا ہے۔ چین سے نفع اٹھانے کی بجائے اس کا دیوالیہ نکلنے کا اندیشہ ہے۔[۸۹]

۲.۵۔ معلوماتِ عامہ

''دوربین'' میں مصر میں مقبروں کی کھدائی، گوالیار کی لیڈی ولنکار کا بنارس ہندو یونیورسٹی کو دو لاکھ روپے کا عطیہ دینے، الٰہ آباد یونی ورسٹی کی بی ٹی ڈگری میں ایک لڑکی کے اول آنے، مشہور ڈراما نویس آغا حشر کاشمیری کے انتقال، اور ترکی میں زلزلے کی آمد سے ۵۰۰ آدمیوں کی اموات کی خبریں بھی شائع کی گئیں۔[۹۰]

مزدور خواتین کے لیے بنگالہ کے حوالے سے ایک بڑی خوش آئند خبر ''دوربین'' کا حصہ بنی کہ بنگالہ میں بھی بمبئی کی طرز کا قانون تیار کیا جا رہا ہے جس کی رُو سے زچگی سے تین ماہ پہلے کی خواتین کی مزدوری پر اوسط قائم کی جائے گی جو اسے زچگی سے چار ماہ قبل اور چار ماہ بعد ملا کرے گی۔ اور مالکان زچگی سے چار ماہ بعد تک خواتین سے کوئی کام نہیں لیں گے۔[۹۱]

''دوربین'' میں ایک انگریز امیر سر عمر چارلس رئیس سٹوارٹ رینکن کے عیسائی مذہب کے عقائد سے گھبرا کر لامذہبی میں پڑنے اور پھر قرآن کا مطالعہ کرنے سے مسلمان ہو کر حج کی سعادت حاصل کرنے کی خوشخبری بھی دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ تناولی میں تامل نیڈو زنانہ کانفرنس میں مجسٹریٹی، مندروں کی پجاریت، پولیس اور ریل میں بھی خواتین کی بھرتی کے مطالبے کی خبر دی گئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ۵۸۷ طلباء کو مختلف ڈگریاں ملیں جن میں ۲۹۳ ایل ایل بی کی ڈگریوں میں سے ۲۹ ڈگریاں خواتین نے حاصل کیں جو ہندستانی خواتین میں شعور اور آگہی پیدا ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

’’دوربین‘‘ میں ترکوں کے باپ کمال اتاترک کی سخت علالت اور ہنگامی طور پر ان کی جگہ جنرل عصمت پاشا کے عہدہ سنبھالنے کی خبر بھی دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ کلکتہ میں مسلمان لڑکیوں کے کالج کی تعمیر مکمل ہونے اور وزیرِ تعلیم مولوی اے کے فضل الحق گورنر بنگال کو سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے مدعو کرنے کی خبر سے بھی آگاہ کیا گیا جو یقیناً مسلمان خواتین کے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری تھی کہ اپنے حقوق کے لیے برسوں سے برسرِ پیکاران کی جدوجہد آخر رنگ لا رہی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ مولوی محمد ظفر، ''سیر بین'' عصمت (جولائی اگست ۱۹۲۱ء): ص ۲۔

۲۔ ایضاً (جولائی اگست ۱۹۲۱ء): ص ٦۔

۳۔ ایضاً (فروری ۱۹۲٦ء): ص ۱۱۳۔

۴۔ ایضاً (نومبر ۱۹۲٦ء): ص ۲۳۱۔

۵۔ ایضاً (اکتوبر ۱۹۲۸ء): ص ۳۹٦۔

٦۔ ایضاً (اکتوبر ۱۹۲۸ء): ص ۳۹۹۔

۷۔ ایضاً (نومبر ۱۹۲۸ء): ص ۴٦۷۔

۸۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۵۸۔

۹۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۰ء): ص ۲۵۸۔

۱۰۔ ایضاً (اکتوبر ۱۹۲٦ء): ص ۲۷۲۔

۱۱۔ ایضاً (نومبر ۱۹۲۸ء): ص ۴٦۵۔

۱۲۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۳۴ء): ص ۵۱۴۔

۱۳۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۳۰ء): ص ۴۹۰۔

۱۴۔ ایضاً (اپریل ۱۹۳۵ء): ص ۳۱۸۔

۱۵۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۷ء): ص ٦۹۔

۱٦۔ ایضاً (جولائی اگست ۱۹۲۱ء): ص ۴۔

۱۷۔ ایضاً (جولائی اگست ۱۹۲۱ء): ص ۴۔

۱۸۔ ایضاً (فروری ۱۹۲٦ء): ص ۱۱٦۔

۱۹۔ ایضاً (فروری ۱۹۲٦ء): ص ۱۱۷۔

۲۰۔ ایضاً (اکتوبر ۱۹۲٦ء): ص ۲۷۰۔

۲۱۔ ایضاً نومبر (۱۹۲۶ء): ص۳۳۴۔۳۳۷۔

۲۲۔ ایضاً (اکتوبر ۱۹۲۸ء): ص۳۹۴۔

۲۳۔ ایضاً (نومبر ۱۹۲۸ء): ص۴۶۴۔

۲۴۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۰ء): ص۶۷۔

۲۵۔ ایضاً (جولائی اگست ۱۹۳۰ء): ص۱۹۰۔

۲۶۔ ایضاً (مارچ ۱۹۳۴ء): ص۲۳۱۔

۲۷۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۸ء): ص۱۵۴۔

۲۸۔ ایضاً (اکتوبر ۱۹۲۶ء): ص۲۷۱۔

۲۹۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۰ء): ص۶۸۔

۳۰۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۰ء): ص۲۵۷۔

۳۱۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۰ء): ص۲۶۰۔

۳۲۔ ایضاً (نومبر ۱۹۳۰ء): ص۴۱۶۔

۳۳۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۳۰ء): ص۴۹۱۔

۳۴۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۱ء): ص۴۳۴۔

۳۵۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۱ء): ص۴۳۴۔

۳۶۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۳۴ء): ص۵۱۴۔

۳۷۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۳۴ء): ص۵۱۴۔

۳۸۔ ایضاً (جون ۱۹۳۵ء): ص۴۷۶۔

۳۹۔ ایضاً (جون ۱۹۳۵ء): ص۴۷۶۔

۴۰۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۶ء): ص۱۴۹۔

۴۱۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۶ء): ص۱۴۹۔

۴۲۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۶ء): ص۱۵۰۔

۴۳۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۶ء): ص ۱۵۰۔

۴۴۔ ایضاً (اپریل ۱۹۳۶ء): ص ۳۵۲۔

۴۵۔ ایضاً (مئی ۱۹۳۶ء): ص ۴۳۲۔

۴۶۔ ایضاً (مئی ۱۹۳۶ء): ص ۴۳۴۔

۴۷۔ ایضاً (مئی ۱۹۳۶ء): ص ۵۱۵۔

۴۸۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۷ء): ص ۱۵۰۔

۴۹۔ ایضاً (مارچ ۱۹۳۹ء): ص ۲۳۸۔

۵۰۔ ایضاً (نومبر ۱۹۲۶ء): ص ۳۳۲۔

۵۱۔ ایضاً (جولائی ۱۹۲۷ء): ص ۹۷۔

۵۲۔ ایضاً (جولائی ۱۹۲۷ء): ص ۹۷۔

۵۳۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۰ء): ص ۶۶۔

۵۴۔ ایضاً (جولائی اگست ۱۹۳۰ء): ص ۱۹۱۔

۵۵۔ ایضاً (جولائی اگست ۱۹۳۰ء): ص ۱۹۱۔

۵۶۔ ایضاً (فروری ۱۹۲۶ء): ص ۱۱۳۔

۵۷۔ ایضاً (فروری ۱۹۲۶ء): ص ۱۱۴۔

۵۸۔ ایضاً (فروری ۱۹۲۶ء): ص ۱۱۷۔

۵۹۔ ایضاً (فروری ۱۹۲۶ء): ص ۱۱۹۔

۶۰۔ ایضاً (جولائی ۱۹۲۷ء): ص ۹۶۔

۶۱۔ ایضاً (نومبر ۱۹۲۸ء): ص ۴۶۵۔

۶۲۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۰ء): ص ۶۵۔

۶۳۔ ایضاً (جولائی اگست ۱۹۳۰ء): ص ۱۹۰۔

۶۴۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۳۰ء): ص ۴۹۲۔

۶۵۔ ایضاً (مارچ ۱۹۳۴ء): ص ۲۲۹۔

۶۶۔ ایضاً (جنوری ۱۹۶۳ء): ص ۷۰۔

۶۷۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۷ء): ص ۲۶۷۔

۶۸۔ ادارہ، ''دوربین'' عصمت (نومبر ۱۹۳۱ء): ص ۴۴۲۔

۶۹۔ ایضاً (نومبر ۱۹۳۱ء): ص ۴۴۱۔

۷۰۔ ایضاً (اپریل ۱۹۳۶ء): ص ۳۶۰۔

۷۱۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۷ء): ص ۱۵۶۔

۷۲۔ ایضاً (فروری ۱۹۴۵ء): ص ۱۲۷۔

۷۳۔ ایضاً (جون ۱۹۳۵ء): ص ۴۸۷۔

۷۴۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۶ء): ص ۱۵۶۔

۷۵۔ ایضاً (فروری ۱۹۳۶ء): ص ۳۶۱۔

۷۶۔ ایضاً (ستمبر ۱۹۳۷ء): ص ۲۷۱۔

۷۷۔ ایضاً (مئی ۱۹۴۴ء): ص ۲۲۷۔

۷۸۔ ایضاً (فروری ۱۹۴۵ء): ص ۱۲۷۔

۷۹۔ ایضاً (جون ۱۹۳۵ء): ص ۴۸۸۔

۸۰۔ ایضاً (مئی ۱۹۳۶ء): ص ۴۴۱۔

۸۱۔ ایضاً (مئی ۱۹۳۶ء): ص ۴۴۲۔

۸۲۔ ایضاً (نومبر ۱۹۳۱ء): ص ۴۴۴۔

۸۳۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۶ء): ص ۷۷۔

۸۴۔ ایضاً (اپریل ۱۹۳۶ء): ص ۳۶۲۔

۸۵۔ ایضاً (دسمبر ۱۹۳۶ء): ص ۵۳۷۔

۸۶۔ ایضاً (جون ۱۹۳۹ء): ص ۴۹۱۔

۸۷۔ ایضاً (جون ۱۹۳۹ء): ص ۴۹۲۔

۸۸۔ ایضاً (جون ۱۹۳۹ء): ص ۴۹۲۔

۸۹۔ ایضاً (جون ۱۹۳۵ء): ص ۴۸۹۔

۹۰۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۶ء): ص ۸۷۔

۹۱۔ ایضاً (جنوری ۱۹۳۶ء): ص ۹۷۔

۹۲۔ ایضاً (نومبر ۱۹۳۸ء): ص ۴۳۹۔

ماحصل:

برعظیم میں ریاضی، طب، ادب وغیرہ کے علوم درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے لیکن نجوم، ہیئت، ریاضی، کیمیا، فقہ، تفسیر، حدیث اور تاریخ وسیرت وغیرہ مسلمانوں کی آمد سے رائج ہوئے اور ان علوم و فنون میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین بھی اپنے کارہائے نمایاں کی بدولت تاریخ کے صفحات میں اپنا نام رقم کرواگئیں۔

سلطنت مغلیہ کا زوال اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد سے شروع ہوا۔ اس کے بعد آنے والے نااہل حکمرانوں کی بے راہ روی اور ناعاقبت اندیشی کے باعث پوری قوم تنزلی کا شکار ہوگئی۔ تہذیب واقدار بدلنے اور علم وعمل کے فقدان سے مسلم معاشرے میں تعلیم نسواں کا تصور ہی ختم ہوکر رہ گیا۔ اخلاقی اقدار اور اسلامی تشخص کے استحکام کے لیے شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں نے اصلاح معاشرہ کا بیڑا اٹھایا۔ انھی کی پیروی میں حضرت شاہ اسماعیل شہید نے صراط مستقیم اور تقویۃ الایمان جیسی تصانیف سے اصلاحِ معاشرہ کے ساتھ ساتھ اصلاح نسواں کا کام بھی لیا۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے بعد مسلمانوں سے اقتدار چھن گیا اور انگریزوں نے ہندستان پر قابض ہوتے ہی عام تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں پر بھی خصوصی توجہ دی۔ سرولیم میور، ڈیوڈ ہیئر اور لارڈ ڈلہوزی کی پیش رفت اس سلسلے میں کافی اہم ثابت ہوئی۔ ادھر ہندوؤں نے اردو ہندی تنازعہ شروع کرکے اسلام دشمنی واضح کردی۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمان انگریزوں کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے بھی متنفر ہو گئے تھے۔ اس زوال پذیر دور میں سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے مسلمانوں میں تعلیم اور بیداری کی لہر دوڑا کر علم وادب، تہذیب وتعلیم اور فکر وتخیل کے نئے رخ سامنے لائے۔ سرسید نے جہاں انگریزی تعلیم کو عام کیا وہاں ڈپٹی نذیر احمد نے بنات النعش اور مراۃ العروس کے ذریعے تعلیم نسواں کی اہمیت ناگزیر قرار دے دی۔

سرسید کی تعلیمی کاوشوں میں لڑکوں کو مقدم رکھنے کا مقصد درحقیقت لڑکیوں کی تعلیم کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔ سرسید کی ہی قائم کردہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلم خواتین کی تعلیم کے سلسلے میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔ رفقائے سرسید میں سے مولانا الطاف حسین حالی نے ''مناجات بیوہ'' اور

''چپ کی داد'' جیسی منظومات میں خواتین کی مظلومیت کی تصویر پیش کر کے تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیا۔ حالی کی کتاب مجالس النساء نے خواتین کے معاشرتی مقام کے تعین اور ان کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کے حوالے سے نہایت مؤثر کردار ادا کیا۔ سر سید اور ان کے رفقا نے مسلم معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا اصلاحی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ خواتین کے بنیادی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا اور جدید تعلیم اور معقول تربیت کی عدم موجودگی کو خواتین کی جہالت کی بنیاد قرار دیا۔ یہ انھی کی کاوشوں کا ثمر ہے کہ ہمارے ادب میں خواتین کے مسائل کو موضوع بنایا جانے لگا۔ ہندستانی مسلمانوں کی تعلیم نسواں کی تحریک کی نوعیت دو طرح کی تھی۔ برطانوی طرز تعلیم کا حامی گروہ مسلمان خواتین کے لیے جدید تعلیم کا قائل تھا اور دوسرا گروہ تعلیم نسواں کو مذہب اور امور خانہ داری تک محدود رکھنے کا حامی تھا۔ اسی گروہ میں بانیٔ عصمت علامہ راشد الخیری کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے ماہنامے عصمت میں شائع ہونے والے مضامین کا مقصد خواتین میں مذہبی تعلیم کا رجحان پیدا کرنا، خاوند کی بڑائی تسلیم کرنا اور پردہ کی اہمیت کو ماننا وغیرہ تھا۔ عصمت ایک متوازن و معتدل ماہنامہ تھا جس میں مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور تفریحی ہر قسم کی معلومات قارئین کی نذر کی جاتی تھیں۔

زبان و ادب کی ترقی میں رسائل و جرائد نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بھی ادبی رسائل نے ہمیشہ مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ ان ادبی رسائل نے نہ صرف ماضی کا ادب صفحۂ قرطاس پر محفوظ کیا بلکہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ برعظیم میں ادبی رسائل کی اشاعت انیسویں صدی میں شروع ہوگئی تھی۔ اس سلسلے میں پہلا قدم محمد حسین آزاد کے والد محترم مولوی محمد باقر نے اٹھایا۔ اس سلسلے کو فروغ ماسٹر رام چندر کی روشن خیالی اور سر سید احمد خان کی کشادہ فکری نے دیا۔ بعد ازاں میر ناصر علی دہلوی، مولانا عبدالحلیم شرر اور مولانا حسرت موہانی نے صدائے عام، دل گداز اور اردوئے معلی جیسے ادبی رسائل کے توسط سے قوم کی ذہنی، فکری، تہذیبی اور ادبی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔

بیسویں صدی میں شیخ عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں، دیا نرائن نگم، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا صلاح الدین احمد، شاہد احمد دہلوی، تاجور نجیب آبادی، میاں بشیر احمد، مولانا حامد علی خاں اور نیاز

فتح پوری نے ارتقا کے اس سفر کو جاری رکھا اور ادبی رسائل سے فکری تحریکیں برپا کرنے کے علاوہ ادب کے فروغ وارتقا اور معاشرے کی اصلاح کا کام بھی لیا۔

برِعظیم میں انیسویں صدی کے وسط میں خواتین کی تعلیم کی ضرورت کو بھی محسوس کیا گیا اور خواتین کی ذہنی اور مجلسی تربیت کے لیے نئی کتابوں کی تصنیف وتالیف میں دلچسپی لی گئی۔ صوبہ شمال مغربی کے گورنر سر ولیم مور نے نہ صرف مصنفین کی حوصلہ افزائی کی بلکہ خود بھی داستان جمیلہ خاتون کے نام سے ایک کتاب لکھ کر اس کارِ خیر میں اپنا حصہ ڈالا۔ مولوی محبّ حسین کے علمی وادبی رسالے معلم میں طبقۂ نسواں کی اصلاح، تعلیم اور حقوق کے حوالے سے مضامین شائع کیے گئے اور اس طرح طبقۂ نسواں کی ترقی سے متعلق پہلا عملی قدم اٹھانے کا سہرا مولوی محبّ حسین کے سر جاتا ہے۔ لیکن خالصتاً طبقۂ نسواں کے لیے رسالے کا اجرا سید احمد دہلوی نے کیا۔ جنھوں نے اخبار النساء میں امور خانہ داری کے علاوہ مشرقی روایات کی پاسداری، قدامت، جہالت اور کم علمی کے نقصانات پر مضامین لکھے۔

منشی محبوب عالم شریف بیبیاں اور مولوی ممتاز علی تہذیب نسواں کے ذریعے خواتین کے سماجی، تہذیبی، مذہبی اور فکری مسائل کو زیر بحث لائے۔ اس طرح انھوں نے خواتین کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے انھیں خود اپنے مسائل کے ادراک کا شعور بخشا۔ طبقۂ نسواں کے لیے جاری ہونے والے تمام رسائل کا باقاعدگی سے شائع نہ ہونا اور زمانے کے سرد وگرم کا شکار ہو کر بالآخر بند ہو جانا اس بات کا متقاضی تھا کہ خواتین کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بلاتعطّل شائع ہونے والے کسی رسالے کا اجرا کیا جائے۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے علامہ راشد الخیری کی زیرنگرانی دہلی سے ۱۹۰۸ء میں ماہنامہ عصمت جاری کیا گیا جو ایک صدی سے زائد عرصے تک طبقۂ نسواں کے حقوق کی جنگ لڑتا رہا۔

ماہنامہ عصمت کے پیش نظر خواتین کی دینی و دنیوی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں طبقۂ نسواں کی رہنمائی کرنا اور ان میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا بھی شامل تھا۔ شیخ محمد اکرام، علامہ راشد الخیری، مولانا رازق الخیری، محترمہ آمنہ نازلی، محترمہ صائمہ خیری اور طارق

الخیری یکے بعد دیگرے ماہنامہ عصمت کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ماہنامہ عصمت کے نمایاں لکھنے والوں میں مولانا راشد الخیری، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی سید احمد دہلوی، مولانا عبدالحلیم شرر، شیخ عبدالقادر، نصیر الدین ہاشمی، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر ستار خیری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، کپتان ڈاکٹر نصیر الدین احمد، امام اکبرآبادی، تلوک چند محروم اور نذر سجاد حیدر، خجستہ سہروردیہ، صغریٰ ہمایوں مرزا، محمدی بیگم، شائستہ اختر سہروردیہ، عباسی بیگم، ایس کے صغریٰ سبزواریہ، خاتون اکرم، ز۔خ۔ش، عطیہ بیگم فیضی، فاطمہ بیگم منشی فاضل اور حجاب امتیاز علی شامل ہیں۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ عصمت کے موضوعات اور رجحانات بھی تبدیل ہوتے رہے۔ حقوق نسواں کے ساتھ ساتھ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی تناظر میں بھی تحریریں لکھی گئیں اور یوں ماہنامہ عصمت نے اسلامی و مشرقی اقدار کی پاسداری کرتے ہوئے طبقۂ نسواں کی رہنمائی کا سلسلہ جاری رکھا۔

بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت کی شعری تخلیقات نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ مختلف شعرا کی شعری تخلیقات منظومات، غزلیات، قطعات، رباعیات اور سانیٹ کی صورت میں سامنے آئیں۔ طبقۂ نسواں میں اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار کی ترویج کے لیے ہٹ دھرمی، جھوٹ، دوسروں کی دل آزاری، سستی و کاہلی اور نمود و نمائش کو باعثِ ندامت قرار دیا گیا اور سچائی، صوم و صلوٰۃ کی پابندی، بے کسوں کی اعانت، صبر و تحمل، دوسروں کے ادب اور صدقہ و خیرات کو آدمیت کا جوہر اور بزم دہر میں باعثِ نجات قرار دیا گیا۔

مختلف شعرا نے خواتین کو ان کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے بحیثیت بیوی، بیٹی، ماں اور بہو کے ان کی خدمات کو سراہا اور ان کو دنیا کی زینت، قوموں کی عزت، پیکرِ ایثار، خالق کا اچھوتا شاہکار اور روایات کی پاسدار قرار دیا۔ خواتین کی اصلاح و تربیت کے لیے نیک و بد خواتین کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی اور حقوق شوہر اُن پر واضح کیے گئے تاکہ وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر کے اپنے گھروں میں راج کر سکیں۔ طبقۂ نسواں میں پامالیِ حقوق کا شعور بیدار کر کے انھیں بے جا رسوم و رواج کی پابندی اور صنف قوی کا سہارا لینے کی بجائے اپنے زور بازو پر اٹھ کھڑا ہونے کا کہا گیا۔

شعرا نے خواتینِ سلف حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، جہاں آرا بیگم، گلبدن بیگم، چاند بی بی وغیرہ کی مثالیں دے کر طبقہ نسواں کو خود پر طاری جمود کی کیفیت سے نکلنے اور شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کے لیے جدید علوم سے استفادے کا درس دیا۔ خواتین پر کتابوں اور علم کی اہمیت واضح کرتے ہوئے علم اور جہل کا موازنہ کیا گیا اور علم کو دین و دنیا کی متاع، خواتین کی ترقی اور قوم کی بہتری کا واحد راستہ قرار دیا گیا۔ مغربی خواتین کی مثالیں دے کر طبقۂ نسواں کو حصول علم و عمل پر ابھارا گیا۔ آزادیِ وطن کے حصول کے لیے خواتین کو متحرک اور جاندار کردار ادا کرنے کا کہا گیا۔ تربیتِ اولاد میں ان کی رہنمائی کی گئی اور مغربی کورانہ تقلید کو مشرقی روایات اور اسلامی اقدار سے محرومی کا ذریعہ قرار دیا گیا۔

بیداریِ نسواں میں ماہنامہ عصمت کی نثری تخلیقات نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا۔ نثری تخلیقات میں سب سے زیادہ مضامین لکھے گئے جن میں تاریخی، دینی اور سیاسی ہر لحاظ سے تعلیم نسواں کی اہمیت واضح کی گئی اور خواتین کی زندگی سے متعلق ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی۔ معاشرے میں رائج فضول رسوم و رواج پر کڑی تنقید کی گئی اور مذہب اسلام سے مثالیں دیتے ہوئے خواتین کے حقوق اور مقام کا تعین کیا گیا تاکہ ازدواجی زندگی تلخیوں کا شکار ہونے کی بجائے پرسکون اور خوش گوار گزرے۔

جواز تعلیم نسواں پیش کرنے کے لیے تاریخی حوالوں سے خواتین کی تعلیم پر بحث کی گئی۔ نام نہاد روشن خیال مردوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا گیا جو یورپی خواتین کے گن گاتے اور اپنی خواتین کو پسماندہ رکھتے ہیں۔ خواتین کو ہی ان کے حقوق سے محرومی کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان میں شعور اجاگر کیا گیا تاکہ وہ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں۔ بحیثیت بیٹی، بیوی، بہو، ماں اور ساس کے خواتین کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا گیا اور گھریلو معاملات میں ان کی رہنمائی کی گئی۔ اسلامی احکامات کی پابندی پر زور دیا گیا اور مغربی نقالی کو ناپسند کیا گیا۔

تربیتِ اطفال میں طبقۂ نسواں کی رہنمائی کی گئی اور ماؤں کو بچوں کی تربیت کے سنہری اصولوں سے آگاہ کیا گیا۔ بچوں کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دینے کو ان کی ذہنی ترقی و نشو و نما کے

لیے اہم قرار دیا گیا۔ نصاب تعلیم نسواں کے حوالے سے خواتین کے لیے اسلام کی پاسداری کے ساتھ ساتھ مغربی مفید علوم اور صنعتوں کے سیکھنے پر بھی زور دیا گیا تاکہ خواتین عضوِ معطل کی بجائے معاشرے کا کارآمد شہری بن کر ملکی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ امور خانہ داری، مذہبی تعلیم، دستکاری، مصوری، نرسنگ اور خوشنویسی کو نصاب کا حصہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ سیاسی بیداری پیدا کرتے ہوئے مسلمان خواتین پر اتحاد بین المسلمین کی اہمیت واضح کی گئی۔ اور دنیا کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی جدوجہد میں خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کا کہا گیا۔

سفرناموں کے ذریعے خواتین کو بیرونی دنیا سے متعلق معلومات فراہم کی گئیں۔ دوسرے ممالک کے رسم و رواج، طرز بود و باش، معاشرت سے آگاہ کرتے ہوئے جہاں ان کے مثبت پہلوؤں کو پسند کیا گیا وہیں منفی اثرات کی بھی نشاندہی کی گئی۔ ماہنامہ عصمت میں شائع ہونے والے ناولوں میں طبقۂ نسواں کی زندگی سے متعلق ہر مسئلے کو زیر بحث لایا گیا۔ جہاں ان کی مظلومیت پر آنسو بہائے گئے، وہیں انھیں ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ بھی بتایا گیا۔ افسانوں میں بھی ہندستانی معاشرے میں طبقۂ نسواں کی حالتِ زار کی تصویر کشی کی گئی اور ان پر کیے جانے والے مظالم سے پردہ ہٹا کر معاشرے کو اس کی بے رحمی کا احساس دلایا گیا تاکہ خواتین پر روا رکھے گئے مظالم کی بیخ کنی کر کے انھیں انصاف دلایا جا سکے۔

ماہنامہ عصمت کے اجرا کا ایک مقصد طبقۂ نسواں کو معلوماتِ عامہ و خاصہ سے باخبر رکھنا بھی تھا جس کے لیے ''سیر بین'' اور ''دور بین'' کے نام سے دو مستقل سلسلوں کا آغاز کیا گیا۔ ''سیر بین'' کے سلسلے میں دنیا بھر میں ہونے والی نت نئی سائنسی ایجادات اور تجربات سے قارئین کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔ خون کی منتقلی، جگر کی ٹرانسپلانٹیشن، نظام شمسی سے متعلق حقائق، بائی پاس ہارٹ سرجری، الیکٹرک شاکس اور دنیا کی ابتدا کے حوالے سے ہونے والی تحقیقات طبقۂ نسواں کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کا باعث بنیں۔ مختلف ممالک کے مخصوص رسم و رواج، مصر میں ممیاں محفوظ کرنے کا طریقۂ کار اور غرض و غایت، جنگ عظیم اوّل و دوم کے حقائق، سلطان ٹیپو کے اثاثوں پر انگریزوں کے قبضے کے حوالے سے بھی حقائق ''سیر بین'' کے سلسلے میں منظر عام پر لائے گئے۔ خواتین

کو تربیت اطفال کے حوالے سے آگاہ کرنے، میک اپ کے بے جا استعمال کے نقصانات اور دھوکہ دہی اور فراڈ سے خبردار کرنے کے لیے کئی واقعات پیش کیے گئے۔ دنیا کے مختلف مذاہب میں عورت کے حقوق کے تعین، مغربی کورانہ تقلید کے نقصانات اور خواتین کی صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کی ضرورت کو واضح کرنے کے لیے معلومات فراہم کی گئیں۔

خواتین میں حصول علم کا شوق پیدا کرنے کے لیے ''سیر بین'' میں مختلف ممالک کی تعلیم یافتہ خواتین کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور یورپین خواتین کے حیرت انگیز اور جرأت مندانہ کارناموں کو ''سیر بین'' کے صفحات کی زینت بنا کر ہندُستانی خواتین میں کچھ کر گزرنے کی تحریک پیدا کی گئی۔ حقوق نسواں سے متعلق شعور پیدا کرنے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک کی خواتین کی حق رائے دہی کے لیے کی جانے والی کوششوں کو ''سیر بین'' میں سراہا گیا۔ خواتین میں توہم پرستی کا خاتمہ کرنے کے لیے مختلف محیرالعقول واقعات بیان کیے گئے اور ان کی حقیقت سامنے لائی گی۔

معلومات عامہ میں اضافے کے لیے خواتین کو دنیا میں بولے جانے والی مختلف زبانوں کے حوالے سے اعداد و شمار فراہم کیے گئے، چینی کی افادیت، چائے کے نقصانات، ریل گاڑی کی ایجاد، دنیا کے سب سے بڑے پلیٹ فارم کے محل وقوع، مقتدر شخصیات کے مشاغل، شہاب ثاقب کی حقیقت، مشہور مصنفین اور ڈرامہ نویسوں کی آمدنی، ان کے لکھنے کے اوقات اور انداز سے متعلق طبقۂ نسواں کو آگاہ کیا گیا۔

''سیر بین'' کے برعکس ''دور بین'' کے سلسلے میں بین الاقوامی خبروں کے ساتھ ساتھ اہم قومی معلومات و واقعات بھی پیش کیے جانے لگے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ہندُستان سیاسی لحاظ سے نازک ترین دوراہے پر کھڑا تھا۔ انگریزوں کے سامنے اپنا مؤقف واضح کرنے اور ان سے اپنے مطالبات منظور کروانے کی غرض سے ہندُستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے سرکردہ رہنما قائدِ اعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خان، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو وغیرہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔ اس کانفرنس کے اجلاسوں کے حوالے سے معلومات قارئین کو فراہم کی گئیں۔ جنگ عظیم اوّل اور دوم کے بعد ایک اور جنگ عظیم کے آثار نظر آرہے تھے۔ برطانیہ، فرانس،

جرمنی اور روس کی سیاسی چپقلش اور جاپان کی اندرونی خانہ جنگی کے حالات بھی عصمت کے قارئین کی نذر کیے گئے۔

جرمنی کی سیاسی معاہدوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی، وحشیانہ ہتھیاروں، وی ون اور وی ٹو کی ایجاد، اطالیہ کی حبش پر چڑھائی کرنے کی غرض و غایت، قائداعظم محمد علی جناح کے مصلحانہ رویے، برطانیہ کی فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی تجویز، مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ، قراردادِ پاکستان اور ناگاساکی اور ہیروشیما پر امریکی بمباری کے حوالے سے اصل حقائق سے ''دور بین'' میں پردہ اٹھایا گیا۔ ضبط تولید کو طبقۂ نسواں کی صحت کے لیے مضر قرار دیتے ہوئے خاندانی منصوبہ بندی کے حوالے سے خواتین کو آگاہ کیا گیا۔ خواتین کو تحریک آزادی میں مثبت کردار ادا کرنے کے لیے مسز نائیڈو، مسز مالی بن کارا مولوجی اور محترمہ فاطمہ جناح کی مثالیں دی گئیں۔ ملکی سیاست میں اپنا کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف پیشوں محکمۂ وکالت اور محکمۂ صحت میں بھی ان کی نمائندگی کو خوش آئند قرار دیا گیا۔ لکھنؤ یونی ورسٹی میں ایل ایل بی کی ۲۹۳ میں سے ۲۹ ڈگریاں خواتین کو ملنے کی خبر ہندستانی خواتین میں شعور اور آگہی پروان چڑھنے کا واضح ثبوت تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ''دور بین'' میں کلکتہ میں مسلمان لڑکیوں کے کالج کی تکمیل کی خبر یقیناً ہندُستانی مسلمان خواتین کی جدوجہد کے بارآور ہونے کی نوید تھی۔ لیکن ان کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ بلاشبہ علامہ نے اپنے کام سے خواتین کی حیثیت کو بہت بلند کر دیا۔ جس کے بارے میں وہ کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتیں۔

مآخذ

ماہنامہ عصمت ج۱۔۷۹ (۱۹۰۸ء تا ۱۹۴۷ء)

۱۔ آزاد، ابوالکلام۔ آزادی ہند۔ مرتب رئیس احمد جعفری۔ لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۱ء۔

۲۔ اشرف، نادیہ۔ ''تہذیب نسواں۔ تعارف اور پس منظر''۔ دریافت (بہار ۲۰۰۳ء): ۵۱۵۔۵۲۳۔

۳۔ اقبال، رابعہ۔ اردو ادب میں طبقۂ نسواں۔ حیدرآباد: ادارۂ اردو، ۱۹۹۰ء۔

۴۔ بخش، ایم سلطانہ۔ پاکستانی اہلِ قلم خواتین ایک ادبی جائزہ۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۳ء۔

۵۔ بیگم، نور الصباح۔ تحریک پاکستان اور خواتین۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، سنہ ندارد۔

۶۔ ترین، روبینہ۔ ''عورت کا نقش اردو شعر و ادب کے تناظر میں''۔ دریافت ش۵ (اگست ۲۰۰۶ء): ۶۱۴۔۶۲۴۔

۷۔ جاوید، احمد۔ ''خواتین کا ادب۔۔۔ ایک اجمالی جائزہ''۔ سہ ماہی ادبیات ج۱۸، ش۷۴۔۷۵ (جنوری تا جون ۲۰۰۷ء): ۳۶۱۔۳۶۶۔

۸۔ حسن، فاطمہ۔ ز۔خ۔ش (حیات و شاعری کا تنقیدی جائزہ)۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۷ء۔

۹۔ حسین، سید احتشام۔ ''سانٹ کیا ہے''۔ اردو شاعری کا فنی ارتقا۔ مرتب فرمان فتح پوری۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔ ۵۰۷۔۵۰۸۔

۱۰۔ حسین، شگفتہ۔ ''بنت نذر باقر اور آزادی نسواں''۔ دریافت (بہار ۲۰۰۳ء): ۴۹۰۔۵۰۸۔

۱۱۔ حنا، زاہدہ۔ عورت: زندگی کا زندان۔ کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۰ء۔

۱۲۔ خان، سید احمد۔ مکتوبات ِ سرسید احمد خان۔ مرتب شیخ اسماعیل پانی پتی۔ لاہور:

مجلس ترقی ادب، ۱۹۵۸ء۔

۱۳۔ خان، غلام مصطفیٰ۔ حالیؔ کا ذہنی ارتقا۔ لاہور: مکتبہ کارواں، سنہ ندارد۔

۱۴۔ خورشید، عبدالسلام۔ داستان صحافت۔ لاہور: مکتبہ کارواں، سنہ ندارد۔

۱۵۔ دتاسی، گارساں۔ خطبات گارساں دتاسی۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۹ء۔

۱۶۔ دہلوی، انیس۔ ''خواتین کے رسالے''۔ اردو ادب کو خواتین کی دین۔ دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۴ء۔ ۲۵۳۔۲۶۸۔

۱۷۔ دہلوی، نذیر احمد۔ مراۃ العروس۔ مرتب شائستہ اکرام اللہ۔ کراچی: ترقی اردو بورڈ، ۱۹۶۱ء۔

۱۸۔ رازق الخیری۔ عصمت کی کہانی۔ دہلی: عصمت بکڈپو، ۱۹۴۶ء۔

۱۹۔ رازق الخیری۔ ''عورتوں کے ادب کے ۲۵ سال'' ۔ ساقی جوبلی نمبر (۱۹۵۵ء): ۱۳۷۔۱۶۰۔

۲۰۔ راشد الخیری، علامہ۔ تمغہ شیطانی۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۶۹ء۔

۲۱۔ ---جوہر عصمت۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۴ء۔

۲۲۔ ---دادا لال بجھکڑ۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۴ء۔

۲۳۔ ---شام زندگی۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۸ء۔

۲۴۔ ---زیور اسلام۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۶ء۔

۲۵۔ ---قطرات اشک۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۱ء۔

۲۶۔ ---طوفان اشک۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۳ء۔

۲۷۔ ---صبح زندگی۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۶ء۔

۲۸۔ ---جوہر قدامت۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۷۱ء۔

۲۹۔ ---نانی عشو۔ کراچی: علامہ راشد الخیری اکیڈمی، ۱۹۶۹ء۔

۳۰۔ رضوانہ۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اردو کی خواتین افسانہ نگار۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۷ء۔
۳۱۔ زبیری، محمد امین۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ۱۹۷۱ء۔
۳۲۔ سدید، انور۔پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء۔
۳۳۔ سندیلوی، سلام۔ادب کا تنقیدی مطالعہ۔لاہور: میری لائبریری، ۱۹۶۴ء۔
۳۴۔ سہروردی، شائستہ اکرام اللہ۔ شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی منتخب تحریریں (ماہنامہ عصمت ۱۹۳۴ء تا ۱۹۸۸ء) ۔مرتب احمد سلیم۔کراچی: اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۸ء۔
۳۵۔ صدیقی، عتیق احمد۔''سرسید اور تعلیمِ نسواں'' ۔سہ ماہی فکر و آگہی علی گڑھ نمبر(۲۰۰۰ء): ۲۷۱۔۲۷۳۔
۳۶۔ عبدالحق، مولوی۔چند ہم عصر۔کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۷ء۔
۳۷۔ عبداللہ، سید۔سر سید احمد خان اور ان کے رفقا کی نثر کا فنی و فکری جائزہ ۔ لاہور: علی کتب خانہ، ۱۹۷۹ء۔
۳۸۔ فتح پوری، فرمان۔''قطعہ'' ۔اردو شاعری کا فنی ارتقا۔ مرتب فرمان فتح پوری۔ لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔ ۴۱۰۔۴۱۴۔
۳۹۔ فضل، سیمیں ثمر۔ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ۔دہلی: اے ون فوٹو آفیسٹ، ۱۹۹۱ء۔
۴۰۔ فگار، سنبل۔اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ ۔لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۳ء۔
۴۱۔ کھوکھر، محمد افتخار۔تاریخ صحافت ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء۔
۴۲۔ لودھی، ندرت شبنم۔''اردو شاعری میں خواتین کا حصہ'' ۔سہ ماہی اردو

جلد ۷۸، ش ۱-۴ (جنوری تا دسمبر ۲۰۰۸ء): ۱۳۱-۱۷۵۔

۴۳۔ مسعود، طاہر۔ اردو صحافت انیسویں صدی میں۔ کراچی: فضلی سنز لمیٹڈ، ۲۰۰۲ء۔

۴۴۔ مہدی، صغرا۔ ''تحریک نسواں کے علمبردار''۔ فیمنزم اور ہم ۔ مرتب فاطمہ حسن۔ کراچی: وعدہ کتاب گھر، ۱۹۹۴ء۔ ۱۸-۲۴۔

۴۵۔ نسیم آرا، اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء۔

۴۶۔ نظامی، خواجہ حسن۔ ''عورت کے نام کا پردہ''۔ تبلیغِ نسواں ج ۱، ش ۱ (اپریل ۱۹۲۶ء): ۴۱۔

۴۷۔ نقوی، محمد اشرف۔ اختر شہنشاہی۔ لکھنؤ: اختر پریس، ۱۸۸۸ء۔

۴۸۔ ہاشمی، رفیع الدین۔ اصنافِ ادب۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء۔